دلّی والے

(جلد اوّل)

مرتّبہ
ڈاکٹر صلاح الدّین

اردو اکادمی دہلی

دِلّی والے

مرتبہ

ڈاکٹر صلاح الدین

اردو اکادمی دہلی

سلسلہ مطبوعات اردو اکادمی دہلی نمبر ۱۵

DILLI WALEY
(Vol. I)
Edetet by
Dr. Salahuddin
Pub. by
URDU ACADEMY, DELHI
Prints
1986, 2001, 2010
Rs. 120.00

ضابطہ

سنینِ اشاعت
۱۹۸۶، ۲۰۰۱، ۲۰۱۰ء
ایک سو بیس روپے
اصیلا آفسیٹ پرنٹرس، کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی ۲
اردو اکادمی، دہلی، سی۔ پی۔ او۔ بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶
ISBN: 81-7121-004-X

فہرست

حرفِ آغاز

دلّی ہمیشہ ہندوستان کے دل کی دھڑکنوں کا محور و مرکز رہی ہے۔ اسی لیے عالم میں انتخاب اس شہرِ بے نظیر کی تاریخ و تہذیب، علم و فن اور زبان و ادب کو پورے ملک کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے۔ آزاد ہندوستان کی یہ تاریخی راجدھانی بجا طور پر اردو زبان و ادب کی راجدھانی بھی کہی جا سکتی ہے۔ اسی کے گرد و نواح میں کھڑی بولی کے بطن سے زبانِ دہلوی یا اردو نے جنم لیا جو اپنی دھرتی کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی ضرورتوں کے زیرِ سایہ نشو و نما پا کر اس عظیم تہذیب کی ترجمان بن گئی جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کا نام دیتے ہیں اور جو ہماری زندہ و تابندہ تاریخی وراثت ہے۔

دلّی کے ساتھ اردو زبان اور اردو ثقافت کے اسی قدیم اور اٹوٹ رشتے کے پیشِ نظر ۱۹۸۱ء میں دہلی اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور ایک چھوٹے سے دفتر سے اکادمی نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ آج دہلی اردو اکادمی کا شمار اردو کے فعّال ترین اداروں میں ہوتا ہے۔ اردو زبان و ادب اور اردو ثقافت کو فروغ دینے کے لیے اکادمی مسلسل جو کوششیں کر رہی ہے، انھیں نہ صرف دہلی بلکہ پورے ملک نیز بیرونی ممالک کے اردو حلقوں میں بھی کافی سراہا گیا ہے۔

اکادمی کے دستور العمل کی رو سے دہلی کے لیفٹننٹ گورنر پہلے اکادمی کے چیئرمین ہوتے تھے، دہلی میں منتخب حکومت کے قیام کے بعد اکادمی کے چیئرمین دہلی کے وزیرِ اعلیٰ ہو گئے ہیں جو دو سال کے لیے اکادمی کے اراکین کو نامزد کرتے ہیں۔ اراکین کا انتخاب دہلی کے ممتاز ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور اساتذہ میں سے کیا جاتا ہے جن کے مشوروں کی روشنی میں چیئرمین کی منظوری سے اکادمی مختلف کاموں کے منصوبے بناتی اور

انھیں رو بہ عمل لاتی ہے۔ اکادمی اپنی سرگرمیوں میں دہلی اور بیرونِ دہلی کے دیگر اردو اداروں سے بھی باہمی مشورت اور تعاون قائم رکھتی ہے۔

اردو اکادمی، دہلی اپنی جن گوناگوں سرگرمیوں کی وجہ سے پورے ملک میں اپنی واضح پہچان قائم کرچکی ہے، ان میں ایک اہم سرگرمی اکادمی کی طرف سے معیاری ادبی رسالے ماہنامہ ''ایوانِ اردو'' اور ''بچوں کا ماہنامہ امنگ'' کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ معیار کی علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت بھی ہے۔

اس کتاب میں شامل خاکے، اکادمی کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے سمینار ''دلّی والے'' ۲۹، ۳۰ اور ۳۱ مارچ ۱۹۸۵ء میں پڑھے گئے تھے۔ اس سمینار کے ڈائرکٹر ڈاکٹر صلاح الدین تھے اور انھوں نے ہی اس کتاب کو مرتب بھی کیا ہے۔ اردو داں حلقے میں ان کی اس ادبی کاوش کو کافی سراہا گیا۔ کتاب کی اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر اس کا تیسرا اڈیشن شائع کیا جارہا ہے۔

ہم اردو اکادمی دہلی کی چیئر پرسن محترمہ شیلا دکشت کے ممنون ہیں جن کی سرپرستی اکادمی کی کارکردگی میں معاون ہوتی ہے۔ اکادمی کے دیگر ممبران کے سرگرم تعاون اور مفید مشورے ہمارے لیے رہنمائی کا کام کرتے ہیں جس کا اعتراف ضروری ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ زیرِ نظر کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی حلقوں میں پسند کی جاتی رہے گی۔

مرغوب حیدر عابدی
سکریٹری

مُقدّمہ

اَلحمدُاللہ " دِلّی والے " سیمینار منعقدہ مطابق ۲۹، ۳۰، ۳۱ مارچ ۱۹۸۵ء بمقام غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین اولیا، میں پیش کئے جانے والے خاکوں پر مبنی یہ کتاب مرتب ہوگئی ہے۔ سیمینار کے بہت سے شرکار کے کہنے کے مُطابق برصغیر ہند و پاک میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا سیمینار تھا جو دہلی اُردو اکادمی کے ذریعے انعقاد پذیر ہوا۔

دہلی، ہندوستان کا دار الخلافہ ہونے کے سبب" عالم میں انتخاب " بھی رہا ہے اور منتخبِ روزگار" شخصیتوں کا مسکن بھی، مُلک کے گوشے گوشے سے لوگ یہاں آکر بسے اور یہیں کی مٹی کا پیوند ہوگئے۔ دہلی نے سب کو خوش آمدید کہا اور سب نے دہلی کا مان بڑھایا۔

ع وفاداری بہ شرطِ اُستواری، اصل ایماں ہے:

اس کا ثبوت دہلی کی خاکِ پاک نے بھی دیا، اور یہاں آکر بسنے والوں نے بھی دیا یعنی دہلی نے انِھیں اپنایا اور انِھوں نے دہلی کو گلے لگایا اور یوں ہر وہ شخص جو یہاں آکر بسا دِلّی والا کہلایا۔ اس خوبی کو دہلی کی تہذیبی میراث بھی کہا جا سکتا ہے اور وسیع المشربی کی اعلیٰ قدروں سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب شاہجہاں نے شاہجہاں آباد یعنی 'دِلّی' کو بسایا تو اِس شہر کی رونق کو

چار چاند لگانے کی غرض سے نہ صرف ملک کے کونے کونے سے بلکہ بیرونِ ملک سے بھی جملہ شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے ہنرمندوں کو بلا کر آباد کیا۔ حالاں کہ "ہنرمندوں" کا دلّی میں آنے اور آباد ہونے کا سلسلہ شاہجہاں کے عہد سے بھی بہت پہلے سے جاری تھا اور دلّی عہدِ قدیم سے "تہذیب و تمدن" کا گہوارہ بنی ہوئی تھی۔ مگر شاہجہاں نے اس عمل کو تیز کرنے کی شعوری کوشش کی۔ نوابین سے لے کر اکابرین تک۔ اور اکابرین سے لے کر علمار دین تک۔ ہنر ادبار، شعرار، فضلار، اطبا، خطاط معمار، صنّاع، مصور، موسیقار۔ گائیک مختلف دستکاریوں سے تعلق رکھنے والے دست کار، ہنرمند، کاری گر پیشہ لوگوں حتیٰ کہ سپاہی پیشہ لوگوں اور مختلف کاروبار کرنے والے افراد کو یہاں بلا کر بسایا گیا اور یوں اس تاریخی شہر کی تہذیبی آبیاری اور ثقافتی شجر کاری کا باقاعدہ آغاز کیا گیا اور اِس طرح یہ سلسلہ شاہجہاں سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک، پھر انگریزی اقتدار سے ہوتا ہوا ملک آزاد ہونے تک اور ملک آزاد ہونے کے بعد سے آج تک جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ اسے ایک ایسے زرخیز عمل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس کے نتیجہ میں دلّی کی تہذیبی، تمدنی، ثقافتی اور لسانی مرکزیت کو شہرتِ عام بھی نصیب ہوئی اور بقائے دوام بھی۔ میرے خیال میں یہ وہ خوش آئین عمل ہے جس میں دہلی کی دہلویت اور دہلویت کی رنگا رنگی اور بوقلمونی کا راز مضمر ہے۔ اگر آمد کا یہ عمل رک جاتا تو دہلی شاید تاریخی اور عمارتی سطح پر نہیں بلکہ تہذیبی اور ثقافتی نقطۂ نظر سے بھی آثارِ قدیمہ کی مثال ہو کر رہ جاتی۔ دہلی کی رنگا رنگی کو تابندہ و پائندہ رکھنے میں جہاں ایک طرف یہاں کے قدیم بسنے والوں نے "دلِ پرخوں کی ایک گلابی سے" رنگ آمیزی کی ہے وہیں "تازہ واردانِ بساط" نے بھی "ہوائے دل" کے لطیف جھونکوں سے اس کی آب و تاب کو تازگی بخشی ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

"دلّی والے" وہ اِضافی اِصطلاح ہے جس کی ایک توجیہہ تو میر امّن نے سات پشتوں سے دہلی میں رہنے کے باعث "دلّی کا روڑا" کہہ کر کی پیش کی تھی، دوسری توجیہہ میر تقی میر نے جامع مسجد کی سیڑھیوں کو اِستناد کا درجہ دے کر کی تھی پھر مولانا احمد سعید کہا کرتے تھے کہ جو عیدین کی نمازیں دہلی میں ادا کرے وہ دہلی والا ہے، ایک اور توجیہہ کسی ملک یا کسی شہر کے

Domocile Law یا" قانونِ شہریت" کے مطابق ہوا کرتی ہے، جس کی بنیاد پر دہلی اُردو اکادمی۔ دہلی میں رہنے والوں کو" دلی والے" تسلیم کرتی ہے اور وہ یہ کہ گذشتہ دس سال سے جو شخص دہلی میں مقیم ہے یا سکونت رکھتا ہے وہ دِلّی والا ہے۔ مگر میر کی توجیہہ میں جو اشارہ ملتا ہے وہ یہ کہ میر دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں کو تہذیبی اور لسانی مرکزیت کی مُقدس علامت مانتے تھے۔ اُن کے اِس اِستعارے میں عوام الناس کے تعلق سے زبان و بیان کی مرکزیت پر زور دیا گیا ہے۔

اِس سیمنار کے لئے" دِلی والے" کی اصطلاحی تعریف اور توجیہہ کرتے وقت دو باتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے یعنی ہر وہ شخص جو دہلی میں دس سال تک سکونت پذیر رہا ہو اور اس سکونت کے باعث یہاں کی ثقافتی زندگی اور ادبی محلفوں سے بہرہ ور ہونے کا شرف حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ دہلی کی تہذیبی اور لسانی مرکزیت کا بھی قائل رہا ہو وہ" دِلّی والے" کے زُمرے میں آتا ہے اور یہی توجیہہ آج کے سماجی، ثقافتی، تہذیبی اور معاشی تناظر میں زیادہ قابل قبول ہے۔ ورنہ اگر میر امّن کی طرح" دلی کا روڑا" ہونے والی سات پشتوں کی قید لگادی جائے تو پھر نہ میر دہلی والے ہو سکتے ہیں۔ نہ ذوق نہ غالب، نہ ڈپٹی نذیر احمد اور نہ جانے کتنے اور حضرات غیر دِلّی والے ہو جائیں گے۔

دِلّی کے ایک باسی شری مہشور دیال جی کے قول کے مطابق:" یوں بھی یہ دہلی وہ دہلی ہے جس کا سُہاگ بار بار لُٹا پھر بھی یہ سدا سُہاگن ہی کہلائی، سلطنتیں آباد ہوئیں، برباد ہوئیں لیکن اس کا چمن یونہی ہرا بھرا رہا۔ اس کی زمین میں وہ کشش ہے جو یہاں آیا بس یہیں کا ہو رہا۔ دہلی دل لیتی ہے تبھی تو اس کا نام دہلی ہے۔" —— اسی وجہ سے اس سیمنار میں ایسی شخصیات پر بھی مقالے لکھوائے گئے جو پیدائشی طور پر" دِلی والے" نہیں تھے لیکن انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ یہاں گذارا تھا اور یہاں کی تہذیب و تمدّن اور زبان و بیان کے پرستار تھے اور بالآخر یہیں کی مٹی میں سما گئے، دوسرے اشخاص وہ ہیں جو اسی شہر میں پیدا ہوئے یہیں پرورش پائی لیکن مٹی کہیں اور کی تھی اس لئے ہجرت کر گئے۔ تیسرے وہ بزرگ ہیں جن کے آباؤ اجداد عرصہ دراز سے یہاں کے باشندے تھے انھیں ٹھیٹھ دِلّی والے کہا جا سکتا ہے یہ

حضرات اپنی ذات میں جیتی جاگتی چلتی پھرتی دلّی تھے۔ ان شخصیات میں شعراء بھی ہیں علماء بھی ہیں مولوی اور واعظ بھی ہیں۔ درویش اور صوفی منش بھی ہیں۔ تاریخ داں بھی ہیں اور تاریخ ساز بھی ہیں۔ مُدبّر بھی ہیں اور مُفکّر بھی ہیں، ہر مذہب، ہر فرقے اور ہر طبقۂ فکر سے تعلق رکھنے والے حضرات شامل ہیں ان سب ہی نے دہلی کی سماجی، سیاسی، تہذیبی اور ادبی قدروں کی آبیاری کی ہے۔ ان شخصیات نے دہلی سے بہت کچھ حاصل بھی کیا اور بہت کچھ دیا بھی۔ دہلی نے انھیں بنایا اور انھوں نے دہلی کو جگمگایا۔ یہ وہ یادگار ہستیاں ہیں جن سے قدیم اور جدید دہلی عبارت ہے۔ ان میں مولانا ابوالکلام آزاد اور حکیم اجمل خاں جیسے جلیل القدر مجاہدین آزادی اور رہنمائے قوم وملت بھی جلوہ افروز ہیں اور مختار احمد انصاری، آصف علی بیرسٹر جیسے محترم قائد ہیں۔ اور مسز اندرا گاندھی جیسی بین الاقوامی شہرت کی حامل تاریخ ساز شخصیت بھی شامل ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد جیسے لافانی انشاء پرداز، آغا طاہر، شاہد احمد دہلوی، قاری سرفراز حسین جیسے عظیم الاقامت محسن ادب اور نثر نگار بھی شامل ہیں دہلوی دبستان شاعری کے نمائندہ اور داغ کے جانشین اُستاد بیخود دہلوی اور اُستاد سائل دہلوی جیسے ناقابل فراموش شعراء بھی اس مجلس میں موجود ہیں۔ پنڈت زار دہلوی، حیدر دہلوی جیسے دہلوی اسلوب کے نمائندہ غزل گو شعراء بھی ہیں۔ شمیم کرہانی، مولانا علیم اختر، طالب دہلوی اور سلام مچھلی شہری جیسے نامور شعراء کرام بھی موجود ہیں، قلندرانہ مزاج اور بانکی شخصیت رکھنے والا اُستاد رسا دہلوی جیسا شاعر بھی رونق افروز ہے علم وحکمت کا منبع مولانا عبدالسلام نیازی جیسے گوشہ نشین اور جلالی بزرگ بھی شامل ہیں۔ اپنے وقت کے یوسفِ ثانی نذر۔ صاف گو بے باک اور بے خوف دہلی والے بیرسٹر نورالدین احمد بھی ہیں۔ مرزا محمود بیگ، شفیق الرحمٰن قدوائی، خواجہ غلام السیدین، سید عابد حسین، منظور حسین موسوی جیسے عظیم المرتبت اساتذہ۔ ماہر تعلیم۔ ادارے ساز شخصیتیں اور علم وادب کے روشن مینار بھی اس محفل میں تابندہ و درخشندہ ہیں۔ مولانا احمد سعید دہلوی جیسی باغ وبہار شخصیت رکھنے والا قائد اور واعظ، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی جیسے مقتدر عالم دین۔ سجاد ظہیر جیسی ترقی پسند ادب کی لازوال شخصیت رضیہ سجاد ظہیر جیسی ڈرامہ نگار اور افسانہ نگار۔ لالہ دیش بندھو گپتا، سردار دیوان سنگھ مفتون اور محمد عثمان

فارقلیط جیسے بے باک اور نامور اُردو صحافی بھی اس ادبی محفل کو زیب و زینت بخش رہے ہیں۔

یہ وہ یادگار زمانہ شخصیتیں ہیں جن کے لئے بلا تامل کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے چندے آفتاب و چندے ماہتاب کی مثال ہو کر دہلی کی ادبی تہذیبی، سماجی فضا کو اپنی تابانی سے منوّر کیا۔

سب کہاں کچھ لالہ و گُل میں نُمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صُورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں

ان بزرگوں کو یاد کرنا باعثِ فخر بھی ہے اور باعثِ سعادت مندی بھی یہ گذشتہ سے پیوستہ رہنے کا ایک صالح اور خوشگوار عمل ہے۔ کسی ادبی جلسے کسی علمی تقریب یا کسی سیمنار کے ذریعے اپنے بزرگوں اور اسلاف کو یاد کرنا درحقیقت خود اپنی عزّت و شان میں اضافہ کرنے کا مُوجب ہے۔ اس لئے کہ ان بزرگوں کی شخصیتیں نہ تو کسی تعارف کی محتاج ہیں اور نہ کسی تعریف کی محتاج ہیں یہ مر کر بھی زندہ ہیں اور ان کے نام اور کام رہتی دُنیا تک زندہ رہیں گے ان کی اہمیت اور مرتبے کا اعتراف کرنا درحقیقت اپنے معاشرے کی صحت مندانہ روایتوں سے رشتہ استوار رکھنے کا وہ عمل ہے جو موجودہ نسل کے لئے اور آئندہ نسلوں کے لئے خیر و برکت کا ضامن بھی ہے اور افتخار کا باعث بھی۔ ان بزرگوں کے کارنامے ہماری شان ہیں اور ان کی ذات ہماری پہچان ہے۔ وہ پہچان جو کسی مہذب معاشرے کی اعلیٰ قدروں کا مظہر کہلاتی ہے۔

اُردو زبان و ادب کو دو تہذیبوں کا سنگم کہا جاتا ہے ـــــ یہی بات دہلی کی تہذیب و ثقافت کے لئے بھی کہی جا سکتی ہے اور یہاں کے رہنے والوں کے لئے بھی ان دو تہذیبوں کو پروفیسر محمد حسن کے الفاظ میں "ہندوستانی اور ترک ایرانی تہذیبیں کہنا زیادہ درست ہوگا" یہ ہندوستانی اور ترک و ایرانی تہذیبیں کئی سو سال تک مختلف منازل اور مراحل سے گذر کر ایک وحدت اور اکائی کی سطح پر پہنچی ہیں۔ اس مشترکہ تہذیب و ثقافت کی سب سے زیادہ اور بہتر عکاسی دہلی کی تہذیبی اور تمدنی زندگی میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ اس کی جھلکیاں یہاں کی رندی و مستیٔ قلندری، رواداری، وفا جوئی، بے تعصبی، آزادیٔ فکر، وحدت الوجود، وحدت الشہود سلوک و معرفت کی اقدار کا چلن اور انسان دوستی جیسی عظیم روایات میں نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ

وہ روایتیں ہیں جو یہاں کے رہنے والوں کے مزاج اور زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہیں۔ اس تہذیب کی تشکیل و تزئین اور ترویج میں دربار و سرکار سے لے کر خواص و عوام تک سب ہی شامل رہے ہیں۔ ایک طرف تہوار، جشن، جلوس، جلسے اور راگ و رنگ درباری سطح پر ہوتے ہیں تو دوسری جانب میلے ٹھیلے، مشاعرے، مراختے، خانقاہیں، عرس، قوالیاں عوام الناس کی دلچسپیوں کا محور رہی ہیں ایک مرکز اگر لال قلعے کا دربار رہا تو دوسرا مرکز جامع مسجد کی سیڑھیاں، صوفیا اکرام کے مزارات اور خانقاہیں تھیں مگر ان دو تہذیبوں کے اختلاط کا سب سے حسین اور دلکش پیکر اُردو زبان اور اس زبان کا ادب ہے۔ جس میں ہندوستانی عظمت کا کمال بھی شامل ہے ایرانی نفاست کا جمال اور ترکوں کا جلال بھی نظر آتا ہے، خانقاہ کی وسیع المشربی بھی ہے اور دربار کا دبدبہ اور جاہ حشمت بھی پائی جاتی ہے اس میں ہندوستانی مزاج کی سادگی بھی ہے اور ایرانی مزاج کی صناعی اور ترکی مزاج کی رعنائی بھی ہے، یہی خوبیاں اس شہر کے تمدنی مزاج اور تہذیبی بساط پر بھی رُونما ہوئیں اس ضمن میں رسم و رواج۔ لباس و پوشاک، طرزِ عمارات اور مکانات میں صحن، مختلف انواع کے کھانے۔ مختلف مشروبات، مختلف طرح کے برتن۔ دری اور فرشی چاندنی کا استعمال۔ آدابِ نشست و برخاست۔ آدابِ گفتگو آدابِ مجلس مکانات میں دیوان خانے، زنان خانے، مردانے کی تقسیم۔ مختلف پھولوں کے پودوں اور پھل دار اشجار کی مکانات میں شجر کاری۔ موسیقی کے مختلف آلات کی ایجادات ادب میں مختلف اصناف کا ارتقاء غرض زندگی کے ہر شعبے میں اس مشترکہ تہذیب کے اثرات تلاش کئے جا سکتے ہیں۔

یہ تہذیب خانقاہ، دربار اور بازار سے عبارت ہے، بعد ازاں اس میں مغربی تہذیب نے بھی اپنے اثرات مرتب کئے اور دہلی کی تہذیبی بساط نے پھر ایک اور کروٹ لی آج کے زمانے کی دہلی ان تمام تہذیبی اثرات کی مرہون منت ہے۔ یہ شہر تمام عالم میں اس معنی میں منفرد ہے کہ اس کی فکری تہذیبی نشوونما میں کئی تہذیبوں اور ثقافتوں نے ایک دوسرے میں جذب ہو کر اس کی رعنائی اور دلفریبی میں اضافہ کیا ہے جس کے نتیجے میں اس میں دھنک کے سے رنگوں کی خوشنمائی اور جاذبیت پیدا ہو گئی ہے۔

اس شہر کی یہ خوبی رہی ہے کہ جو یہاں آیا پھر یہیں کا ہو رہا ع کون جائے ذوقؔ اب دِلّی کی گلیاں چھوڑ کر۔

؎ حالیؔ بس یقیں ہے کہ دِلّی کے ہو رہے
ہے ذرّہ ذرّہ مہر فزا اس دیار کا

؎ عجب ہی شہر ہے دِلّی بھی شیفتہؔ ہرگز
میں روم و شام نہ لوں اس دیار کے بدلے

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے کسی بھی شہر اور اس کی تہذیب کے مٹنے کے حوالے سے اُردو میں اتنے شہر آشوب نہیں لکھے گئے جس قدر دِلّی پر لکھے گئے ہیں۔ اور اہم بات یہ ہے ان شہر آشوبوں کے لکھنے والوں میں صرف قدیم دہلی والے ہی نہیں بلکہ نئے آکر بسنے والے بھی شامل ہیں ۔ اور اس دیارِ مینو سواد کے احترام اور محبت میں سب ہی یکساں طور پر رطب اللسان ہیں۔ سب ہی نے اسے تہذیب اور زبان کا مرکز اور محور مانا ہے ۔

دہلی ہی وہ مرکز ہے جہاں اُردو زبان عرصۂ دراز تک نزاکتِ خیال اور نفاستِ بیان کی خراد پر چڑھ کر اس امتیاز کو پہنچی ہے کہ یہاں کا روزمرّہ، ضرب المثل، محاورے اور لب و لہجہ معیارِ زبان کی اصل قرار پایا ۔ اور اُردو معلّیٰ کہلایا۔

یہاں زبان و بیان کو سنوارنے، سجانے اور بنانے کا کس قدر خیال رکھا جاتا تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے عہد میں بادشاہ کے حضور ایک اخبار گذرا کہ آج شہر والوں نے کھٹ بنوں کو خوب مارا پیٹا کیونکہ کھٹ بنوں کا قاعدہ ہے کہ جب وہ شہر میں پھری پھرنے آتے ہیں تو آواز لگاتے ہیں" کھاٹ بنوالو، کھاٹ بنوالو" شہر والوں نے کہا نکلے تمہاری کھاٹ یہ کیا بُری فال منہ سے نکالتے ہو۔ پھر جو انھیں پیٹا ہے تو پیٹتے پیٹتے جھلنگا نکال دیا اور ٹکسال باہر لفظ سے توبہ کرائی اور سمجھایا کہ بجائے کھاٹ بنوالو کے چارپائی بنوالو، کہا کرو چنانچہ آج بھی دہلی میں کھٹ بُنے چارپائی بُنوالو ہی کہا کرتے ہیں۔ اس مثال سے یہ بات کہنی مقصود ہے کہ جہاں اس تکلف، تنبیہ، تدبر سے زبان و بیان کی نزاکت و نفاست کا خیال رکھا گیا ہو وہاں

امتیازی شان کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ لیکن یہ عمل تقسیم ملک سے پہلے کی دہلی تک محدود رہا۔ آزادی کے بعد دہلی کی تہذیبی اور لسانی حیثیت میں نمایاں فرق رُونما ہو چکا ہے۔ اور اب ہر ایک کو زبان و بیان اور لب و لہجے کی پوری آزادی ہے۔ جس کی وجہ سے دہلی کی دہلویت کا یہ امتیازی عنصر پہلے کم ہوا اور آج چند مستثنیٰ مثالوں کو چھوڑ کر، تقریباً تقریباً محروم ہونے کی مرحلے پر پہنچ چکا ہے جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مرحوم ہونے کی منزل پر پہنچ جائے گا۔

اب دہلی کی اس ٹکسالی زبان اور لب و لہجے نے نوادرات کا درجہ اختیار کر لیا ہے۔ یہ حادثہ صرف دہلی ہی کے ساتھ پیش نہیں آیا بلکہ لکھنؤ، حیدر آباد بلکہ اُردو زبان و بیان کے ہر اہم مرکز میں یہ تبدیلیاں دیکھنے کو مل سکتی ہیں۔ فرق کم و بیش کا ہو سکتا ہے۔ ایسا کیوں ہوا اور کیسے ہوا، اس میں بہت سے عوامل کی کارفرمائی شامل ہے جس پر بحث کرنے کی اس باب میں گنجائش نہیں۔ البتہ ضرورت ہے تو اس بات کی کہ اس "سدا سہاگن شہر" کے اُن سدا بہار لوگوں کا وقتاً فوقتاً ذکرِ خیر ہوتا رہے جنھوں نے اس کی تہذیبی زندگی ثقافتی فضا اور ادبی ماحول کو پروان چڑھانے میں حصہ لیا۔

دہلی والوں کا مزاج خاک نشینی میں کج کلاہی اور فقیری میں شاہی کرنے کا مزاج رہا ہے ان کی نازک مزاجی اور بے نیازی ضرب المثل رہی ہے بقول سید ضمیر حسن دہلوی "آدھی پائی کے مزدور نے بھی گر کسی سے بات کی تو دیو جانس کلبی کا سا تیکھا پن دکھایا"۔ اپنی خوش دلی، خوش اطواری، اور خوش طبعی کی بدولت پستی اور بلندی کا معیار دھن دولت کبھی نہیں رہا بلکہ دہلی والوں نے حال کے بجائے کھال میں مست رہنے کا چلن اپنایا۔ ان کے مزاج میں ناداری یا مفلسی جیسے الفاظ کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کی شانِ استغنا نے انھیں ہمیشہ ہی تونگر رکھا ؎

آگے کِسُو کے کیا کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

فرہنگِ آصفیہ کے مؤلف سید احمد دہلوی لکھتے ہیں کہ "اس شہر کے رہنے والوں کی قوتِ طبع اور رسائیِ ذہن سب سے نرالی تھی چنانچہ مشہور ہے کہ نادر گردی کے موقع پر یہاں کے نقالوں نے نادر شاہ کے چلے جانے کے بعد نادر شاہی سرداروں، فوجی افسروں کی نقلیں مجالس سُور و سرُور

میں روپ بھر بھر کر ایسی دکھائیں کہ اوروں سے بن نہ آئیں سب دھوکہ کھا گئے، مغل بننا چاہتے تھے تو کابلی فارسی کو اس لہجہ اور خوبی سے ادا کرتے تھے کہ وہاں کے ولایتی ان کی صحتِ زبان ولب ولہجہ دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔ عرب بننے کا ارادہ کرتے تو اہلِ عرب کو حیرت میں ڈال دیتے" قوتِ اختراع کا یہ حال تھا کہ مروجہ زبانوں کے علاوہ دیگر جُدا شیریں زبانیں اختراع کرکے یہاں کے لڑکے بالے لڑکی بالیاں، نوجوان باہم گفتگو کر لیا کرتے تھے" مثلاً "ز" کی زبان "مقلوب" زبان، کشٹولی" زبان "بکنی" زبان۔ غرض یہاں کے رہنے والوں نے تمام حروف تہجی کی بولیاں بنا رکھی تھیں۔ ان کے علاوہ "فرفری"، "سرسری" "چھپر" "کھپریل" اور "ٹکے" وغیرہ کی بولیاں بھی رائج تھیں۔ اسی طرح یہاں کے مختلف پیشہ وروں نے بھی اپنی اپنی بولیاں ایجاد کر رکھی تھیں جنھیں یہ بطور کوڈ Code کے استعمال کرتے تھے ان میں بہت سی بولیاں آج بھی بولی جاتی ہیں دہلی کی خواتین کے روزمرّہ اور محاورے میں بھی اِس اختراع کی جلوہ نمائیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مثلاً دہلی والیاں آج بھی سانپ کے لئے رسّی، چھپکلی کے لئے دیوار والی سُوَر کے لیے جنگل والا' جھاڑو کے لئے سُتھرائی، پاخانے کو جا ضرور تپِ دق کو لمبی بیماری، سناٹے کو سُوفتہ کہتی ہیں۔ اسی طرح قمری مہینوں کے بھی نام رکھ چھوڑے ہیں جیسے عید، خالی (خالق)، بقرعید، محرم، تیرہ تیزی، بارہ وفات، میراجی، مدار، خواجہ معین الدین رجب، شبِ برأت، رمضان، یہ جدتیں اور اختراعات لباس کے معاملے میں بھی ہوتی تھیں" پوشاک کی یہ دھاک تھی کہ ہر فرد وبشر خود جامہ زیب بن جاتا تھا اپنی شکل وشباہت، تن وتوش اور جسامت کے موافق نرالی سج دھج نکال کر اپنے بدن پر لباس کو موزوں کر لیتا تھا۔ اگر نوجوان ہے تو ایک ایک ٹانکے پر جوانی وطرآری برستی تھی اور جو بوڑھا ہے تو اس کی ہر قطع وبُرید سے پیری اور سادگی ٹپکتی تھی، بانکوں کا بانکپن، چھیلاؤں کا چھیلاپن، مُلّانوں کا مُلّانہ پن، پہلوانوں کی پہلوانی، شُہدوں کا شُہدپن، اجلافوں کا اجلاف پن اُن کی پوشاک وتراش وخراش سے خود ظاہر اور شاہد حال ہوتی تھی۔ شریفوں کی جس پوشاک کو رذیل اختیار کرتے تھے شریف اُسے یا تو چھوڑ دیتے یا اس میں کچھ نہ کچھ فرق کر دیتے تھے، شریفوں میں پہلے اونچی چولی کے انگرکھوں کا رواج تھا جب ڈوموں اور میراثیوں نے یہ وضع اختیار کی تو

شریف نیچی چولیاں یہاں تک کہ تا بناف بڑھا کر پہننے لگے۔ ڈوموں نے نیچے دامن کا رواج دیا تو شریفوں نے اونچے دامن رکھے۔ دو پلڑی ٹوپیوں کا دستور عام تھا۔ مگر چو گوشی مغلئی، تاجدار، پچگوشی ٹوپیاں مغل بچے اور شریف زادے پہنتے تھے، دلی کے بانکوں، البیلوں اور وضعداروں کی کج کلاہی مشہور تھی۔ چنانچہ میر تقی میر نے بھی اِن کج کلاہوں کو نادر شاہی سفّاک اور خون ریز قزلباشوں سے تشبیہہ دی ہے :

دہلی کے کج کُلاہ لڑکوں نے

کام عُشّاق کا تمام کیا

کوئی عاشق نظر نہیں آتا

ٹوپی والوں نے قتلِ عام کیا

مندیلیں، بنارسی ڈوپٹے گوٹے دار پگڑیاں مسلمانوں میں مروج تھیں، صافے سپاہیوں میں۔ قلعۂ معلّیٰ میں پگڑی بغیر کوئی نہیں جاسکتا تھا۔ درباری لوگ جامہ بھی پہنا کرتے تھے۔ اُمرا، جیغہ، سرپیچ اور شہزادے کلغیاں بھی لگاتے تھے۔ صاحبان ہنود میں جامہ کا زیادہ دستور تھا۔ اور پھر نیمہ یعنی نیم جامہ اور اُلٹی چولی کے انگرکھے کا رواج ہوا مسلمانوں میں الخالق۔ بالابر شیروانی اچکن، انگرکھے۔ قبا، عبا، جبہ، چغہ، مرزئی پوستینوں وغیرہ کا حسب موسم دستور تھا۔ ڈھاکے کی ململ، لکھنوکی شربتی، سوسی پت کا سینوں، بنارس کا مشروع دیسی سوتی کپڑے ہیں، اوّل نمبر رکھتا تھا، پاجامے یا تو تنگ موری کے یا ایک برکے یا غرارے دار پہنے جاتے تھے۔ غدر سے پہلے گھیتلے جوتے کفِ پائی کفش یا گول پنجے کے جوتوں کا رواج زیادہ تھا۔ مگر جب سے مرزا سلیم خلفِ اکبر شاہ ثانی نے لمبے پنجے کی سلیم شاہی جوتی ایجاد کی اُسے زیادہ پہننے لگے۔"

دہلی کے غیر تعلیم یافتہ اور جاہلِ مطلق لوگوں تک کے ذہن کی رسائی اور طبّاعی کا یہ عالم تھا کہ معمولی معمولی پیشہ ور لوگ بھی اپنے اپنے کاروبار کی مناسبت سے اختراعات کرتے تھے۔ مثلاً ترکاری یا پھل فروش جب ترکاری یا پھل فروخت کرتے تھے تو گاہکوں کو مائل کرنے کے لئے نت نئے طریقے سے مختلف ترکاریوں اور پھلوں کی خوبیاں بیان کرنے کے لئے حسین تشبیہات اور دلکش استعارات کا استعمال کرتے اور وہ بھی ایسی دل موہ لینے والی آوازوں میں کہ کبھی لحنِ داودی کا لطف

"آتا تھا تو کبھی میاں تان سین کی تان کا مزہ آجاتا تھا۔"

جیسے مار و بنگن کے لیے یہ آواز "بھاڑ میں ڈال یا چنے کی دال میں ڈال"

"شاہِ مرداں کی لڑیاں" لال لال اودی اودی علی گنج کی گاجروں کے لئے استعارہ ہے،
"پال کے لڈو۔ لڈوے کی پال" آموں کے لئے۔ "تیر کر آئی ہے بہتے دریا کو" ککڑیوں کے لئے۔ "نرمل تلاؤ کے دودھیا کیوڑے کی بیل کے سنگھاڑے" "کاغذی گری کے بھنا دیئے بادام یا اخروٹ کی گری کے مزے کا" بھنے ہوئے سنگھاڑوں کے لئے آوازیں ہیں۔ "گرمی کی ٹھنڈائی ہے میرٹھ سے منگائی ہے" کیرو والے کی آواز ہے۔ "قدرت کی بنی ہیں جلیبیاں کھالو" شہتوت والے کی آواز ہے یا "ریشم کے جال میں ہلایا قند کا بنا ہے جلیبا کھالو" "ڈالی ڈالی کا کھلا پیوندی ہے" آڑو بیچنے کی آواز ہے۔ فالسے والے کی آواز "سانولے سلونے ہیں شربت کو" "قند کے ڈلے ہیں قند کے" خربوزے والے کی آواز ہے "باڑی کے رنگ لال ہیں۔ چھلکوں تک رنگ لال ہیں"
تربوز والے کی آواز "کالے پہاڑ کی سوندھی اور میٹھیاں" کچری بیچنے والے کی آواز ہے "بن کرھائی کا حلوہ شکر قند" گھونگٹ والی تے توڑا ہے بیر" آؤ میاں سیر میں سوا سیر اناج ہرے بھرے یونٹ لڑیوں ہی پھلے" ہرا مٹر ہے سبزہ مٹر" گلاب ہیں بسائی ہیں گنڈیریاں پونڈے کی "نقطیوں بنا ہے بیدانہ، کلی گلاب بیدانہ، کابل کی واکھیں ہیں بیدانہ انار" مکھانہ اروی، پیڑا اروی لو" نمش والے کی آواز ہے" چاٹ ہے دولت کی" پھول والے کی آواز "لو کٹورے موتیا کے"
یہ وہ آوازیں ہیں جن میں زبان و بیان کی نفاست ایک ایک لفظ سے جھلکتی ہے

یہی فقیروں کا حال تھا، روز ایک نئی صدا بنا کر گھر گھر مانگا کرتے تھے۔ جیسے
"یا رب کی اور خیر سب کی۔" "چمن تھا گل ہو گیا کیا تھا کیا ہو گیا" "یہاں دے اور وہاں لے" "اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے" "دھم قلندر دودھ ملیدہ، ست قلندر دودھ ملیدہ" تیرے آگے کی بھی خیر پیچھے کی بھی خیر" (یہ ایک رسول شاہی فقیر کی پُر معنی صدا تھی)

"اب ذرا سقوں کی بھی کیفیت سن لیجیے ٹھنڈا پانی یا چھل پلانے والے سقے پورے تال اور سُر کے ساتھ دن بھر کٹورا بجا۔ بجا کر بازاروں میں آوازیں لگایا کرتے تھے اور جس وقت دو سقوں میں بحث آپڑتی تھی تو ہر ایک اپنا کمال دکھا کر تحسین و آفریں کا مستحق ہوتا تھا۔

بھری مشک کندھے پر، اس پر کھاردے کا ترسبز کپڑا پڑا ہوا ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا کٹورا بھرا ہُوا لیا اور ہر ایک شریف سے کہاکہ میاں پانی پلاؤں اگر کسی نے سبیل پلانے کی اجازت دے دی تو اس صُورت میں شعر پر شعر پڑھتے جاتے اور سبیل پکارتے جاتے تھے۔ کوئی کہتا تھا سبیل ہے پیاسوں کی، کوئی کہتا تھا تیرے پاس ہو تو دے جا نہیں پی جا راہِ مولا۔ کوئی کہتا تھا سبیل ہے حسینؓ کے نام کی، سبیل ہے دو شہزادوں کے نام کی،

پانی پیو تو یاد کرد پیاس امام کی
پیاسو! سبیل ہے یہ شہیدوں کے نام کی"

دلی کے صناع، دستکار، اہل حرفہ ایجاد و تقلید میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، خانم کا بازار غدر سے پہلے یونان کا طبقہ کہلاتا تھا۔ یہاں کے کاری گر خداداد ذہن وطبع رسا رکھتے تھے ایک سے ایک اپنے اپنے فن میں طاق اور عدیم المثال تھا یہاں صنعت کو صنّاعی تک لے جانا معیارِ فن سمجھا جاتا تھا۔ یہی حال یہاں کے دوسرے باکمالوں کا تھا، شاعر، ادیب، خطّاط اور موسیقار سے لے کر باورچی اور رکاول تک اپنے اپنے میدان میں یکتا اور یگانۂ روزگار ہوتے تھے۔ اسی لئے میرؔ نے اس شہر کو "منتخبِ روزگار" قرار دیا تھا۔

دلی آج بھی اس مشترکہ تہذیب کا سب سے بڑا مرکز ہے، اُردو زبان و ادب کا سب سے بڑا نہ سہی لیکن بہت بڑا گہوارہ آج بھی ہے اس شہر کی ادبی حیثیت آج بھی مُسلّم ہے۔ اُردو کے بیشتر سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کے علاوہ بہت سے نامور ادیب، شاعر، نقاد، محقق آج بھی اس شہر کی انفرادیت کا پرچم بلند کئے ہوئے ہیں یہ سلسلہ نہ کبھی منقطع ہوا تھا اور نہ اب ہوا ہے تقسیم ملک کے بعد جو لوگ یہاں سے چلے گئے تھے ان کی جگہ پنجاب، ہریانہ، اتر پردیش اور ملک کے دیگر حصّوں کے اُردو والے یہاں آکر آباد ہو گئے جو قدیم دلی والوں کے شانہ بہ شانہ اُردو زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں جہاں تک دلی کے مخصُوص مزاجِ زبان کا تعلق ہے آج اس میں بہت بڑا فرق پیدا ہو چکا ہے۔ یُوں بھی آج کے سائنٹفک دور اور برق رفتار زمانے میں کسی زبان کی علاقائی خصوصیت برقرار رہنا مشکل ہے، ریڈیو، ٹیلی ویژن، فلم، اخبارات، رسائل اور دوسرے ذرائعِ ابلاغ کے عام ہو جانے کے سبب زبان کے مزاج اور لب و لہجے

کے معیار میں یکسانیت کا عمل جاری ہوگیا ہے اس لیے آج زبان اور اس کے علاقائی لب و لہجے کی حیثیت آج ضمنی سی چیز ہوگئی ہے۔

ویسے بھی ہر تہذیب اور ہر زبان اپنے ارتقاء کی مختلف منزلوں سے گذرا کرتی ہے۔ تہذیب و تمدن اور زبان و ثقافت جامد اشیاء نہیں ہوا کرتیں بلکہ ان کا ارتقائی عمل ہمیشہ جاری و ساری رہتا ہے۔ آج نہ تو لکھنؤ میں آصف الدولہ کے عہد کی تہذیب اور زبان باقی ہے اور نہ دہلی میں بہادر شاہ ظفر کے عہد کی تہذیب و زبان نظر آتی ہے۔ آج نہ کوئی میر امّن کی زبان لکھنے والا دہلی میں ہے اور نہ رجب علی بیگ سرور کی زبان لکھنے والا لکھنؤ میں ہے۔ یہی حال اقدار کا ہے، یہی روایتوں کا، یہی لباسوں کا اور یہی بات مزاجوں کے بارے میں کہی جاسکتی ہے آج نہ تو لکھنؤ میں رگِ گُل سے بُلبُل کے پر باندھے جاتے ہیں اور نہ دہلی میں لنگوٹی میں پھاگ کھیلے جاتے ہیں۔ البتہ ان تصویروں کے کچھ گہرے کچھ ہلکے نقوش ضرور باقی رہ گئے ہیں جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ دُھندلے ہوتے چلے جارہے ہیں۔ آج لکھنؤ کی خارجیت اور دہلی کی داخلیت ماضی کی یادگاریں ہوچکی ہیں یہی وجہ ہے کہ آج کے دور میں خالص لکھنوی، اور ٹھیٹھ دہلوی، جیسی اصطلاحیں بھی اپنا مفہوم کھوتی جارہی ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ کو تو جانے دیجیے آج کے خلائی عہد میں تو ایشیائی، افریقی، یا یورپی جیسی اصطلاحات بھی اپنی حدوں سے نکل کر کرۂ ارض یا بین الاقوامیت کے دائرے میں سمٹ رہی ہیں۔ لہذا ایسے دور میں قدیم دہلی والے یا نئے دہلی والے کے درمیان خطِ امتیاز کھینچنا دشوار بھی ہوگا اور غیر مناسب بھی۔ پوری دنیا آج تہذیب و تمدن کی مرکزیت کی طرف رواں دواں ہے۔ آج کا شاعر، آج کا ادیب، آج کا فن کار زبان و بیان کے علاقائی پیمانوں یا تہذیب کی علاقائی برتری سے بالاتر ہو کر سوچنے کے عمل سے دوچار ہے۔ لہذا ایسے دور میں عہد ماضی کی اس مخصوص دہلوی تہذیب و ثقافت اور زبان و بیان کو یاد تو کیا جاسکتا ہے پھر سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ آج دہلی کی تمدنی زندگی میں پنجاب کی لسّی اور چھولے بٹورے بھی داخل ہوچکے ہیں اور جنوبی ہند کی اڈلی اور ڈوسہ بھی، بنگالی مٹھائی بھی، گجرات کا چوم اور راجستھان کا ماوا بھی۔ انگریزی اثرات کے تحت آملیٹ، کٹ لیٹ، ہمبرگر، سوپ، فنگر چپس، کیک، پیسٹری، ہٹ، بریڈ، جیم، سینڈوچز

کا بھی چلن عام ہے اور میز کرسی، چھری کانٹے کا بھی رواج ہے۔ کرسی پر بیٹھ کر بھی کھایا جاتا ہے اور فرش پر بیٹھ کر بھی کھایا جاتا ہے اور کھڑے ہو کر کھانے کا بُفے سسٹم بھی عام ہو چکا ہے۔ یہی صورت لباس و پوشاک کی ہے اور یہی صورت تفریحات اور مشاغل کی ہے۔ دہلوی لب و لہجے اور روزمرّہ کی بات تو درکنار آج تو خالص اُردو بھی نہیں بولی جاتی۔ انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کا دخل اتنا ہو چکا ہے کہ اس کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی حال روایتوں کا ہے۔ نہ وہ عاشق رہے نہ وہ معشوق رہے" نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زُلفِ ایاز میں عشقِ حقیقی اپنی حقیقت کھو چکا ہے اور عشقِ مجازی، عشقِ بزاجی، میں تبدیل ہو چکا ہے یہی حال موسیقی کا ہے آج غزل اور ٹھمری کے ساتھ ڈسکو اور مغربی موسیقی کا چسکا بھی عام ہو چکا ہے۔ یہی معاملہ آبادی کا ہے آج دہلی میں سب سے زیادہ تعداد تو پنجاب، ہریانہ اور اُتر پردیش سے آکر بسنے والوں کی ہے ان کے علاوہ بنگال، جنوبی ہند اور بہار کے لوگ بھی بڑی تعداد میں یہاں آباد ہو چکے ہیں، نسلاً بعد نسلاً رہتے چلے آنے والے" دہلی والوں" کی تعداد کُل آبادی کے تناسب میں اب بہت کم رہ گئی ہے۔

پھر "یہ دہلی والے" بھی نئے ماحول کے زیرِ اثر اپنی مخصوص پہچان اور امتیازی شناخت کھوتے جا رہے ہیں یا دوسرے الفاظ میں نئے ماحول کے زیرِ اثر پیدا ہونے والی نئی تہذیب میں ڈھلتے جا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے ماحول میں دہلی والے، کا مفہوم بھی قدیم مفہوم سے مختلف ہو چکا ہے لہٰذا اب" دہلی والے" کی اصطلاح کی توجیہہ بھی موجودہ عہد کے وسیع پس منظر میں کی جانی چاہیے اس وجہ سے دہلی اُردو اکادمی کے اس سیمنار میں پرانے اور نئے دہلی والے کی کوئی تفریق نہیں برتی گئی ہے اور" دہلی والے" کی اصطلاح کو موجودہ عہد کے پس منظر میں عملی جامہ پہنایا گیا ہے۔

دِلّی والے، سیمنار پر مبنی اس کتاب کے حوالے سے چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں سب سے پیشتر تو مجھے یہ اعتراف کرنا ضروری ہے کہ اس کتاب میں جن شخصیات پر خاکے لکھوائے گئے ہیں وہ خاکے کی فنی تعریف کے معیار پر ہو سکتا ہے پورے نہ اُترتے ہوں لیکن اتنا ضرور ہے کہ خاکہ نگار حضرات نے اپنی اپنی بساط بھر خاکہ لکھنے کی پوری کاوش کی ہے۔ کس خاکہ نگار نے کس معیار کا خاکہ لکھا ہے اس کا فیصلہ میں قارئین پر چھوڑتا ہوں لیکن ناظم سیمنار ہونے کے ناطے مجھے یہ کہنے میں کوئی تامّل نہیں ہے کہ اس سیمنار میں شامل ہر قلم کار نے اپنی یادوں کے سہارے متعلقہ

شخصیت کی کامیاب تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ ہوسکتا ہے کسی خاکے میں سوانح کا حصہ زیادہ شامل ہوگیا ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ کسی شخصیت کے خاکے میں اُس کی سیرت کے کچھ اہم پہلو اجاگر نہ ہو سکے ہوں یا عادات واطوار کا بیان پوری طرح نہ ہوا ہو۔ مگر ان کمیوں کو خاکہ نگار حضرات کی کوتاہیوں پر محمول نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ انسان کی شخصیت اور اُس کی زندگی ایک پیچیدہ عمل ہے۔ کسی فرد کی نفسیات، اس کی شخصیت کے رموز اور اُس کے شعور اور لاشعور کی تہوں تک پہنچنا نہایت دشوار کام ہوتا ہے کیونکہ شخصیت سازی میں نسلی وراثت سے لے کے معاشرت اُس کی اقدار، مُتعقدات، فلسفے، تاریخ، معاشیات واقتصادیات اور عصری ماحول تک سب ہی چیزیں اثرانداز ہوتی ہیں۔ لہٰذا کسی فرد کے تعلق سے اُس کی شخصیت پر پڑے ہوئے اتنے بہت سے پردوں کی نقاب کُشائی کرنا جُوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ یُوں بھی خاکے کی بُنیاد ذاتی تاثرات کے اظہار پر ہوتی ہے۔ اس لئے خاکہ نگار صرف اُنہی واقعات کا انتخاب کرتا ہے جو اس کے ذاتی تاثرات کی وضاحت میں مددگار ثابت ہوتے ہیں جب کہ مورخ یا سوانح نگار تمام واقعات کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔" دراصل خاکہ نگاری کسی شخصیت کا معروضی مطالعہ ہوتا ہے جس کے لئے خاکہ نگار میں قوتِ مشاہدہ، فہم وادراک اور غیر جانبداری کے ساتھ ہمدردانہ رویّے اور اندازِ بیان میں فصاحت وبلاغت کا ہونا ضروری ہے۔"

اچھے خاکے کی تعریف یہ ہے کہ کسی شخصیت کے کچھ اہم یا منفرد پہلو ایسی ماہرانہ نفاست کے ساتھ اجاگر کئے جائیں کہ قاری پر اس شخصیت کا مخصوص تاثر پیدا ہو جائے۔ اور اس کے افکار و کردار کی جھلکیاں بھی دیکھنے کو مل جائیں نیز خاکہ پڑھنے کے بعد متعلقہ شخصیت کی صورت، سیرت، مزاج، ذہن، اُس کی خوبیاں اور خامیاں سب نظروں کے سامنے آجائیں۔" خاکے میں غیر ضروری تفصیل کی گنجائش بھی نہیں ہوتی۔ یعنی خاکے کا فنّی وصف اس کے اختصار میں مُضمر ہے۔ اختصار سے محض لفظوں کی کفایت مراد نہیں بلکہ ایسی کفایتِ الفاظ مراد ہے جس میں دریا کو کُوزے میں بند کرنے کی کیفیت ہوتی ہے۔ اچھے خاکے میں یہ عمل زبان اور الفاظ کے استعمال کے ساتھ ساتھ دیگر اجزا میں بھی باقی رہتا ہے۔ اختصار کی اس خصوصیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے طویل خاکے بھی لکھے جا سکتے ہیں۔" خاکہ نگاری کی بھی دو قسمیں ہوسکتی ہیں

ایک طویل اور دوسرا مختصر اس صنف ادب میں جہاں عبدالحق کا لکھا ہوا حکیم امتیاز الدین کا خاکہ صرف ڈیڑھ صفحے پر ملتا ہے، وہیں دوسری طرف مرزا فرحت اللہ بیگ کا طویل خاکہ جو کئی صفحات پر مشتمل ہے "نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی" بھی ملتا ہے۔"

لہٰذا انتخاب اور ایجاز کے باوصف اگر خاکہ طویل ہو جاتا ہے تو یہ عیب نہیں ہوتا، لیکن طویل خاکے کے مقابلے میں مختصر خاکے کو ہی بہتر اور اچھا سمجھا جاتا ہے کیونکہ خاکہ کسی فرد کی مکمل داستان حیات نہیں ہوتا بلکہ فرد کی نمایاں خصوصیات کا عکاس ہوتا ہے" اس میں تفصیل سے زیادہ اجمال اور توضیح سے زیادہ ابہام سے کام لیا جائے تو اچھا ہے۔ ساتھ ہی خاکے کے فنی لوازم میں مزاح کی چاشنی اور نکتہ آفرینی بھی ضروری ہے لیکن طنز کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ جہاں خاکے میں طنز یا تیکھا پن آیا وہیں سے ہجو کی سرحد شروع ہو سکتی ہے۔ خاکہ نگار کو خاکہ لکھتے وقت شخصی عناد۔ کینہ اور بغض یا حسد سے اپنی ذات کو بالاتر رکھنا پڑتا ہے۔" اسی طرح خاکہ نگار کو محض مدح یا صرف عقیدت مندی سے بھی گریز کرنا چاہیئے۔ یعنی خاکہ "مدلل مداحی" کا فن بھی نہیں ہے۔ خاکہ نگاری میں خاکہ نگار کی اپنی ذات اور شخصیت کا اظہار بھی کم سے کم ہونا چاہیئے یعنی خاکے کو مذکورہ شخصیت اور خاکہ نگار کے" تعلقات کا اشتہار" نہیں ہونا چاہیے۔ بسا اوقات اچھے خاکے اسی وجہ سے ناکام تحریریں بن جاتے ہیں۔

"خاکے میں کسی شخص کی سیرت اور کردار کی محض خصوصیات گنانا مقصود نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ کچھ جھلکیاں واقعاتی پس منظر کے ساتھ پیش کی جانی چاہئیں۔ سنے سنائے واقعات کے مقابلے میں ایسے واقعات کو ترجیح دینی چاہیئے جو خود خاکہ نگار کے مشاہدے یا تجربے میں آچکے ہوں۔ پھر ان واقعات کے انتخاب میں دلچسپی انفرادیت' تازگی و اہمیت کے عنصر کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے۔ تاکہ مجموعی تاثر کمزور نہ پڑ سکے۔ ساتھ ہی واقعات کو بیان کرنے کا سلیقہ بھی ہونا ضروری ہے کیوں کہ خاکے کی دلچسپی اور اثر انگیزی کا انحصار بڑی حد تک اس بات پر ہوتا ہے کہ واقعات کو کس ڈھنگ سے بیان کیا گیا ہے۔ بیان ایسا ہونا چاہیئے کہ پڑھنے یا سننے والے کو واقعہ اپنی نظروں کے سامنے ہوتا ہوا دکھائی دے واقعات کے بیان میں منظر کشی سے بھی مدد لی جاتی ہے۔ حقیقت میں منظر کشی اس

کیفیت کا نام ہے جو متعدد واقعات یا کسی ایک واقعے کی متعدد جزئیات کے مجموعے سے پیدا ہوتی ہے۔ منظر نگاری کی وجہ سے زمان و مکان کا تعین ہوتا ہے۔ خاکے کے جملہ عناصر ترکیبی میں کردار نگاری کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ ایک ایسا بنیادی جز ہوتا ہے کہ اس کے بغیر خاکے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ کردار نگاری کے ضمن میں مذکورہ شخصیت کے خدو خال، حرکات و سکنات، لباس، نفسیاتی اور ذہنی کیفیات و تغیرات سب کچھ پیش کیا جاتا ہے خاکہ نگار کو خاکے میں اپنی فن کاری سے اس طرح شخصیت کی دوبارہ تخلیق کرنا پڑتی ہے کہ وہ شخصیت جس پر خاکہ لکھا گیا ہے خاکے کے کینوس پر متحرک بھی ہو سکے۔ اس لئے خاکہ نگار کو شخصیت کے رنگ روپ، وضع قطع اور عادات و اطوار کی جھلک بھی دکھانا ضروری ہے تاکہ اُس شخصیت کے نقوش ایسے گہرے اور اتنے واضح ہوں کہ قاری یا سامع کا ذہن اُسے مدت تک نہ بھلا سکے۔ خاکہ نگار کے اپنے سماجی، اخلاقی، مذہبی، سیاسی تصورات کو بھی خاکہ نگاری میں حائل نہیں ہونا چاہیئے ورنہ شخصیت کی صحیح ترجمانی اور تصویر کشی ممکن نہیں ہو سکتی۔ خاکہ نگار کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ شخصیت کی مناسبت سے موزوں لب و لہجہ اختیار کرے۔ اگر شخصیت سنجیدہ اور متین ہے تو لب و لہجہ بھی اسی مناسبت سے اختیار کیا جانا چاہیئے۔ اگر شخصیت کے مزاج میں مزاح کا عنصر زیادہ ہے تو پھر اُسی قسم کی زبان استعمال کی جانی چاہیئے۔ بہر نوع جو رنگ جس تصویر کے لئے مناسب ہوں اُن ہی رنگوں کو استعمال کرنا چاہیے۔ ادب کی کوئی صنف بھی زبان و بیان کے سہارے کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتی یہی حال خاکے کا ہے۔ خاکہ چونکہ ایک بیانیہ صنف ہے اس لئے اس میں زبان و بیان کی اہمیت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ اسی کے ذریعے خاکہ نگار کسی شخصیت کو چلتا پھرتا، ہنستا بولتا، خوش ہوتا یا غصہ کرتا دکھاتا ہے۔

" اس لئے خاکے کو اصل کی مانند پُراثر بنانے کے لئے خاکہ نگار کو اپنے بیان میں قوت پیدا کرنی پڑتی ہے اور اسے پیدا کرنے کے لئے وہ موزوں الفاظ حسین تشبیہات، دل کش استعارات اور دوسری صنعتوں کا سہارا بھی لیتا ہے۔ تاکہ حقیقت کی اصل عکاسی کی جا سکے۔ محاضرات کا استعمال بھی زبان و بیان میں قوت پیدا کرنے کے لئے کیا جاتا ہے اس میں مخصوص ادھورے فقرے، یا تکیہ کلام، یا آنکھ ناک بھوں، ہونٹ ہاتھ پیر جیسے اعضا کو کسی خاص زاویئے سے حرکت دینے

کی عادات کا بیان شامل ہوتا ہے۔ اِن حرکات کا ذِکر مذکورہ شخصیت کے تعلق سے اس کی ظاہری شکل وصورت کو سمجھنے اور سمجھانے میں معاون ثابت ہوتا ہے یہ حرکات وسکنات ہلکے پھلکے چھوٹے بڑے واقعاتی اور اشاراتی ٹکڑے ہوتے ہیں جن کی اپنی ایک اکائی ہوتی ہے اور یہ فرد کی سیرت وصورت مزاج وطبع کی انفرادیت کو ظاہر کرتے ہیں۔"

" خاکہ نگاری کے محرکات میں کبھی تو کسی مخصوص شخصیت سے تعلق خاطر کا ہونا یا کسی شخصیت میں غیر معمولی اوصاف کا پایا جانا یا کسی سے عقیدت کے جذبے کا ہونا، یا کبھی مذکورہ شخصیت اور شخصیت نگار کے درمیان مزاج اور سیرت کی ہم آہنگی کا پایا جانا یا کبھی کسی شخصیت سے دائمی جدائی ہو جانا یا اپنے دوستوں، جاننے والوں اور احباب سے ذاتی نوعیت کے تعلقات کا ہونا یا اسلاف پرستی کے جذبے کا ہونا یا کسی سے ملاقات یا تعارف کے بعد متاثر ہو جانا جیسے عوامل شامل ہوا کرتے ہیں۔"

" خاکے صرف بڑے یا عظیم افراد پر ہی نہیں لکھے جاتے بلکہ درمیانی، اوسط درجے یا معمولی سے معمولی انسان پر بھی خاکہ لکھا جا سکتا ہے کیونکہ جس طرح عظیم ہستیوں کی سیرت کی نقاب کشائی مشاہدات وتجربات میں اضافے یا دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے اسی طرح معمولی سے معمولی انسان کی سیرت کی عکاسی اور حالات کا بیان بھی دلچسپی اور معلومات فراہم کا ذریعہ ہو سکتے ہیں۔ مگر عام اشخاص کو خاکہ نگاری کا موضوع کم بنایا گیا ہے حالانکہ ہر شہر اور مقام پر ایسے افراد ہوتے ہیں جن کی شخصیت دلچسپ، منفرد اور لائق توجہ ہوتی ہے"۔ بابائے اُردو عبدالحق اپنی تصنیف چند ہم عصر میں لکھتے ہیں کہ:

> " دولت مندوں، امیروں بڑے لوگوں ہی کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کی زندگی ہمارے لئے سبق آموز ہو سکتی ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں غریب امیر کا کوئی فرق نہیں۔ پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اِک شان ہے۔"

اُردو میں خاکہ نگاری کی ابتدا کے ڈانڈے مولانا محمد حسین آزاد کی آبِ حیات اور مولانا حالی کی یادگارِ غالب سے جوڑے جاتے ہیں لیکن اس صنفِ ادب کی نشوونما میں جن حضرات کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں ان میں مرزا فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی، آغا حیدر حسن، بابائے اُردو مولوی عبدالحق، مولانا ابوالکلام آزاد، بشیر احمد ہاشمی، سعادت حسن منٹو، شوکت تھانوی

شاہد احمد دہلوی، اشرف صبوحی، خواجہ غلام السیّدین، عبدالرزاق کان پوری، مولانا عبدالماجد دریاآبادی، رشید احمد صدیقی، عصمت چغتائی، سردار دیوان سنگھ مفتوں، چراغ حسن حسرت، سید غلام پنجتن شمشاد خواجہ محمد شفیع دہلوی، عبدالمجید سالک، ضیاء الدین احمد برنی، رئیس احمد جعفری، مجید لاہوری، مرزا محمود بیگ، محمد طفیل، اعجاز حسین، الطاف حسین قریشی، کنہیالال کپور، شورش کاشمیری، تمکین کاظمی، عبدالاحد خاں، معین الدین دردائی، نریش کمار شاد، غلام احمد فرقت کاکوروی، فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین، سید ضمیر حسن دہلوی، علی جواد زیدی، بلونت سنگھ اور زکی انور شامل ہیں۔

مستقبل میں خاکہ نگاری کے امکانات بہت زیادہ روشن ہیں اس لئے کہ "خاکہ کا ہر موضوع جداگانہ شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے موضوعات کا تنوّع سب سے زیادہ خاکے ہی کی صنف میں مل سکتا ہے"۔ موضوعات کی تازگی اور ندرت بیان کے سبب خاکہ نگاری کا مستقبل روشن بھی ہے اور وسیع تر بھی ہے جس طرح اصناف شاعری میں غزل سب سے مقبول ترین صنف رہی ہے اس طرح خاکے کو بھی موجودہ اور آنے والے عہد کی مقبول ترین صنف ادب سے تعبیر کیا جائے تو میرے خیال میں مبالغہ نہ ہوگا بقول ڈاکٹر خلیق انجم "خاکے کو اگر نثر میں غزل کا فن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا جس طرح غزل میں طویل مطالب بیان کرنے پڑتے ہیں اسی طرح خاکے میں مختصر الفاظ میں پوری شخصیت پر روشنی ڈالنی پڑتی ہے"۔ یوں بھی خاکہ نگاری کو پروان چڑھانے میں جن صاحب طرز ادیبوں نے اہم حصہ لیا ہے وہ افسانہ، انشائیہ اور مزاح نگاری کے فن پر قدرت رکھتے تھے۔ نتیجتاً خاکے کی صنف میں مختلف اصناف ادب کی خصوصیات بھی یکجا ہوگئیں ہیں اور اسالیب کے تنوّع کے ساتھ فنّی اعتبار سے بھی خاصی وسعت پیدا ہوگئی ہے کیونکہ اظہار کے تجربوں کی اس صنف میں بڑی گنجائش ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ آنے والے زمانے میں صنف خاکہ نگاری کے مزید ترقی کرنے کے روشن امکانات ہیں اور یقیناً یہ صنف ادب مستقبل میں اُردو نثر کی ایک باغ و بہار اور سدا بہار صنف بن جائے گی۔

اس کتاب میں شخصیات کی فہرست کو حروف تہجی کی ترتیب کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے اور یہی طریقۂ کار کتاب کے آخیر میں پیش کی گئی خاکہ نگاروں کی فہرست کو ترتیب دینے میں بھی وضع کیا گیا ہے۔

سیمنار میں پڑھے گئے خاکوں میں کچھ خاکے دستیاب نہ ہو سکنے کے سبب، اس کتاب میں شامل نہیں کئے جا سکے ہیں، دستیاب ہونے کی صورت میں ان خاکوں کو "دِلّی والے" سیمنار کی دوسری قسط میں پیش کئے جانے والے خاکوں کے ساتھ شامل کر کے شائع کر دیا جائیگا۔

آخر میں اُن تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنا خوشگوار فرض سمجھتا ہوں کہ جنھوں نے "دِلّی والے" سیمنار میں مختلف حیثیتوں سے شرکت فرماکر اسے کامیاب بنایا۔

جناب کنور مہندر سنگھ بیدی اور جناب انور علی دہلوی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنھوں نے اس سیمنار کی افتتاحی تقریب کو اپنی شرکت سے رونق بخشی اور سیمنار کو مرحلے وار منعقد کرانے کا نیک فریضہ انجام دیا۔

ناشکری ہوگی اگر میں دہلی اُردو اکادمی کے مُشیر، سیّد شریف الحسن نقوی صاحب کا خلوص دل سے شکریہ ادا نہ کروں کہ جنھوں نے اس سیمنار کے اِنعقاد میں نہ صرف یہ کہ دامے، درمے، قدمے، سخنے، اپنا تعاون دیا بلکہ قدم قدم پر رہبری ہمّت افزائی کر کے میرا حوصلہ بھی بڑھایا، میں سمجھتا ہوں کہ اس سیمنار کی کامیابی کا سہرا ان ہی کے سر ہے اس سیمنار میں پیش کئے گئے خاکوں کو کتابی صورت میں ترتیب دینے کے دوران جو دشواریاں مجھے پیش آئیں انھیں دور کرنے میں بھی نقوی صاحب نے میری پوری مدد فرمائی، میں ایک بار پھر خلوصِ دل سے اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

دہلی اُردو اکادمی کے ڈپٹی سکریٹری محترم محمد عارفین صاحب نے بھی اس سیمنار کو کامیابی سے ہمکنار کرانے کے لئے اپنی کوششوں میں کوئی کسر نہ چھوڑی سیمنار کے مالی معاملات سے لے کر طعام کے اہتمام تک عارفین صاحب نے دُعا بھی دی اور دوا بھی کی، میں اپنے قلب کی گہرائیوں سے اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اکادمی کے اسسٹنٹ سکریٹری، مرغوب عابدی صاحب اور دیگر جملہ اربابِ حل وعقد کا نیز عزیزی فرید احمد، رئیس احمد، انیس الرحمٰن، جمیل الرحمٰن اور مرزا شاق بیگ صاحب کا بھی ممنونِ کرم ہوں کہ ان سب حضرات کی مساعی جمیلہ کے سبب "دِلّی والے" سیمنار کا اِنعقاد ممکن ہو سکا۔۔۔ درحقیقت عملی طور پر تو یہ سب حضرات ہی ناظم سیمنار تھے، نام میرا تھا اور کام ان سب کا تھا اس لئے سیمنار کی کامیابی کے لئے مبارکباد کے اصل مستحق یہی سب حضرات ہیں۔

اُستاذی محترم پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر قمر رئیس، برادرِ محترم ڈاکٹر خلیق انجم (سکریٹری انجمن ترقی اُردو ہند) ڈاکٹر کامل قریشی، شفیق استاد سید ضمیر حسن دہلوی محبّی عظیم اختر (پریس آفیسر دہلی ایڈمنسٹریشن) ان سب اساتذہ اکرام، مشفقوں، اور دوستوں کا خصوصیت کے ساتھ ممنونِ احسان ہوں کہ اس سمینار کے تعلق سے اِن حضرات نے اپنے مُفید اور قیمتی مشوروں سے مجھے سرفراز کیا اور قدم قدم پر میرا حوصلہ بڑھا کر میری رہنمائی فرمائی۔

میری درخواست پر جناب عظیم اختر نے خاکہ نگاروں کا مختصر تعارف لکھنے کی زحمت گوارہ فرمائی، میں اس قلمی تعاون کے لئے بھی ان کا ممنون ہوں۔ میں جناب صداقت علی خاں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنھوں نے اس کتاب کی کتابت کرنے کو اپنی ساری مصروفیات پر ترجیح دی۔

(ڈاکٹر) صلاح الدین

ڈائریکٹر سمینار و ممبر دہلی اُردو اکادمی۔ دہلی

۲۷ جنوری ۱۹۸۶ء

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی
(شعبہ اُردو) دہلی یونیورسٹی دہلی

مولانا ابوالکلام آزاد

وہ موسم کے اعتبار سے ایک معتدل رات تھی جب میں کسی عزیز کے انتظار میں علی گڑھ کے اسٹیشن پر ٹہل رہا تھا۔ میرے ساتھ جو عزیز اور ان کے دوست تھے وہ سب یونی ورسٹی کے طالب علم تھے اور میں ابھی اسکول میں تعلیم پا رہا تھا۔ اچانک کسی نے اطلاع دی کہ وہ ٹرین جو چند لمحات میں پہونچنے والی ہے اس میں مولانا ابوالکلام آزاد سفر کر رہے ہیں۔ سب کو اشتیاق ہوا کہ مولانا کی زیارت کی جائے۔ نظریاتی اختلاف کے باوجود مولانا کے علم و فضل اور لیڈر کی حیثیت سے بیشتر اصحاب کے دل میں ان کا احترام تھا۔ اچانک گاڑی پلیٹ فارم پر پہونچی اور طلبہ نے فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے ڈبے دیکھنا شروع کر دیئے۔ ایک کمپارٹمنٹ پر مولانا کے نام کی چٹ لگی ہوئی تھی مگر اس کا دروازہ بند تھا۔ طلبہ نے دستک دی اور جب کوئی جواب نہ ملا تو کسی نے قلم کی نوک سے کھڑکی کا شٹر اٹھا دیا۔ اندر برتھ پر مولانا تشریف رکھتے تھے۔ ایک طالب علم نے بلند آواز سے کہا کہ "مولانا ہم لوگ آپ کی زیارت کے لیے آئے ہیں"، مولانا نے جواب دیا "جہنم میں جاؤ۔" برجستہ کسی منچلے نے جواب دیا "مولانا! رہنمائی فرمایئے۔" ریل نے سیٹی دی اور ملاقات ختم ہوئی۔ میں سہما اور دبکا ہوا اس انتظار میں کھڑا تھا کہ جب دروازہ کھلے گا تو ہم بھی دیکھ لیں گے کہ جس کی شہرت تمام ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی ہے وہ کس شکل و شباہت کا ہے۔ مگر اس گفتگو سے

مایوسی ہوئی۔ مولانا کے اس رویہ سے ان کو زیادہ موردالزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا کیونکہ ایک دفعہ علی گڑھ کے اسٹیشن پر بعض طلبہ کی غیر ذمہ داری کے باعث مولانا کے ساتھ ناخوشگوار واقعہ پیش آچکا تھا۔ شاید یہ جواب اسی ناخوشگوار واقعہ کا ردعمل تھا۔ یہ میری مولانا آزاد سے پہلی ملاقات تھی۔

ملک آزاد ہوگیا۔ قتل وخوں ریزی کا بازار گرم تھا۔ ہراس اور عدم تحفظ کا احساس ہر مسلمان کے دل و دماغ میں بیٹھ گیا تھا۔ گھر سے باہر نکلنا موت کو دعوت دینا تھا۔ قافلوں کے قافلے اسٹیشن پر خانہ بدوشوں کی طرح پڑے ہوئے تھے اور ان کو یہ بھی یقین نہیں تھا کہ جس منزل کی طرف جارہے ہیں وہاں پہونچ بھی جائیں گے اور اگر پہونچ جائیں گے تو اس نئی منزل پر ان کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ دلّی کے گلی کوچوں میں خاک اڑ رہی تھی۔ لوگ سمٹ کر پرانے قلعہ میں پناہ گزیں تھے۔ چانک مسجد جامع کے منبر سے ایک آواز بلند ہوئی۔

"تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں یہیں سے پکارا اور تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کردیئے۔ میں نے چلنا چاہا، تم نے میرے پاؤں کاٹ دیئے۔ میں نے کروٹ لینا چاہی، تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ پچھلے سات سال کی تلخ نوا سیاست جو تمہیں آج داغ جدائی دے گئی اس کے عہد شباب میں بھی میں نے تمہیں خطرے کی ہر شاہراہ پر جھنجوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کردیں۔ نتیجہ معلوم کہ آج ان ہی خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے جن کا اندیشہ صراط مستقیم سے دور لے گیا تھا .... تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمہارا بھروسہ تھا وہ تمہیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے ہیں۔ وہ تقدیر جو تمہارے دماغی لغت میں مشیت کی منشا سے مختلف مفہوم رکھتی ہے۔ یعنی تمہارے نزدیک فقدانِ ہمت کا نام تقدیر ہے۔"

سُنا ہے کہ مولانا تقریر کر رہے تھے اور لوگوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بوڑھوں کی داڑھیاں تر ہوگئی تھیں اور نوجوانوں کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ یہ میری مولانا آزاد سے دوسری غائبانہ ملاقات تھی۔

تاریخ نے اپنا ورق پلٹا اور مولانا آزاد علی گڑھ کے کانوکیشن میں ایڈریس پڑھنے کے لیے آئے۔ بڑے سے پنڈال میں اساتذہ اور طلبہ کا ہجوم تھا۔ ذاکر صاحب وائس چانسلر تھے۔ میں

بھی ایک گوشہ میں بیٹھا بڑے غور سے مولانا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مولانا ڈائس پر آئے اور ولولہ خیز تقریر کا آغاز کیا۔ تقریر کے الفاظ تو یاد نہیں البتہ کچھ اس انداز کی تقریر کر رہے تھے کہ

"پاکستان کے نعرہ نے تم کو پاگل بنا دیا تھا۔ ایک بھیڑ چال تھی جس میں بغیر کسی مقصد اور نصب العین کے آگے بھاگے جا رہے تھے۔ ترقی کے وہ دروازے جن کو تمہارے لیے کھلا ہونا چاہئے تھا ان کو تم نے اپنے اعمال سے بند کر دیا۔ مگر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے اپنے اندر تبدیلی پیدا کر لو ترقی کے وہ دروازے خود بخود کھل جائیں گے"

مولانا نے مزید کہا کہ

"مجھ کو سرسید کی پالیسی سے ہمیشہ اختلاف رہا اور آج جب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ مجھے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میری رائے درست تھی"

اساتذہ اور طلبہ پر اس تقریر کا کوئی خوشگوار اثر نہیں پڑا۔ مگر طلبہ جس احساس کمتری سے اس وقت دوچار تھے اس میں سر جھکا کر سن لینے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا شام کو طلبہ نے یونین میں مولانا آزاد کو مدعو کیا۔ یونین ہال میں مہمان کے استقبال کا منظر بڑا دلکش ہوتا ہے۔ ڈائس پر جہاں مہمان کی کرسی ہوتی ہے وہاں اس کے پہونچتے ہی پھولوں کی بارش نے ان کو نہلا دیا۔ صدر یونین شاہ حسن عطا نے تقریر کا آغاز کیا۔

"ایک مفسر قرآن نے صحیح کہا تھا کہ سیاست کے ریلے نے ہم کو پاگل بنا دیا تھا۔ ہم اندھے ہو رہے تھے اور ایک بھیڑ چال تھی جس کا کوئی مقصد نہیں، منزل نہیں۔ مگر مولانا کو شاید علم نہیں کہ ہم نے اس وقت سواد اعظم کا ساتھ دیا تھا جس کے لیے ہم کو قرآن نے حکم دیا تھا۔ آج جب ہم پیچھے کی طرف دیکھتے ہیں تو ہم کو اپنے کیے پر کوئی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ اب حالات بدل چکے ہیں فرد کی وفاداری کوئی معنی نہیں رکھتی۔ وفاداری ملک سے ہوا کرتی ہے ہم اس کے وفادار ہیں اور ہم نے اپنا مستقبل اسی سے وابستہ کر دیا ہے"

لوگ حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ذاکر صاحب کے چہرہ سے بے چینی کے آثار نمایاں تھے۔ مولانا آزاد کے چہرہ کا رنگ غصہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں کہ کون سا آتش فشاں پھوٹ بہے۔ شاہ حسن عطا نے تقریر ختم کی اور مولانا لپک کر آگے بڑھے اور جلسہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "مجھے یہ خیال تھا کہ آپ لوگ مجھ سے سنیں گے۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ مجھے سننا پڑے گا میں جن ترقی کے دروازوں کو کھلا دیکھ رہا تھا

اب وہ تمہاری قسمت میں نہیں ہیں۔ وہ دروازے بند ہو چکے ہیں" مہمان اور میزبان دونوں ایک دوسرے سے مکدر اور مایوس۔ یہ میری مولانا سے تیسری ملاقات تھی اور پہلی مرتبہ ان کی زیارت کر رہا تھا۔

۱۵ر فروری ۱۹۵۸ء کو دہلی میں اردو کانفرنس تھی۔ اسٹیج پر مولانا آزاد کے ساتھ پنڈت جواہر لال نہرو، عبدالمجید خواجہ اور پنڈت سندر لال بھی تھے۔ مولانا تقریر کے لیے کھڑے ہوئے ان کی تقریر مختصر تھی مگر وہ آواز آج بھی کانوں میں گونج رہی ہے۔

"آپ اردو کے حامی ہیں لیکن کسی زبان کے مخالف نہیں ہیں۔ جیسا کہ ابھی میرے دوست پنڈت سندر لال نے کہا۔ یہاں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو ہندی کا مخالف ہو۔ یہی صحیح اسپرٹ ہے اور اسی اسپرٹ سے مل کر راستہ صاف ہوتا ہے..... ہندی کو جو جگہ ملنی تھی وہ اسے مل گئی۔ لیکن اسی کے ساتھ اردو کی جو جگہ ہے وہ اسے ملنی چاہیے۔"

خواہشوں سے نہ تدبیریں بنا کرتی ہیں اور نہ تقدیریں بدلا کرتی ہیں مولانا کی نیک نیتی میں شبہ نہیں مگر وزیر تعلیم اتنا بھی بے بس ہو سکتا ہے کہ کسی زبان کو اس کا حق نہ دلوا سکے یہ میرے دائرۂ تصور سے باہر تھا۔

ابھی ایک ہفتہ نہ گذرا تھا کہ ۱۹ فروری کو پتہ چلا کہ مولانا پر فالج کا حملہ ہوا۔ اور ۲۳ فروری ۵۸ء کو انھوں نے اپنی جان جان آفریں کو واپس کر دی۔ مولانا کی میت کو شاہجہانی مسجد کے سامنے سپرد خاک کر دیا گیا۔ یہ میری مولانا سے آخری ملاقات تھی۔

اوپر کے واقعات سے مولانا آزاد کا جو خاکہ مرتب ہوتا ہے اس کے نفسیاتی تجزیہ کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی بات یہ یاد رکھنے کی ہے کہ مولانا عوام پسند کبھی نہ بن سکے۔ رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں "وہ اپنے پبلک کے نہیں جتنے لیڈروں کے لیڈر تھے۔ مولانا اپنے آپ کو عوام سے زیادہ خواص کی راہ نمائی پر مامور سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں بھی ایک مخصوص حلقہ کے دل و دماغ پر اثر کرتی رہیں اور عوام ان کے معنی تلاش کرتے رہے۔ یہاں سے غلط فہمیوں کا آغاز ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مولانا آزاد نے علی گڑھ تحریک کی کبھی تائید نہیں کی اور علی گڑھ مسلمانوں کی امید گاہ بنا ہوا تھا۔ علی گڑھ پر تنقید پورے مسلم معاشرہ پر تنقید خیال کی جاتی تھی۔ سرسید کی گرفت جو اس عہد کے ذہنوں پر تھی مولانا آزاد کی دسترس اس تک ممکن نہ تھی۔ علی گڑھ کا ناخوشگوار واقعہ محض سیاسی اختلاف کا نتیجہ نہیں تھا۔ ورنہ وہ اساتذہ اور طلبہ جو نظریاتی طور پر مختلف الخیال

تھے کسی تصادم کا شکار کیوں نہیں ہوئے۔ اس کا سبب اگر ایک طرف مولانا آزاد کے وہ طنز کے تیر تھے جوان کی تحریروں اور تقریروں میں کبھی براہ راست اور کبھی بلاواسطہ علی گڑھ پر گرتے تھے۔ دوسرا سبب ان کا وہ 'انانیتی ادعا' تھا جو صرف اپنی برتری کو منوانا چاہتا تھا وہ علی گڑھ کے لیے ناقابل قبول تھا۔ ان حالات میں ذہنی تصادم کا ہونا ناگزیر تھا۔ مگر اس کا اعتراف کرنا بھی ضروری ہے کہ مولانا کی عظمت یہ تھی کہ وہ جب وزیر تعلیم ہوئے تو علی گڑھ پر ہر ہونے والے وار کے سامنے سپر بن گئے۔

مولانا آزاد کی پیدائش ۱۸۸۸ء میں ہوئی۔ والد نے تاریخی نام فیروز بخت تجویز کیا۔ ناموں کی نسبت اگر انسان کی شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہے تو واقعی وہ فیروز بخت ثابت ہوئے۔ اس نام کے بارے میں مولانا آزاد کا خیال تھا۔

> "ساری فیروز بختی و جواں طالعی کا معاملہ آج نہیں، کل فیصل ہونے والا ہے۔ اصل فیروز مندی وہاں کی فیروز مندی ہے اور جواں بخت وہی ہے جو اس آنے والے دن کی آزمائش میں پورا اترے اگر وہاں روح و ریحاں و جنت نعیم اور فوز عظیم کی فیروزی و کامرانی ہاتھ آئی تو پھر بخت بختِ ارجمند ہے طالع طالع بلند ہے۔"

مولانا آزاد کا بیان ہے کہ

> "آبائی وطن دہلی مرحوم ہے مگر وطن مادری سرزمین مطہر طیبہ، دارالہجرۃ سید الکونین و شہرستان نبوت و وحی ہے۔ قبلۂ عبادت گزارانِ عشق و کعبہ نیازمندانِ شوق۔"

مولانا نے اپنا آبائی وطن دہلی بتایا ہے اور مہادیو ڈیسائی کا بیان ہے کہ مولانا ۱۸۸۸ء میں مکہ میں پیدا ہوئے اور دس سال وہاں رہے۔ مگر مولانا ماہر القادری کو اس بیان میں شبہ ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

> "دہلی سے نسبت اس وقت تھی جب ان کے والد دہلی میں رہتے تھے اور غدر میں ترک سکونت کی اور مولانا آزاد اس وقت مستقل رہے جب وزارت پر فائز تھے.....
> مولانا آزاد کی جب شہرت ہوئی تو کھیم کرن کے باشندے کہتے تھے کہ ہماری بستی کے عمرو بن کے پوتے نے اتنا نام پیدا کیا ہے۔"

حقیقت کیا ہے؟ یہ کام محققین ادب کے لیے چھوڑتا ہوں اور جب تک کوئی مضبوط شہادت نہ مل جائے

اس وقت تک مولانا آزاد اور ڈیسائی کے بیان کی تردید ممکن نہیں ہے۔

مولانا آزاد نے بچپن سے جوانی تک کا زمانہ دنیا کی رغبتوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے علم حاصل کرنے میں گذارا۔ مولانا کا خود بیان ہے کہ "لوگ لڑکپن کا زمانہ کھیل کود میں بسر کرتے ہیں مگر بارہ تیرہ برس کی عمر میں میرا یہ حال تھا کہ کتاب لے کر کسی گوشہ میں جا بیٹھتا۔ علم کا شوق اس پر حافظ قدرت نے بے پناہ دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میری تعلیم خاندان کے موروثی عقائد کے خلاف نہ تھی کہ اس راہ سے کوئی کش مکش ہوتی۔ تعلیم نے انھیں او زبیر کرنا چاہا اور گرد و پیش نے انھیں اور سہارا دینا چاہا۔ تاہم یہ کیا بات ہے کہ شک کا سب سے پہلا کانٹا جو خود بخود دل میں چبھا وہ اسی تقلید کے خلاف تھا۔ اعتقاد کی بنیاد علم و نظر ہونا چاہیے۔ تقلید و توارث پر کیوں ہو۔ یہ گویا دیوار کی بنیادی اینٹوں کا ہل جانا تھا۔ شک کی یہی چبھن تھی جو تمام آنے والے یقینوں کے لیے دلیل راہ بنی۔ اس کی رہنمائی تھی جس نے یقین اور طمانیت کی منزل مقصود تک پہونچا دیا۔" لڑکپن سے جوانی تک جس شخص کا رجحان اس نوعیت کا ہو اس کے مزاج کی افتاد کے بارے میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مولانا آزاد کی روداد زندگی خود ان کی زبان سے سنئے۔

> "اپنی سرگزشت اور روئداد عمر لکھوں تو کیا لکھوں۔ ایک نمود حباب اور جلوۂ سراب کی تاریخ قلم بند ہو تو کیوں کر ہو؟ دریا میں حباب تیرتے ہیں، ہوا میں غبار اڑتے ہیں، طوفان نے درخت گرا دیئے، سیلاب نے عمارتیں بہا دیں۔ عنکبوت نے اپنی پوری زندگی تعمیر میں بسر کر دی۔ مرغ آشیاں پرست نے کونے کونے سے چن کر تنکے جمع کئے۔ خرمن و برق کا معاملہ، آتش و خس کا افسانہ، ان کی سرگزشتیں لکھی جا سکتی ہیں تو لکھ لیجئے۔ میری سوانح عمری بھی انہی میں مل جائے گی۔ نصف افسانہ امید اور نصف ماتم میں۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا آزاد نے زندگی اسی امید و بیم کے درمیان گذار دی۔ مولانا نے چاہا کچھ اور کرنا کچھ پڑا۔ خواب کچھ دیکھا تھا اس کی تعبیر مختلف نکلی۔ آزادی ملی تو خون آلودہ، خود ان کی سیاسی زندگی ہمیشہ مابہ النزاع رہی۔ مولانا آزاد کا یہ جملہ جس کا حوالہ گذشتہ سطور میں آچکا ہے کہ شک کی یہی چبھن تھی جو تمام آنے والے یقینوں کے دلیل راہ بنی، مولانا نے ہمیشہ اپنی انا کی تسکین کے

کے لیے دوسروں کے یقین کو شک اور اپنے شک کو یقین کا درجہ دیا۔

تعلیم سے لے کر سیاست میں داخل ہونے تک کی کہانی طویل ہے۔ اس کے لیے اس عہد کے ہندوستان کے نقشے پر نظر ڈالنا ہوگی۔ جہاں مختلف تحریکیں ابھر ابھر کر مٹ رہی تھیں اور مٹ مٹ کر ابھر رہی تھیں۔ اس عہد کی تمام تحریکیں اپنے مختلف راستوں سے آزادی کی منزل تک پہونچنا چاہتی تھیں مگر ان سب کے نظریات میں اتنے اختلافات تھے کہ ان کا ایک پلیٹ فارم پر یک جا ہونا ممکن نہ تھا مولانا کے لئے یہ لمحۂ فکریہ تھا کہ وہ کس کارواں کے شریک سفر رہیں اور ان کا فیصلہ کانگریس کے حق میں ہوا اور یہ بات قابل غور ہے کہ آزاد نے جس جماعت کو اپنایا اس سے اپنی وابستگی آخری وقت تک رکھی۔ یہ مولانا کی مستقل مزاجی کی نمایاں مثال ہے، اس راہ میں قید و بند کی سختیاں سہیں ظلم و ستم کا نشانہ بنے۔ غیروں نے ہدف بنایا، اپنوں نے ملامت کی مگر جس بات کا ارادہ کر لیا اس سے گریز ممکن نہ تھا۔ سیرت کی یہی فضیلت ہے جس نے آزاد کی گردن کو خم نہ ہونے دیا ع

ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغ ندامت

مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ ان کی زندگی کھلی کتاب ہے مگر اس کھلی کتاب پر عقیدت کے اس قدر پھول پڑے ہوئے ہیں کہ الفاظ کے معنی تلاش کرنے میں قاری کو زحمت ہوتی ہے۔ اس میں مولانا کا قصور کم ان کے، ناآشنا و ناشناس مداحین کا زیادہ ہے۔ اس کے باوجود اس کتاب زندگی کے بعض عنوانات ایسے نظر آتے ہیں جن سے مولانا کی سیرت کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑتی ہے مثلاً ان کا جمالیاتی ذوق۔ استقامت رائے، مستقل مزاجی۔ مسلک سے وفاداری۔ انانیت خطابت۔ علم کی گہرائی اور گیرائی وغیرہ۔ انانیت کے بارے میں کسی نے کہا ہے کہ وہ جب ذاتی اغراض سے وابستہ ہو تو ابلیس بن جاتی ہے اور اپنی ذات سے الگ ہو کر اس کا اظہار ہو تو پیغمبرانہ شان پیدا ہو جاتی ہے۔ مولانا آزاد کے نظریات سے اختلاف کرنے والا کوئی آدمی اس بات کا انکار نہیں کر سکتا کہ انھوں نے اپنی انا کو عونت اور غرور کے حوالے کیا ہو۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ سیاست ہو یا ادب۔ مذہب ہو یا معاشرت ان کے یہاں مفاہمت نام کی کوئی چیز نہیں ملتی جس کا نتیجہ وہی ہوا جو ان حالات میں ہوا کرتا ہے یعنی ان کے نقطہ نظر کے سمجھنے والے خود ان کی پارٹی میں چند ایک کے سوا کوئی نہ تھا جن کی بنا پر جواہر لال کو کہنا پڑا کہ "وہ ہندوستانی عوام کے انبوہ کثیر میں یکہ و تنہا حیثیت کے مالک ہے"

عزم اور بے باکی کے ساتھ بات کو پیش کر دینا مولانا کی شخصیت کا وہ پہلو ہے جس کا خود ان کو بھی اندازہ تھا۔ ایک دوست کو دلچسپ انداز میں نصیحت کرتے ہیں "۔ استقامت اصل کار ہے اگر ایک آدمی فوج کی نوکری قبول نہیں کرتا تو کوئی جرم نہیں ہے لیکن اگر سپاہی بن کر اور میدان جنگ میں آکر پیچھے ہٹتا ہے تو اس کی سزا موت ہے "۔ مولانا آزاد کی زندگی میں کوئی لمحہ ایسا نظر نہیں آتا جب انھوں نے اپنے بنائے ہوئے ضوابط کو توڑنے کی کوشش کی ہو ۔ کتنا صبر آزما وقت تھا جب جیل میں بیوی کی علالت کی خبر ملتی ہے ۔ حکومت مصلحت وقت کی بنا پر تیار ہے کہ مولانا اگر درخواست دیں تو بیوی سے ملنے کی اجازت دی جا سکتی ہے ۔ مگر اس آزمائشی وقت میں ان کو یاد آجاتا ہے کہ دریا میں اترنے سے پہلے سب کچھ سوچ لینا چاہئے لیکن اترنے کے بعد موجوں کا شکوہ فضول ہے "۔ اور جب ان کو بیوی کے مرنے کی خبر ملتی ہے تو یہ مصرعہ زبان پر آجاتا ہے ۔ ع

شاخ بریدہ را نظرے بر بہار نیست

ابھی وہ لوگ زندہ ہیں جنھوں نے الہلال کا زمانہ دیکھا ہے ۔ سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں " الہلال ایک سیاسی بین الاسلامی تحریک سمجھی جاتی تھی ۔ صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ تمام بلاد اسلامیہ الہلال کے اثر میں آچکا تھا۔ الہلال کی بدولت جو حلقہ مولانا آزاد کے گرد جمع ہو گیا تھا وہ خود ایک مرکز تھا۔ نظام شمسی کے گرد جو ستارے تھے ان میں سے ہر ایک خود ایک نظام شمسی کا مالک تھا۔ میری مراد سید سلیمان ندوی ۔ عبداللہ عمادی ۔ عبدالسلام ندوی ۔ عبدالرزاق ملیح آبادی اور خواجہ عبدالواحد وغیرہ سے ہے ۔ ایک خط میں سید سلیمان ندوی نے اعتراف کیا ہے کہ "ہم لوگ کوشش کرتے تھے کہ تحریر میں ابو الکلام صاحب کے طرز تحریر کا اتباع کریں ۔ اس لیے الہلال میں جو کچھ لکھا جاتا تھا وہ اسی رنگ میں لکھا جاتا تھا ۱۹۱۲ء میں مولانا نے الہلال نکالا اور ۱۹۱۳ء البلاغ نکلنا شروع ہوا۔ یہ دونوں ایک نئی تحریک کی آواز بن کر چھا گئے ۔ اُردو صحافت نے ایک نیا مزاج اختیار کیا۔ یہ ایک طرف آزادی کے متوالوں کا نقیب تھا تو دوسری طرف سماجی اور مذہبی بے راہ روی کے خلاف ایک محاذ کا کام انجام دے رہا تھا۔ یہ الہلال کا اثر تھا کہ آئندہ صحافت نے اس کو اپنے لیے معیار قرار دیا۔ قصۂ قدیم و جدید کو اقبال نے یہ کہہ کر ختم کیا تھا۔

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک ؎ دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

یہی نصب العین نثر میں مولانا آزاد کی آواز بن گیا۔

"علم و نظر کی راہوں میں آج کل قدیم و جدید کی تقسیمیں کی جاتی ہیں۔ لیکن میرے لیے یہ تقسیمیں بھی کوئی تقسیم نہیں۔ جو کچھ قدیم ہے وہ مجھے ورثہ میں ملا ہے اور جو کچھ جدید ہے اس کے لیے میں نے اپنی راہیں خود نکال لیں۔ میرے لیے وقت کی جدید راہیں بھی ویسی ہی دیکھی بھالی ہیں جس قدر قدیم راہوں میں گام فرسائی کرتا ہوں۔"

مولانا آزاد کا اسلوب ان کی شخصیت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بقول رشید احمد صدیقی

"مولانا پہلے اور آخری شخص تھے جنھوں نے براہ راست قرآن کو اپنے اسلوب کا سرچشمہ بنایا۔"

یہی سبب ہے کہ مولانا آزاد کے اسلوب میں محض خطابت کا انداز نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک مفکر کا دماغ بھی ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خطابت صرف اپنے پاؤں پر چلتی ہے اس میں علمیت کی تلاش بے معنی ہے مگر شاید اس سرچشمہ کا طفیل ہے کہ خطابت نے سطحیت کا رنگ اختیار نہیں کیا۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے ورنہ اسلوب کے تنوع سے بحث کی جا سکتی تھی۔ ہر موضوع کے ساتھ ان کے اسلوب کا رنگ جداگانہ ملے گا۔ اسی لیے اکثر یہ سوال اٹھتا ہے کہ خود مولانا کو اگر تلاش کرنا ہے تو ان کو کس تصنیف میں دیکھا جائے۔ رشید صاحب نے بجا طور پر لکھا ہے۔

"مولانا کے یہاں انشا پردازی کے ایک سے زیادہ اسالیب ملتے ہیں۔ الہلال میں دعوت دار و رسن ہے۔ تذکرہ میں دعوت دید و شنید۔ غبار خاطر میں دعوت نوش و نشنید۔ تفسیر قرآن کا لب و لہجہ علمی اور عالمانہ ہے۔"

میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ مولانا کی شخصیت اور ادب میں سب سے متاثر کرنے والا پہلو کون سا ہے۔ البتہ ایک چیز نے مجھے بار بار اپنی طرف متوجہ کیا ہے وہ ان کا جمالیاتی انداز نظر ہے۔ اسی جمالیاتی ذوق کا اثر ہے کہ انھوں نے کبھی خوب سے خوب تر کی تلاش کو ترک نہیں کیا۔ ان کے اس ذوق جمال کا اظہار کبھی ان کی نرم و سبک طرز تحریر میں ہوتا ہے اور کبھی ان کی گھن گرج میں نظر آتا ہے۔ انھوں نے اگرچہ شاعری بھی کی مگر اس کوچہ سے نکل گئے۔ انھوں نے نثر کو اپنی شاعری کا ذریعہ بنایا اور اس میں منفرد حیثیت اختیار کر لی۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ انھوں نے جس قسم کی زندگی کو اپنے لئے منتخب کیا تھا اس کے لئے نثر کا میدان بھی مناسب تھا ان کے جمالیاتی

ذوق کی تسکین ان کے نثر پاروں میں پوری طرح نمایاں ہے۔ وہ الہلال کے ولولہ خیز اداریے ہوں یا غبار خاطر کے خطوط یا ترجمان القرآن کا پیرایۂ بیان، ہر میدان میں ان کا سکہ رائج رہا۔ جمالیاتی تصور جلال میں بھی ہوتا ہے اور درد کی اس کسک میں بھی جو سل کو دل بنا دیتا ہے بقول سید محمد عبداللہ۔

"ابوالکلام کا اصل مواد عشق و جنوں کی شورشوں سے ڈہالا گیا ہے عشق مجاز سے لے کر عشق مقاصد تک جتنی منزلیں بھی انھوں نے طے کی ہیں وہ اسی جذبہ کے جلوۂ صد رنگ تھے:"

شبلی کے بعد مولانا آزاد وہ واحد ادیب ہیں جن کی کسی تصنیف کے صفحہ کو اٹھا کر دیکھئے ان کے جمالیاتی ذوق کی تصویر سامنے آجائے گی مگر ادب کا یہ المیہ ہے کہ وہ شخص جس کو، بین الاقوامی لٹریری اکیڈمی، کی سربراہی کا منصب ملنا چاہئے تھا جہاں اس کے فن کی داد ملتی یا مسلمانوں کی تہذیبی اور تنظیمی اقدار کی رہنمائی کرتے مگر انھوں نے اپنے لیے سیاست کا میدان منتخب کیا جہاں انسان کھونا سب کچھ ہے مگر ملتا کچھ بھی نہیں ہے۔ آخر میں رشید احمد صدیقی کے اس اقتباس پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

"قطع نظر اس کے کہ مولانا حکومت سے کس درجہ وابستہ ہو گئے تھے اس سے باہر نکل سکتے بھی تھے یا نہیں یا ان کی صحت اس کی یہاں تک متحمل ہوتی۔ کبھی کبھی یہ بات ذہن میں آتی ہے۔ کاش وہ حکومت کے محدود اور گلو افشار حلقے سے باہر نکل کر ہندی جمہوریہ ہند میں مسلمانوں کو وہ مشکل لیکن مہتم بالشان مقام دلا سکتے جو مسلمانوں کا حق بھی ہے اور ذمہ داری بھی۔ جی ایسا کیوں چاہتا ہے؟ شاید اس لیے کہ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی سردار دور دور ایسا نظر نہیں آتا جس کے سپرد ہندوستانی مسلمانوں کی حمایت و ہدایت کی ذمہ داری اعتبار و افتخار کے ساتھ کی جا سکے۔ ع

اللہ رے سناٹا، آواز نہیں آتی"

ختم

علامہ اخلاق حسین دہلوی

مسیح الملک حکیم اجمل خاں

مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں شیدا دہلوی خاندان علم و شرافت کے چشم و چراغ تھے۔ ۱۷ شوال ۱۲۸۴ ہجری (مطابق ۱۱ فروری ۱۸۶۸ عیسوی) کو پیدا ہوئے۔ خاندانی دستور کے مطابق اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کی اور شہرۂ آفاق ہوئے۔

حکیم محمد اجمل خاں حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد پاک نہاد سے تھے ان کے پردادا حکیم محمد شریف خاں آخری عہد مغلیہ میں دہلی آکر آباد ہوئے۔ جو ماہر طبیب اور جید عالم دین تھے ان ہی نے سب سے پہلے کلام اللہ کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جو شائع نہیں ہوا۔ حکیم محمود خاں مرحوم حکیم محمد اجمل خاں کے والد بزرگوار تھے جو نامی طبیب اور اہل قلم تھے کتاب ضیاء الابصار ان کی یادگار ہے جو شائع ہوتی رہی ہے طبابت پیڑھیوں سے حکیم محمد اجمل خاں کے خاندان میں متوارث تھی جو انھیں ورثے میں ملی اور انھوں نے باکمال اور ماہر فن اساتذہ سے استفادہ کیا اور کامل دسترس حاصل کی حتیٰ کہ وہ اپنے عہد کے کامیاب ترین طبیب مانے گئے ریاستوں کے نواب و راجہ اکثر ان ہی کے زیر علاج رہتے تھے۔

حکیم محمد اجمل خاں خوش گو شاعر اور باکمال نثر نگار تھے۔ شیدا تخلص تھا اور جناب ارشد گورگانی سے شرف تلمذ حاصل تھا ان کا دیوان پاکستان میں شائع ہوگیا ہے۔ نثر میں ان کی معروف کتاب حاذق ہے جو طب کے موضوع پر ہے اور مقبول ہے ۱۹۱۷ء (۱۳۳۶ھ) سے اب تک متواتر شائع ہوتی

رہی ہے۔

حکیم محمد اجمل خاں متوسط قد و قامت۔ خوش اندام۔ گندم گوں مائل بہ سفیدی رنگ۔ کشادہ پیشانی بھرے بھرے رخسارے۔ ستواں ناک۔ گنجان بھنویں۔ متوسط دہن۔ بھرواں سیاہ ڈاڑھی نہ بہت لمبی نہ بہت چھوٹی۔ انگلیاں گاؤدم۔ سینہ فراخ۔ وضع قطع دیدہ زیب اور جاذب نظر چہرے پر آثار شرافت نمایاں سنجیدگی اور متانت نور افشاں۔

لباس میں ترکی ٹوپی۔ شیروانی۔ سیدھی موری کا پاجامہ۔ کبھی گورگابی زیب پا کبھی ہلکی سی کامدار سلیم شاہی جوتی۔ کم سخن شیریں کلام بولتے تو موتہ سے پھول جھڑتے۔ ہلکے ہلکے نرم و نازک جملے موتہ سے نکلتے جو دل میں اترتے چلے جاتے۔ تکلف اور تصنع ذرا نہیں جس کسی سے ملتے خندہ پیشانی سے ملتے۔

حکیم محمد اجمل خاں اپنی عمر کی باسٹھویں منزل سے گزر رہے تھے نواب رامپور نواب حامد علی خاں کے مہمان تھے اور ان ہی کے دولت کدے پر مقیم تھے کہ ۲۸۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۲۷ء (۲۳،۲۴ جمادی الآخر ۱۳۴۶ھ) کی درمیانی رات میں انہیں گولی کا نشانہ بنایا اور وہ اللہ کو پیارے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔ اس اطلاع سے ملک بھر میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ اور صف ماتم بچھ گئی۔ تعزیتی جلسے منعقد ہوئے خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ ملکی اور غیر ملکی اخبارات نے کالم کے کالم لکھے مگر یہ بھید نہ کھلا کہ ایسا کیوں ہوا اور کس نے کیا؟ میت کو دہلی لایا گیا نماز جنازہ میں دلی والوں نے بکثرت شرکت کی اور ان کی پشتینی ہڑواڑ درگاہ سید حسن رسولنماؒ (پنچکوئیاں روڈ) نئی دہلی میں دفن کیا گیا۔ حق تعالیٰ مغفرت فرمائے اور مراتب بلند کرے آمین۔

(۲)

حکیم محمد اجمل خاں گوناگوں اوصاف سے مالا مال تھے۔ انہیں قومی و ملی اور ملکی و علمی مشاغل سے گہری وابستگی تھی۔ وہ آزادئ ملک کے دلدادہ اور رہنمایان ملک و قوم میں ممتاز شخصیت کے مالک تھے انڈین نیشنل کانگریس کے معزز رکن تھے۔ صدارت کی خدمات بھی انجام دی تھیں۔ تحریک آزادی کے ابتدائی دور میں ان ہی کا گھر ملکی رہنماؤں کی اقامت گاہ تھا۔ مہاتما گاندھی۔ علی برادران۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ مولانا ابوالکلام آزاد نیز دیگر ممتاز رہنما ان ہی کے مہمان رہتے اور ملاقاتیوں کی آمد و رفت سے میلا سا لگا رہتا تھا۔

حکیم محمد اجمل خاں کو فن طب سے فطری لگاؤ تھا اور وہ اس کی بقا اور اس کے فروغ کے لیے

کوشاں رہتے تھے انھوں نے ۱۹۰۶ء (۱۳۲۴ھ) میں طبی کانفرنس کی تاسیس فرمائی ۱۹۰۸ء (۱۳۲۶ھ) میں حکومت برطانیہ نے ان کی طبی خدمات کے صلے میں انھیں حاذق الملک کے خطاب سے سرفراز کیا جو انھوں نے تحریک ترک موالات کے دوران ۱۹۲۰ء (۱۳۳۹ھ) میں واپس کردیا۔ جس کے فوراً بعد قوم نے انھیں مسیح الملک کے معزز خطاب سے نوازا۔ جو آخر دم تک ان کے نام کا جزو رہا اور اب تک ہے۔

انھوں نے ۱۹۱۶ء میں ویدک یونانی طبیہ کالج کا سنگ بنیاد رکھا۔ جس سے ویدک اور یونانی طب کے قالب بے جان میں جان پڑی انھوں نے اسی مقصد سے دوبار یورپ کا سفر کیا اور کالج کے مصارف کے لیے ایک عالیشان دواخانہ قائم کیا جس کا نام ہندوستانی دواخانہ دہلی ہے۔ اور اس کی آمدنی کالج کے لیے وقف فرمائی۔ یہ ویدک یونانی طبیہ کالج ان کی عظیم یادگار ہے جو عظیم ہندوستان کی واحد وبے مثل اور مایۂ ناز طبی درس گاہ ہے۔ جس سے رہتی دنیا تک ان کا نام زندہ و تابندہ رہے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

حکیم محمد اجمل خاں کو قومی و ملی کاموں سے جو غیر معمولی دلچسپی تھی اسی کی بنا پر وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی جیسے کتنے ہی قومی اداروں کے سرپرست اور سربراہ تھے وہ رضا لائبریری رامپور سے بھی وابستہ تھے جہاں نادر مخطوطات کا انمول ذخیرہ ہے۔ اور وہ ان اداروں کی ممکن معاونت فرماتے تھے۔

انسان دوستی اور انسانی ہمدردی ان کا فطری جوہر تھا جو ہمہ وقت جگمگاتا رہتا تھا لیکن موقع محل سے اس کی تابندگی آنکھوں کو خیرہ کردیا کرتی تھی۔ دہلی میں جب کبھی وبا پھیلتی۔ اموات کی کثرت ہوتی اور گھر کے گھر بے چراغ ہوتے نظر آتے تو وہ اپنے مجوزہ نسخے کی بہت سی پڑیاں بندھواتے اپنی گاڑی میں رکھواتے۔ گھر گھر جاتے مریضوں کو دیکھتے اور انھیں دے آتے۔ اللہ پاک نے ان کے ہاتھ میں شفا بھی دی تھی۔ بیمار صحت یاب ہوجاتے تھے۔ ان کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ وہ دہلی میں کسی مریض کو اس کے گھر دیکھنے جاتے تو نذرانہ قبول نہ فرماتے۔ یہی روش رامپور میں تھی ممکن ہے کہ کہیں اور بھی ہو۔ تاہم ان کی یہ ہمدردیاں ایسی تھیں کہ دلی والے انھیں دل سے چاہتے تھے۔

والد مرحوم یہ واقعہ بھی بیان فرماتے تھے کہ سردی کا موسم۔ کڑاکے جاڑا۔ رات کا وقت۔ بارہ ایک کا عمل۔ بازاروں میں سناٹا۔ وہ کسی تقریب میں شریک ہوکر آرہے تھے۔ جامع مسجد پہنچے تو دیکھا کہ ہلکے ہلکے بگھی آئی اور جنوبی دروازے کی سیڑھیوں کے پاس ٹھہر گئی۔ حکیم محمد اجمل خاں نکلے سیڑھیوں پر جو سکڑے

سکڑا ے پڑے تھے گاڑی میں سے لحاف نکالتے اور ہر ایک کو آہستہ سے اڑھا دیتے ۔ جب سب ہی کو اڑھا چکے تو گاڑی ہلکے ہلکے ہرے بھرے صاحبؒ کے مزار کی طرف چلی گئی ۔ وہ آبدیدہ ہوکر فرماتے عجب خیر کا بندہ ہے حق تعالیٰ اجر عظیم عطا فرمائے ۔

ترک موالات کی تحریک عروج پر تھی ۔ ملک بھر میں قومی رہنما گرفتار کیے جا رہے تھے ۔ میں نعمانیہ پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا جو بلیماران میں حکیم محمد اجمل خاں کے مکان کے قریب ہی تھا ۔ دوپہر کو چھٹی ہوئی مدرسے سے باہر آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بازار آدمیوں سے بھرا پڑا ہے ۔ بڑی مشکل سے چند قدم چلے دم گھٹنے لگا تو مسجد حکیم محمد شریف خاں میں چڑھ گئے اور وہاں سے یہ منظر دیکھتے رہے کہ ہر کوئی جس حلیئے میں ہے دوڑتا چلا آرہا ہے ۔ خالی ہاتھ کوئی بھی نہیں ہے ۔ لکڑی لاٹھی ۔ بانس ۔ پلنگ کا پایہ ۔ سیروا ۔ پٹی ۔ ادھ جلی چولہے کی لکڑی لیے چھوڑو چھوڑو کا نعرہ لگاتا بھیڑ میں گھسا چلا جاتا ہے ۔ مسجد میں کچھ اور اشخاص بھی آگئے تھے ۔ ان کی باتوں سے پتہ چلا کہ علی الصبح دلی کے انگریز چیف کمشنر نے حکیم صاحب کو دلی کے ٹاؤن ہال میں بلایا اور وہ ابھی واپس نہیں آئے ۔ شہر میں یہ خبر پھیل گئی کہ حکیم صاحب کو بھی گرفتار کرلیا ہے اس خبر وحشت اثر سے سارا شہر امنڈ پڑا ہے ۔ کمپنی باغ کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے ۔ چاندنی چوک میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہے چاندنی چوک کو آنے والے سارے راستے آدمیوں کی بھیڑ سے بند پڑے ہیں ۔ پولس روک تھام کر رہی ہے مگر کوئی ٹس سے مس بھی نہیں ہوتا ۔ آخر کار جب حکیم صاحب آتے نظر آئے تو ان متوالوں کی جان میں جان آئی اور بھیڑ چھٹنے لگی ۔ جب چھٹ گئی تو ہم بھی کوئی دو گھنٹے بعد مسجد سے اترے اور گھر گئے ۔ رہنمایان قوم کی گرفتاریاں تو عمل میں آتی ہی رہتی تھیں لیکن یہ منظر کبھی دیکھنے میں آیا نہ سننے میں ۔ یہ کیا تھا ؟ یہ تھا دراصل حکیم محمدؐ اجمل خاں کی اس فطری مخلصانہ ہمدردی کا ثمرہ جو ان کی خلقت میں مرکوز تھی ۔ جو آج بھی سبق آموز ہے ۔ اللہ پاک ہم سب ہی کو یہ توفیق عطا فرمائے ۔ آمین ۔

مد

حاجی انیس دہلوی
ایڈیٹر فلمی ستارے

سبحان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلوی

حضرت داغ دہلوی نے کیا خوب کہا ہے

فغاں ہیں آہ ہیں فریادیں شیون ہیں نالے ہیں،
سناؤں درد دل طاقت ہو اگر سننے والے ہیں

آج کا دہلی شہر جو کبھی شاہجہاں آباد، کہلاتا تھا۔ اب دُور دُور تک پھیل گیا ہے۔ ہر جگہ انسانوں کا ہجوم نظر آتا ہے۔ لیکن انسان دوستی کی وہ صورتیں اب کہاں — ؟ جن کے دم سے دِلّی کی روایتی تہذیب، مہمان نوازی، اور غرباء پروری کا شہرہ تھا۔ ان ہی میں سبحان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلوی بھی تھے، جنھوں نے مرتے دم تک دہلوی تہذیب کو زندہ سلامت رکھا۔ مولانا احمد سعید ۱۸۸۲ء میں دِلّی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حافظ محمد نواب مرزا تھا۔ جن کا انتقال ۱۹۰۸ء میں ہوا۔ اور اپنے آبائی قبرستان چونسٹھ کھمبے میں دفن ہوئے۔ مولانا کے بہت سے عزیز قبرستان مہندیان میں بھی دفن ہیں۔ مہندیان کا ابتدائی بڑا دروازہ مولانا کے نام سے ہی منسوب ہے۔

سن پیدائش کا صحیح تعین مولانا کی زندگی میں بھی نہیں ہو سکا۔ مولانا نے ملا واحدی کو ایک خط میں اپنی سن پیدائش کے بارے میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"میں نے اپنی ولادت کا حساب ۱۸۸۲ء لگایا تھا، میونسپلٹی کا ریکارڈ پچھلے ہنگاموں میں تلف

ہو چکا ہے۔ اس لیے باضابطہ کوئی ثبوت میرے پاس نہ تھا۔ البتہ مدار کا چاند یعنی جمادی الاول مجھے یاد تھا، اور یہ بھی یاد تھا، کہ قاضی لطیف الحق حقی اور میں ایک مہینے میں پیدا ہوئے ہیں۔ بالآخر میں نے ۱۸۸۸ء پر پختہ رائے کرلی، اور مظہر اللہ، تاریخی نام بھی نکالکر بیٹھ گیا ہوں۔ لیکن آپ کے خط نے مجھے پھر شک میں ڈالدیا۔"

مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی، پھر کئی عربی مدارس اور علمائے کرام سے درس حاصل کیا، جن میں مولانا راسخ دہلوی کا نام بھی شامل ہے۔ آخر میں علوم دینیہ کی باقاعدہ تکمیل حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ کی نگرانی میں مدرسہ امینیہ دہلی میں پوری کی۔

آپ کے بزرگ کشمیر سے ہجرت کرکے دلی آئے تھے، مولانا بتایا کرتے تھے کہ ہم لوگ کشمیری کٹرے کے رہنے والے تھے، جہاں اِن دنوں پتھر والا کنواں اور لاجپت رائے مارکیٹ ہے،

مولانا واصف دہلوی کا کہنا ہے،" کہ میری تحقیق کے مطابق کشمیری کٹرہ فیض گنج دریا گنج میں اکبر آبادی بیگم کی مسجد کے پاس تھا، جسے مرزا غالب نے کشمیری کٹرے کی مسجد لکھا ہے، جس میں شاہ عبدالقادرؒ نے قرآن مجید کا ترجمہ لکھا تھا اور اسی مسجد میں رہتے تھے۔ مسجد کی تصویر آثار الصنادید میں موجود ہے، مسجد تو اب نہیں، صرف تصویر رہ گئی ہے، غالباً یہ مسجد بھنڈاری کے پاس چوک میں تھی، جہاں اب بھی کچھ کشمیری خاندان آباد ہیں۔"

مولانا احمد سعید دلی کے اس تاریخی کوچے میں رہتے تھے، جس سے ہندوستان کی ایک تاریخ وابستہ ہے، کوچہ چیلان دلی کی ممتاز شخصیتوں کی قیام گاہ رہا ہے، جن میں حکیم مومن دہلوی، خواجہ میر درد، علی برادران، مفتی کفایت اللہ، بیرسٹر آصف علی، اور ملا واحدی کے نام قابل ذکر ہیں۔ مولانا کے ہاں آٹھ اولادیں ہوئیں۔ چار لڑکے اور چار لڑکیاں۔

لڑکوں میں محمد سعید، مظہر سعید، محمود سعید، اور حامد سعید تھے، بڑے لڑکے حافظ مولوی محمد سعید کا انتقال ۱۵ دسمبر ۱۹۶۵ء کو ہوا، اور دوسرے لڑکے مظہر سعید بھی ۱۹ جنوری ۱۹۶۸ء کو انتقال فرما گئے دونوں لڑکے اپنے والد کے قریب ہی دفن ہیں۔

چار لڑکیوں میں سعیدہ بیگم، مسعودہ بیگم، محمودہ بیگم اور فہیمدہ بیگم ہیں، جن میں سعیدہ بیگم ۱۱ جنوری ۱۹۸۲ء کو اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں۔ مولانا کی اہلیہ محترمہ کا انتقال مولانا کی وفات کے ٹھیک سترہ سال

بعد ۲ر دسمبر ۱۹۷۶ء کے دن ہوا۔

مولانا کی شخصیت بے حد جاذب نظر تھی، سُنا ہے جوانی میں اُن کے حسن کا سارے شہر میں چرچا تھا، بحیثیت واعظ وہ مردوں سے زیادہ عورتوں میں مقبول تھے، کہتے ہیں مولانا حسن پرست بھی تھے حُسن و خوب صورتی دیکھ کر اس کی تعریف بھی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا رملا واحدی کو اپنے ایک خط میں یوں تحریر فرماتے ہیں ــــ

"آج کا دستور ہے، کہ محبوب اور مطلوب کو چھریاں دکھا کر رام کرتے ہیں، پناہ بخدا، یہاں تو برسوں خوشامد کرتے گذر جاتی ہے، جب کہیں جا کر کامیابی نصیب ہوتی ہے، کہیں نہیں بھی ہوتی ہے، لیکن جو کامیابی میسر ہوتی ہے، وہ پُر لطف اور پر سرور ہوتی ہے۔"

مولانا کا قلمی چہرہ کچھ اس طرح تھا ــــ سرخ و سفید رنگ، دمکتا ہوا چہرہ، بلند و بالا قد، چوڑا چکلا جسم، لمبے لمبے ہاتھ جو چلتے وقت آگے کم اور پیچھے زیادہ جھولتے تھے، بڑی بڑی چمکدار آنکھیں جس میں دلی کی تہذیب اور اس کے عروج و زوال کی بے شمار جھلکیاں پنہاں تھیں، پتلے پتلے یاقوتی ہونٹ، اونچی ناک، پیشانی پر علم و صداقت کا روشن آفتاب، ناتراشیدہ سفید بھروان داڑھی، جس پر کبھی کبھی پان کے سرخ قطرے شبنم کی طرح رقصاں نظر آتے، انداز گفتگو نہایت نرم و شیریں، کبھی کبھی دوران گفتگو مصنوعی دانتوں سے ہوا نکل جاتی اور بتّیسی باہر آگرتی۔ ـــ بدن پر بنیان یا بنڈی، اس پر لمبا کرتہ، اور ایک ڈھیلی ڈھالی واسکٹ، موسم سرما میں روئی کی دو صدریاں، ایک آدھی آستین کی ایک پوری آستین کی گھٹنوں تک زیب تن کرتے، گھر میں سلا ہوا تہمد، باہر جانا ہو تو چوڑی موری کا پاجامہ، پیر میں موزے بغیر بند کا جوتا یا سلیم شاہی جوتی، عربی چغے کے ساتھ سر پر دو پلی ٹوپی کے اوپر عربی رومال اس انداز سے بندھا ہوتا کہ دیکھ کر عرب مجاہدوں کی جلالت آنکھوں کے رو برو رقصاں ہو جاتی۔

مولانا کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے خوبیوں سے نوازا تھا۔ آپ حافظ قرآن تھے، عالم و فاضل تھے، مفسر قرآن تھے، زیارت بیت اللہ شریف سے بار بار فیضیاب ہوئے، صوفی منش ارباب تصوف کے قدردان، اہل فقر سے ایسی محبت کہ اپنے آپ کو فقیر لکھنا باعث فخر سمجھتے تھے، ادیب، سخن داں و سخن شناس، نازک خیال شاعر، دلی مرحوم کی ٹکسالی زبان کے ماہر، واعظ فرماتے تو روزمرہ اور

اور محاورے کا مزا آجاتا۔

نثر نگاری میں یکتا، موقع محل اور مخاطب کے فہم و شعور کے مطابق جچی تلی بات کہنا، اپنے دل کی بات دلوں پر نقش کر دیتے تھے، "میری طرح" میاں ـــــ اور ـــــ بھائی کہہ کہہ کر مخاطب کرتے، دلی کی تاریخی شائستگی اور تہذیب کے امین، غرضیکہ مولانا اپنی ذات میں ایک انجمن تھے ـــــ

مولانا شاعر بھی تھے اور اسیر تخلص فرماتے تھے، غالباً یہ تخلص مولانا کے زمانہ اسیری کی یادگار ہے شعر گوئی کے ساتھ حضرت مولانا کو شعر فہمی کا بھی خاص ملکہ تھا، چنانچہ جب کوئی شاعر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا، اور اپنا کلام سناتا تو پورے انہماک کے ساتھ اُسے سنتے اور داد سے بھی نوازتے، مستند اساتذہ کے بے شمار اشعار آپ کو یاد تھے، اکثر برمحل اور برجستہ انہیں پڑھ دیا کرتے تھے۔

ایک دن ایک صاحب بہادر سے ملنے گئے، صاحب نے بڑا انتظار کرایا، مولانا اپنے احباب سے باتیں کرتے اور انتظار فرماتے رہے، اور جب ملاقات ہوئی تو بے ساختہ یہ شعر پڑھا ـــــ

ان ہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات ان کی

اُن ہی کی محفل سنوارتا ہوں، چراغ میرا ہے، رات اُن کی

یہاں مولانائے مرحوم کے تعلق سے میں ایک واقعہ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس سے ان کی مہذبانہ روش کا اظہار ہوتا ہے، نیز یہ بھی ظاہر ہوتا ہے، کہ ان کے دل میں بزرگوں کے لیے کس قدر احترام تھا، اور بزرگ بھی ان کی سخن فہمی سے کس قدر متاثر تھے،

۱۹۱۰ء میں جب مولانا احمد سعید مدرسہ امینیہ میں زیر تعلیم تھے، طالب علموں کی جماعت "اصلاح الکلام" کی جانب سے باڑہ ہندوراؤ میں ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں نواب سائل دہلوی کا رسمی تعارف مولانا نے کراتے ہوئے کہا ـــــ

"شاہی زمانہ ہوتا تو نواب صاحب جیسے قادر الکلام اور فصیح و بلیغ شعراء کو خلعت ملتے، انعامات سے نوازے جاتے، ہم غریب طالب علم آپ کو سوائے دعا کے اور کیا دے سکتے ہیں"۔

نواب صاحب نے شعر سنانے شروع کیے، نواب صاحب کا رُخ مجمع کی طرف تھا، مولانا احمد سعید اسٹیج پر ہی بیٹھے تھے اور نواب صاحب کے ہر شعر پر انتہائی جوش و خروش سے داد دے رہے تھے،

ان کا یہ عالم دیکھ کر نواب سائل نے مجمع کی طرف رخ موڑا، اور پوری طرح مولانا سے مخاطب ہو گئے، پنڈال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، مجمع سے آوازیں آنے لگیں، نواب صاحب ..... نواب صاحب ادھر بھی .....! مجمع چیختے چیختے تھک گیا، مگر نواب صاحب نے اُدھر کا رُخ نہیں کیا۔

شعر و شاعری کا ذوق مولانا کو دورِ اسیری میں بھی جاری رہا۔

مولانا کو شعری و ادبی محافل اور مشاعروں سے خاص رغبت تھی، یہ اس زمانے کی بات ہے جب مشاعروں کی تہذیبی روایات بڑی حد تک زندہ تھیں اور ان کی زندگی اور بقاء کے لیے اربابِ علم و فن ہر طرح کوشاں تھے، اسی سلسلے میں مولانا کی اس کوشش اور خواہش کا ذکر کیا جانا ضروری ہے، جس کے تحت ہندوستان کی تاریخی عمارت لال قلعہ میں ۱۹۵۲ء میں یوم جمہوریہ کے مشاعرے کا آغاز ہوا۔ مولانا کی اس کوشش کے پس پشت یہ جذبہ بھی شامل تھا کہ اس طرح اہل دلی بہادر شاہ ظفر کی شعری عظمتوں کو بھی یاد کرتے رہیں،

لال قلعہ کا مشاعرہ بے حد اہتمام سے منعقد کیا گیا، صدر مشاعرہ مولانا ہی تھے، اس مشاعرے میں جوش ملیح آبادی نے حسب عادت ایسا کلام سنایا جس میں علمائے دین اور حور و غلمان کا مذاق اڑایا گیا تھا مشاعرے میں پنڈت نہرو کے علاوہ استاد بے خود دہلوی، بسمل شاہجہاں پوری، گوپال متل کے علاوہ دیگر اکابر شعرا بھی موجود تھے۔ کسی کو بھی جوش صاحب کی یہ جرأت پسند نہیں آئی، سب نے احتجاج کیا، استاد بے خود نے جوش کا کلام سن کر دِلی کی زبان میں دو چار گالیاں دیں، اور فرمایا

بے خود نہ سمجھ خوب سمجھتا ہوں تجھے شمع میرے ہی جلانے کو تو ٹھنڈی کر دی

پھر ایک مادر زاد گالی دے کر فرمایا ــــ

بوڑھا ہوں مگر تاب جواں رکھتا ہوں صورت پہ نہ جا حسن بیاں رکھتا ہوں

ملتی ہے مجھے داد فصاحت بے خود میں قلعۂ دہلی کی زباں رکھتا ہوں

پنڈت جی نے جب یہ حالت دیکھی تو بے خود مرحوم کے پیر پکڑ کر دبائے تاکہ معاملہ ٹھنڈا ہو۔ مولانا نے جب مشاعرے کا رنگ بگڑتے دیکھا، تو اپنی غزل بسمل شاہجہانپوری کو دیتے ہوئے کہا۔

"لو بھئی بسمل اسے پڑھو اور چلو۔"

غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ــــ

زندگی سے اپنی گھبرا کر چلے آئے تھے گھبرا اور پلٹ کر گھر چلے
بات میری خاک تم سن کر چلے سینکڑوں الزام مجھ پر دھر چلے
تھا خلاصہ زندگی کا اس قدر شام آئے شب سے پہلے گھر چلے
ساقیا ظاہر ہو یوں شانِ کرم میکدے سے جو چلے پی کر چلے
خشک لب میرے رہے پیشِ نظر میکدے میں جب مہ و ساغر چلے
تیرے صدقے تشنۂ لطف و کرم ہاتھ خالی آئے دامن تر چلے
مقصد اپنا ہو گیا پورا اسیر مرنے آئے تھے اور کسی پر مر چلے
ایسے آنے سے نہ آنا خوب تھا شام آئے تھے شب سے پہلے گھر چلے

مولانا کے خطوط میں بھی ادبی چاشنی، مذہبیت، طنز و ظرافت، شگفتگی اور بے ساختہ پن جابجا ملتا ہے۔ مکاتیب احمد سعید کے نام سے ایک مجموعہ سید ضمیر حسن دہلوی نے ترتیب دیا ہے، ضمیر صاحب مولانا کے رشتہ دار ہیں، مولانا کی اہلیہ سید ضمیر حسن کی والدہ کی سگی پھوپھی تھیں۔

مولانا کے خطوط کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں ـــــ

۱۱ر دسمبر ۱۹۴۲ء کے ایک خط میں اپنے قریبی دوست حافظ رحمت الٰہی متعکف کو لکھتے ہیں: "آپ دیکھتے ہیں کہ کم بخت جاپان ساون کی گھٹا کی طرح غراتا ہوا چھاتی پر چڑھا آ نکلا ہے اس کو نہ تو خدا کا خوف ہے، نہ دنیا کی شرم ہے، جو چیز ہماری گورنمنٹ نے برسوں میں محنت کر کے خون بہا کر یا غدر و مکر سے حاصل کی تھی، یہ دنوں اور گھنٹوں میں چھیننا چاہتا ہے ـــ" اپنے بچپن کے دوست ملا واحدی کو کراچی ہجرت کرنے پر لکھتے ہیں ـــ: "میاں میں تو تمہاری تلاش میں تھا ـــ پتہ کوئی نہیں بتاتا تھا، تمہیں خبر بھی ہے، تم نے کتنا گناہِ عظیم کیا ہے۔ اللہ کے ہاں اس کی بازپرس ہوگی، تب پتہ چلے گا، تمہارے بھاگنے سے سارا محلہ بھاگ پڑا۔

ویران دلی کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے ۲۹/۵ کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں: "دلی جن سے دلی تھی واحدی! وہ دکان اپنی بڑھا گئے، دلی اب باقی نہیں ہے، دلی اور امرتسر میں کوئی فرق نہیں ہے، میں تو گھر سے بہت کم نکلتا ہوں، احباب کا فقدان، دلی کی ویرانی، جیسے کوئی چنبیلی

کا درخت ہو اور ببول کے بیچ میں لگا دیا جائے، مور کی طرح ناچتا ہوں، اور اپنے پاؤں کو دیکھ کر روتا ہوں، احباب کا تصور کرتا ہوں، اور جگر کا یہ شعر پڑھتا ہوں ـــــ

یوں زندگی گذار رہا ہوں تیرے بغیر — جیسے کوئی گناہ کیئے جا رہا ہوں میں

زندگی کے آخری سال میں ملا واحدی کو دوسرے خط میں اپنی مصروفیت کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

"یہاں آج کل شادیاں زیادہ ہو رہی ہیں۔ لوگ نکاح پڑھانے کے لیے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ غمی والے جنازے کی نماز پڑھانے کے لیے گھسیٹتے ہیں مجھے خبر نہیں کہ میرے جنازے کی نماز کون پڑھائیگا، بزرگوں میں سے کوئی رہا نہیں، بہرحال کوئی نہ کوئی پڑھا دے گا۔" (آپ کی نماز جنازہ مولانا الیاس کے صاحبزادے مولوی محمد یوسف امیر تبلیغ جماعت نے پڑھائی تھی۔)

شمع اخیر شب ہوں سن سرگزشت میری
پھر صبح ہوتے تک تو قصہ ہی مختصر ہے

مولانا خطیب بھی تھے اور ادیب بھی! ان کی تقریر و تحریر میں دلی کی روزمرہ کی زبان ہوتی تھی۔ لوگوں کا دل موہ لیتے تھے، کئی کئی گھنٹے تقریر کرتے اور مجمع دم بخود بیٹھا رہتا، ان کی تمام کتابیں نہایت دلچسپ پیرائے میں تحریر ہیں۔ آپ کم و بیش ۲۰ کتابوں کے مصنف ہیں۔

(۱) جنت کی کنجی (۲) دوزخ کا کھٹکا (۳) از بلا (۴) مشکل کشا (۵) شوکت آرا بیگم (۶) خدا کی باتیں (۷) رسول کی باتیں (۸) دین کی باتیں (۹) پردہ کی باتیں (۱۰) پہلی تقریر سیرت (۱۱) دوسری تقریر سیرت (۱۲) تقاریر احمد سعید (۱۳) ماہ رمضان (۱۴) جنت کی ضمانت (۱۵) صلواۃ و سلام (۱۶) رسول اللہ کے تین معجزات (۱۷) ہماری دعا قبول کیوں نہیں ہوتی (۱۸) عرش الہی کا سایہ۔

سب سے اہم اور علمی کارنامہ آپ کی عام فہم تفسیر کلام پاک ہے، جسے آپ نے ۱۸ سال کی شب و روز محنت اور عرق ریزی کے بعد ۱۹۵۶ء میں شعبان کی ۱۴ تاریخ کو پورا کیا۔ مولانا کی سب سے بڑی خواہش تھی، کہ اللہ تعالیٰ اتنی زندگی دے کہ میں تفسیر مکمل کرلوں، الحمد اللہ یہ خواہش پوری ہوئی،

البتہ مولانا کی وفات کے بعد مولوی محمد سعید نے تفسیر کشف الرحمٰن کے نام سے شائع کی۔ بعد میں پاکستان سے بھی طبع ہوئی، اب ان کے عزیز اور عقیدت مند خواجہ محمد سلیم نے مکتبہ سلیفہ کے

نام سے ایک ایک پارہ شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے فی الوقت پارۂ عم شائع ہو چکا ہے۔

تفسیر کے بارے میں مرحوم مولانا قاری محمد طیبؒ کا کہنا تھا ___

"مجھے تمام تراجم میں بوجہ بلاغت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا ترجمہ پسند تھا، لیکن یہ ترجمہ شگفتگی میں اس سے بھی کچھ سوا ہی نظر آتا ہے، ارادہ کرتا ہوں کہ اپنی تحریرات میں جہاں آیات کے ترجمے درکار ہوں گے تو اس ترجمے کی نقل پر قناعت کرسکوں گا۔"

مولانا حافظ قرآن تھے، اور آخر عمر تک تراویح میں قرآن مجید سناتے اور مستقل طور پر حاجی فریدالدین قریشی بڑے انہماک سے سنتے رہے۔

مولانا کا تعلق خلافت تحریک سے بھی رہا اور وہ تمام محرکات کے دل سے قائل تھے، جن کے تحت ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑی جارہی تھی۔ اس سلسلہ میں وہ کئی مرتبہ جیل گئے۔ پہلی بار ۱۹۲۱ء میں قید ہوگئے اور ایک سال کی سزا دہلی اور میانوالی جیل میں کاٹی، دوسری بار ۱۹۳۰ء میں دو سال کی سزا ہوئی جو دہلی اور گجرات جیل میں بسر ہوئی، ۱۹۳۲ء میں ایک بار پھر گرفتار ہوئے، اور ایک سال کا عرصہ دہلی اور ملتان جیل میں گذارا۔ ۱۹۴۰ء میں کچھ عرصے کے لیے اعظم گڈھ جیل میں ڈالدیئے گئے ۱۹۴۲ء کی تحریکِ آزادی میں نظر بند ہوئے اور تین سال تک دہلی، لاہور، فیروزپور، اور ملتان جیل میں رہے، اس طرح مرحوم نے سیاست میں عملی طور پر حصہ لے کر قید وبند کی سخت صعوبتیں برداشت کیں، میانوالی جیل میں آپ نے بان بٹے اور چکی بھی پیسی، محنت ومشقت کے باوجود آپ کو جیل میں شعر گوئی کے علاوہ، کھانا پکوانے اور کھلانے کا بھی شوق رہا۔ کبھی کبھی بیڈمنٹن سے بھی دل بہلالیا کرتے تھے، عبدالعزیز انصاری اور دوسرے قیدیوں کو حدیث کا درس دیتے اور وعظ ونصیحت فرماتے رہے۔

۱۹۳۲ء کے دوران ملتان جیل میں فتح الباری کا آخری حصہ مفتی کفایت اللہ کی استادی میں ختم کیا۔۔ ۱۹۴۲ء کے دوران مولانا کے ہمراہ ان کے دونوں لڑکے محمد سعید، مظہر سعید بھی گرفتار ہوئے۔ مولانا کی دوران اسیری میں جو ساتھی اُن کے ہمراہ رہے، اُن میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، بیرسٹر آصف علی، لالہ دیش بندھو گپتا، لالہ جگل کشور کھنہ، مولانا داؤد غزنوی، لالہ شنکرلال، پنڈت نیکی رام شرما، منشی عبدالقدیر، سید جلال الدین، اور حافظ فیاض احمد جیسے جانباز لوگوں کے نام نمایاں ہیں۔

مولانا عطاءاللہ شاہ بخاری، آپ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :"ہم میں سے جب کوئی جیل سے رہا ہوتا تو سب بچوں کی طرح روتے، بلکتے اور بادل ناخواستہ الوداع کہتے، مولانا احمد سعید رہا ہونے لگے تو ان کی گھگھی بندھ گئی، آنسوؤں کے تاروں سے نغمۂ جدائی پھوٹ رہا تھا۔ اب کہاں، لیکن وہ رنگا رنگ بزم آرائیاں۔ یعنی سب نقش و نگار طاقِ نسیاں ہوگئیں۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ" میں دہلی صرف دو ہستیوں کے لئے آتا ہوں اور وہ ہیں، مفتی کفایت اللہ اور احمد سعید"

مولانا بے حد ملنسار اور خلیق تھے، کبھی کسی سے گریز نہیں کرتے تھے، ہر آنے والے کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتے، مولانا بڑوں میں بڑے، برابر والوں میں برابر والے اور بچوں میں بچہ تھے، آپ کی شخصیت بڑی باغ و بہار تھی، حاضر جوابی میں ان کا جواب نہ تھا۔ ایک بار جیل میں مولانا نے چوہا مار کر ڈوری میں باندھا اور اسے دروازے کے ساتھ لٹکا دیا، جب جیلر آیا تو مولانا نے ازراہ مذاق کہا ــــــ "جیلر صاحب! یہ دیکھئے میں نے چوہا مارا ہے، فرمایئے کتنے دن کی معافی ملے گی۔"

جیلر نے کہا آپ تو عدم تشدد کے حامی ہیں، آپ نے تشدد کیوں کیا" مولانا کا برجستہ جواب تھا، کہ صاحب وہ کونسا سرکاری ملازم تھا"

مولانا کے اس جملے پر جیلر کو بھی ہنسی آگئی۔!

مولانا مرحوم نڈر، بے باک اور حق پسند تھے جس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگایا جاسکتا ہے، جو ۱۹۲۱ء میں اسیری کے دوران دہلی جیل میں پیش آیا تھا۔ ہوا یوں کہ ــــــ جیلر کی بدسلوکی کے خلاف قیدیوں نے بیرکوں میں بند ہونے سے انکار کردیا۔ خطرے کی گھنٹی بجی، وارڈن بندوق لے کر آگئے، مولانا سینہ تان کر کھڑے ہوگئے، رات کو بارہ بجے فیصلہ ہوا جب لوگ بیرکوں میں داخل ہوئے، سزا کے طور پر آپ کو منٹگمری جیل میں بھجوادیا۔ آپ کے ہمراہ حافظ ظہورالدین، لالہ شنکر لال، رشید خاں، شیخ محمد تقی، عبدالعزیز انصاری، جگت پال اور گوپال سودیشی بھی تھے، جہاں سب کو سی کلاس میں ڈالدیا گیا ــــ

مولانا نے مصائب زنداں کی تمام روداد ایک نجی ڈائری میں لکھی تھی، اس ڈائری کے حصول

کے سلسلے میں جب میں نے کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہ ڈائری شیخ عبد الحق پراچہ لے گئے تھے، اب چونکہ پراچہ صاحب اس جہاں میں نہیں' اس لئے اس ڈائری کے بغیر مولانا کی سیاسی ہل چل پر تفصیل سے روشنی ڈالنے سے محروم ہوں۔ اس سلسلے میں یہ بھی عرض کردوں، کہ مولانا کی وہ ڈائری جس میں ان کے اشعار درج تھے، حالات کی نذر ہو چکی ہے۔

مولانا چاہتے تو بہت سی سرکاری مراعات حاصل کر سکتے تھے، مولانا آزاد، پنڈت نہرو اُن کے قریبی دوست تھے۔ مگر ان کی غیور طبیعت نے کبھی یہ گوارہ نہیں کیا۔ ایک بار پنڈت جی نے اپنے سکریٹری جان متھائی کو مولانا کے پاس بھیجا تاکہ ۳۰۰/- روپے ماہوار وظیفے کے کاغذات پر منظوری لے سکیں۔ مولانا نے کاغذات کو پیشانی سے لگایا اور فرمایا ــــ "پنڈت جی سے احمد سعید کا سلام کہنا' اور کہنا آزادی کی لڑائی لڑنا میرا فرض تھا، اور ادائیگی فرض کی کوئی قیمت نہیں ہوتی"۔

۱۹۱۲ء سے نظام حیدر آباد نے بھی مولانا کے لیے ۳۰۰/- روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا ہوا تھا' جب آپ کانگریس میں شامل ہوئے، اور جنگ آزادی میں حصّہ لیا تو نظام نے وظیفہ بند کرنے کی دھمکی دی آپ نے جواب میں وظیفہ لینے سے صاف انکار کر دیا ــــ ایک اور واقعہ بھی عرض کرتا چلوں جس سے مولانا کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔

مولانا کا معمول تھا کہ وہ فراشخانے کی مسجد میں قرآن مجید کا ترجمہ بیان فرما کر جمعیۃ کے دفتر میں تشریف لاتے تو اپنی جیب سے پیسے نکال کر دیتے اور آواز دے کر کہتے "میاں عبد الحق چائے تو بنالو ــــ" اسی طرح دوپہر کا کھانا بھی دورِ نظامت میں گھر سے منگا کر تناول فرماتے، غرضیکہ مولانا کی زندگی ایسی صاف ستھری تھی کہ کبھی مالیات کے سلسلے میں جماعت کے مرہون منت نہیں ہوئے۔

۱۹۲۰ء میں آپ نے جمعیۃ العلماء ہند کی بنیاد رکھی مفتی کفایت اللہ صدر اور آپ ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے اور ۱۹۴۰ء تک اسی عہدے پر رہے، اس کے بعد نائب صدر اور صوبہ دہلی کے صدر بنے۔

۱۹۵۷ء میں مولانا حسین احمد مدنی کے انتقال کے بعد صدر مقرر ہوئے۔ آپ جس محفل میں ہوتے صدر بنلئے جاتے، فسادات دہلی کے دوران جامع مسجد کے سامنے پریڈ گراؤنڈ میں جہاں اب مولانا آزاد کا مزار ہے، مسلمانوں کا ایک عظیم اجتماع ہوا جس کی صدارت بھی آپ نے فرمائی، اسی جلسے میں مولانا آزاد نے تاریخی تقریر کی جس نے مسلمانوں کو آزادی سے جینے کا حوصلہ دیا، مولانا آزاد نے فرمایا۔

"آج تم زلزلوں سے ڈرتے ہوئے، کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے، آج اندھیرے سے کانپتے ہوئے کیا یاد نہیں رہا کہ تمہارا وجود ایک اجالا تھا، وہ تمہارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اُتر گئے، پہاڑوں کی چوٹیں کو روند ڈالا، بجلیاں آئیں تو اُن پر مسکرا دیئے، بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا، صرصر اُٹھی تو رُخ پھیر دیا، آندھیاں آئیں تو ان سے کہا تمہارا یہ راستہ نہیں ہے یہ ایمان کی جان کنی ہے، کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبان کے تار تار بیچ رہے ہیں۔ اور خدا سے اس قدر غافل ہو گئے ہیں، جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا۔" (ابوالکلام آزاد)

مولانا کی حاضر جوابی اور انداز بیان سے متاثر ہو کر مولانا راسخ دہلوی نے مچھلی والوں کی مسجد جواب مسجد مولانا احمد سعید کہلاتی ہے، میں وعظ شروع کرا دیا تھا۔ آپ شب قدر میں اس رات کی فضیلت کچھ اس طرح بیان کرتے کہ مغفرت کی دعا کرتے وقت لوگ دھاڑیں مار مار کے روتے تھے، مولانا کے پاس کوئی حساب تھا، جس سے وہ رمضان میں شب قدر کا قیاس کرتے تھے، اور رات پچھلے پہر اندھیرا کر کے بڑے جذباتی انداز میں دعا کراتے تھے اور اپنی لکھی ہوئی یہ مناجات بھی پڑھتے تھے ؎

منتظر ہیں آنے کی آنکھیں ہماری دیر سے ۔۔۔ آنے والے آ یہ مجمع طالب دیدار ہے

جلوہ دکھلا کر تمنا پوری کر دے دید کی ۔۔۔ اپنی چشم شوق پورے سال کی بیدار ہے

کچھ سُنے تو عرض کر دیں درد دل کا مُدعا ۔۔۔ گرچہ قابو میں نہیں دل اور زباں بیکار ہے

سخت طوفاں اندھیری ہوائیں ہیں خلاف ۔۔۔ اس پہ آفت یہ کہ کشتی بر سر منجدھار ہے

تنگ جینے سے ہوئے ہیں جینے والے اے کریم ۔۔۔ زندگی سے اپنی ہر اک باحیا بیزار ہے

بخشنے سے گر گناہوں کی تجھے کچھ عذر ہے ۔۔۔ پھر بتا جائیں کہاں وہ کون سی سرکار ہے

پھیر جا اپنی معافی کا قلم بس پھیر جا

کہنے والا کون ہے کہ تو مرا ستار ہے

مولانا کو بزرگوں کے مزارات اور صوفیائے کرام کے برگزیدہ طبقے سے بڑی عقیدت تھی، جب کبھی اجمیر شریف اپنے داماد اور بڑی لڑکی سے ملنے جاتے تو گھر سے درگاہ خواجہ غریب نواز رحؒ تک ننگے پاؤں حاضری دیا کرتے سلطان جی کی سترھویں میں رات کے پچھلے پہر اپنے ساتھیوں کے ساتھ

ایک چکر لگائے بغیر انہیں چین نہیں آتا تھا۔ جب کبھی اُداس ہوتے اور رونے کو جی چاہتا تو کسی گانے والے کو ساتھ لے کر خواجہ بختیار کاکی رح کے مزار شریف پر تشریف لے جاتے۔

حضرت خواجہ حسن نظامی رح اور ان کے گھرانے سے بھی آپ کے قریبی تعلقات تھے خواجہ صاحب سیاسی اختلافات کے باوجود ہر عید پر کوچہ چیلان آکر ملا واحدی، آصف علی جعفری صاحب سے ملتے ہوئے، مولانا کے پاس آتے، مٹھائی کھاتے بھی اور کھلاتے بھی ـــــ بعد میں خواجہ صاحب مفتی کفایت اللہ کے مکان پر تشریف لے جاتے، اب ایسی وضعداریاں کہاں۔؟

مولانا کو فصاحت و بلاغت میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ضرورت کے وقت آپ بہترین مناظرہ نگار، خطابت کے وقت بلند پایہ خطیب و مقرر کہ قدر دانوں نے سحبان الہند تسلیم کرلیا۔

مولانا احمد سعید کے بارے میں مرحوم عثمان فارقلیط تحریر فرماتے ہیں۔

"۱۹۲۳ء کی بات ہے، سنہری مسجد چاندنی چوک کے سامنے فوارے کی سیڑھیوں پر اس زمانے میں مسجد فتحپوری سے دریبہ کلاں تک ایک پٹری لمبی سی تھی جہاں آریہ سماجی لیڈر، مسلمان مولوی، اور عیسائی پادری مناظرہ کیا کرتے تھے۔ سفید سرخ چہرہ، قامت کے اعتبار سے طویل، سر پر گول ٹوپی، بدن پر سفید اور باریک انگرکھا، تنگ پاجامہ پھولدار دہلوی جوتا زیب تن کئے ہوئے، دلی کی چٹخارے دار زبان میں آریوں کے بعض اعتراضات کا جواب دے رہے ہیں چہرے پر مسکراہٹ سونے پر سہاگہ کا کام دے رہی تھی، تقریر میں تسلسل تھا، ہر جملے سے مزاح اور چٹکلے ٹپکتے دکھائی دیتے، تقریر اس قدر دلچسپ اور شگفتہ تھی کہ بھیڑ جمع ہوگئی۔"

حضرت مولانا جہاں فطرتاً نڈر اور بے باک تھے، وہیں لین دین کے معاملے میں سچے، صاف اور امین بھی تھے، لوگوں کے ہزار ہا روپے اور زیورات بطور امانت رہتے تھے، اور کہیں جگہ امانت کا اندراج رکھتے۔ محفل میں موجود اپنے مصاحبوں کو مخاطب کرکے کہا کرتے ـــ میاں پہلوان سنو! فلاں صاحب...... اپنی امانت رکھ گئے ہیں۔ جو میں نے محمد سعید کے پاس رکھوادی ہے۔ اس طرح وہ اپنی صحبت میں موجود لوگوں کو بھی گواہ بنالیا کرتے تھے کچھ صاحب خیر، بیواؤں اور غریبوں کی امداد بھی مولانا کی معرفت کیا کرتے تھے، اس امانت کو بھی مولانا مستحق لوگوں تک بصید رازداری کے ساتھ پہنچادیا کرتے تھے، کچھ مساکین کا راشن دتارام گپتا کے ہاں سے بھی مقرر کرا رکھا تھا

مولانا بڑے مہمان نواز تھے ان کے ہاں ٹین کے ڈبوں میں ہمیشہ مٹھائی موجود رہتی تھی اور آنے والوں کی مٹھائی سے خاطر کرتے اور کہتے تھے ۔ "میاں یہ تو آپ کو کھانی پڑے گی ۔ آپ میری انسلٹ کر رہے ہیں"۔ مولانا کے ہاں کسی بھی وقت چلے جایئے، کوئی نہ کوئی اپنا دکھڑا سناتے ہوئے نظر آتا تھا، مولانا ہمدردی سے اس کی باتیں سنتے اور حتی الامکان اس کی مدد کرتے، سفارشی خط لکھتے یا ضرورت محسوس کرتے تو متعلقہ آفیسر سے خود جاکر ملتے اور اس کام کو انجام دلاتے ۔

۱۹۴۷ کے بعد جن مسلم رہنماؤں نے دہلی والوں کی خدمت کی ان میں مولانا حفظ الرحمن رح عزیز حسن بقائی، چودہری عبد الستار، میر مشتاق احمد کے ساتھ ساتھ مولانا کا نام بھی ہمیشہ عزت سے لیا جائے گا۔ ۱۹۴۷ء کی روح فرسا فضا میں دلی کی جس طرح بربادی کی گئی تھی، مولانا اس سے بے حد فکرمند تھے، اس سلسلے میں انھوں نے مہاتما گاندھی سے رابطہ قائم کیا، انھیں حضرت بختیار کاکی رح کی درگاہ پر لے گئے، اور صفائی ومرمت کے لیے شب وروز ایک کردیئے۔ فسادات کے دوران جب گاندھی جی نے دلی کا دورہ کیا تو آپ مولانا کے گھر بھی تشریف لائے۔

فساد دلی کے بعد تعزیہ داری ختم ہو چکی تھی، آپ نے اپنی ذاتی کوششوں سے ۵۲-۱۹۵۱ء میں تعزیہ کا جلوس دوبارہ نکلوانے میں ذاتی دلچسپی لی۔

۱۹۴۶ء سے مولانا کی وفات تک میں ان کی قدمبوسی میں حاضر رہا، گاہے گاہے ان کی محفلوں میں شریک ہونے کا شرف بھی حاصل رہا؛ مولانا کی صحبت میں اُن کے کمالات واوصاف کو سمجھنے اور استفادہ کرنے کا موقع ملا اور زندگی کے نشیب وفراز کو قریب سے سمجھا اور جانا۔ ۱۹۵۰ء کے قریب مولانا کے ادارہ دینی بکڈپو (جسے اُن کے لڑکے مولوی محمد سعید چلاتے تھے) سے بھی تعلق رہا، کچھ عرصہ مولانا کی سرپرستی میں جمعیۃ علمار ہند صوبہ دہلی کا ناظم اور ڈھلائی یونین کا سکریٹری بھی رہا۔

مولانا کے مردانے مکان میں ہر روز ایک محفل سجتی تھی جو آدھی رات تک جاری رہتی تھی، اس میں ہر طبقہ وخیال کے لوگ موجود ہوتے، دانشوروں سے لے کر دلی کے کرخنداروں تک کی رسائی آپ کی محفل میں تھی، مولانا کی دوستی ہمیشہ ہی ہر طبقہ کے لوگوں کے ساتھ رہتی تھی۔

ان کی محفل میں روزانہ آنے والوں میں کوئی مناسب تعلیم یافتہ، شستہ آدمی نہیں ہوتا تھا البتہ جمعہ کے روز جو لوگ تشریف لاتے تھے ان میں بعض آدمی اچھے بھی ہوتے تھے، جن میں تعلیم یافتہ،

قانون داں، سیاست داں، شہر کے تاجر اور معزز حضرات بھی تھے اِن کے دوست راشٹرپتی بھون کناٹ پلیس یہ ہی نہیں بلکہ سوئیوان، چوڑی والان سے لے کر صدر بازار، بیری والا باغ پر بھی رہتے تھے۔ جن میں غوری پہلوان سے لے کر پنڈت نہرو تک سب ہی لوگ شامل تھے، روزآنہ یا گنڈے دار آنے والوں میں اسمٰعیل غوری پہلوان، محمد عیوض گھوسی، حاجی عبدالعزیز صدر ڈھلائی یونین، عبدالحمید تیل و عطر فروش، پیرجی یاسین عرف مولوی لال مرغا۔ عبدالسلام زبیٔ، خلیفہ محمد ایوب، نیاض علی ہاشمی، سید مجید احمد، محمد مرزا گھی والے، انور دھلوی، علی محمد شبیر سیوات، شوکت علی ہاشمی، گلزار دہلوی اور عقیل ناروی کے نام قابل ذکر ہیں۔

ہر جمعہ کو پابندی سے آنے والوں میں حاجی رحمت الٰہی معتکف، حاجی محمد صالح (حاجی علی جان والے، حافظ محمد نسیم بٹن والے، حکیم خلیل الرحمٰن نار، پیرجی محمد صدیق، ہلال احمد زبیری، محمد عثمان گھڑی ساز، بادشاہ پہلوان، محمد صابر تار والے، نور محمد، نذر محمد عباسی، اور خواجہ محمد سلیم کے نام مجھے یاد ہیں۔

یارانِ طریقت کی محفل آدھی رات تک جمی رہتی اور گھڑی گھڑی کشمیری چائے کا دور چلتا رہتا طرح طرح کی بولیاں بولی جارہی ہیں۔ خوش گپیاں ہورہی ہیں، جامع مسجد کی سیڑھیوں سے لے کر امریکہ، برطانیہ تک کی سیاست پر بحث ہو رہی ہے، غوری پہلوان اور عبدالعزیز صدر کے درمیان نوک جھونک جاری ہے، عیوض گھوسی، حمید تیلی، غوری پہلوان، اور صدر عبدالعزیز کے درمیان گالیوں کا چوکھی مقابلہ ہو رہا ہے اور مولانا اپنی مسند پر ڈیسک کے سہارے یا گاؤ تکیہ آگے رکھے لکھنے میں مشغول ہیں، ان لوگوں کی باتیں اور آوازیں ذرا بھی مخل نہیں، سونے پر سہاگہ مولانا خود بھی ان کی باتوں سے بے خبر نہیں، بلکہ لطیف انداز میں اور کبھی کبھی سر اٹھا کے کوئی چلتا ہوا جملہ کہہ دیتے جس سے محفل زعفران زار بن جاتی، اور رنگ چوکھا ہوا اٹھتا آپ کی محفل میں آنے والا کوئی فرد غیر حاضر ہوتا تو دوسرے ہی روز خیریت طلب کرتے، یا خود اس کے گھر پہونچ جاتے۔

سننے والے مولانا کی باتوں سے بہت محظوظ ہوتے، اور ان کے لطیفوں سے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے ان کے لطیفوں میں بھی سحر بیانی کو دخل تھا، میں وہ سحر بیانی کہاں سے لاؤں، جو ان کے لطیفوں کو دوہراؤں، سوچتا ہوں کہ بطور نمونہ دوچار لطیفوں کو نقل کردوں، مگر بات بتائے نہیں بنتی، مولانا بے ساختہ ایسے محاورے بول جاتے تھے، کہ اچھے اچھے زبان داں بغلیں جھانکتے رہ جاتے، جیسے ایک

کبوتر بازوں کا قدیم محاورہ ہے، استعمال کرنا تو درکنار، کتنے اہل زبان اور زباں داں جو اس کے معنی جانتے ہیں۔ مولانا کی نظر آدمی کے عیب پر نہیں اُس کے ہُنر پر جاتی تھی، وہ جواری، شرابی، سٹے باز اور اسی قبیل کے دوسرے لوگوں سے بھی محبت سے پیش آتے اور اپنے قُرب سے لوگوں کو تائب کرا دیتے۔ ایک مرتبہ ایک تعیش پسند رئیس کو نصیحت کرتے ہوئے مسکرا کر فرمایا ــــ

" میاں تم ہمارے کہنے سے وہ سب کچھ تو چھوڑو گے نہیں جو کرتے ہو ۔" البتہ ایک کام اور کر لیا کرو، اس اللہ کے دیئے میں سے کسی یتیم یا بیوہ کی شادی پر کچھ لگا دیا کرو، پھر تو وہ سارے شہر میں یتیموں اور بیواؤں کی شادی کرانے والے مشہور ہو گئے۔

تقسیم کے بعد دلی میں دلّی والے تو بہت کم رہ گئے تھے، البتہ قرب وجوار سے آکر دلی میں بسنے والوں کی کافی تعداد ہو گئی اور کیوں نہ ہو بقول مرحوم آصف علی" دلّی" اور دلّی والوں کا دل بہت بڑا ہے، جو بھی اس میں آتا ہے، سما جاتا ہے، دلّی کی بڑھتی ہوئی آبادی پر گفتگو ہو رہی تھی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے آپ سے دریافت کیا" حضرت! آپ دلی والا کسے مانتے ہیں ــــ" مولانا نے برجستہ جواب دیا:" جو عیدین کی نماز دلّی میں پڑھے "

مولانا کی فراخ دلی پر ایک واقعہ یاد آگیا ــــ

ستمبر ۱۹۵۵ء کے دوران جامع مسجد میں ایک جلسہ روس کے مفتی اعظم ضیاء الدین بابا خان کے اعزاز میں مولانا کی صدارت میں منعقد ہوا، جلسہ ختم ہونے پر مولانا اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ پیدل گھر کی طرف گامزن تھے، کہ اچانک جواہر ہوٹل کے قریب اسمعیل چوبی نامی شخص نے آپ کے کولہو پر چاقو سے حملہ کر دیا، ڈیڑھ انچ گہرا، اور تین انچ لانبا زخم آیا۔ لیکن اس کے باوجود مولانا نے اُسے کچھ نہیں کہا اور اُسے معاف کرتے ہوئے فرمایا:" میاں کسی کے کہنے سننے میں آکر اس نے خلاف توقع یہ حملہ کر دیا ہوگا

دیکھا جو کھا کے تیر کمین گاہ کی طرف اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

عمر کے آخری حصے میں مولانا کو ایک سیاسی شکست کا سامنا بھی کرنا پڑا، ۱۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کو مولانا اور ڈاکٹر مرزا احمد علی کے درمیان راجیہ سبھا کے لیے مقابلہ ہوا، آپ صرف دو ووٹ سے ہار گئے، اکثر اس واقعہ کو یاد کر کے مولانا کہتے تھے،" میاں چلتے چلتے چودھری برہم پرکاش نے مجھے الیکشن میں زبردستی

پھنسادیا اور چودھری کی وجہ سے یہ ذلت اُٹھانی پڑی ۔"

چالیس سال کی عمر کے بعد جب کوئی مرض جان کو لگ جاتا ہے ، تو وہ بہت کم جاتا ہے ، کچھ دنوں کو دبتا ہے ، پھر اُبھر آتا ہے ۔ مولانا ۴۰ سال کی عمر سے قلب کے مریض تھے ، علاج مسلسل جاری رہتا ۔ آپ یونانی طریقۂ علاج کو پسند فرماتے ، جب کہ لڑکے ڈاکٹری علاج پر اعتقاد رکھتے تھے ، حکیم محمد الیاس ، حکیم شریف الدین بقائی وغیرہ کا علاج بھی رہتا اور ہمدرد کا خمیرہ ارشد والا یا جواہر مہرہ بھی چلتا رہتا طبعاً دوا کے چور تھے ، پرہیز کبھی کیا نہیں ، مچھلی کے کباب ، شامی کباب ، کوفتے ، شب دیغ ، بیسنی روٹی اچار ، مربے ، خالص شہد ، آم اور خربوزے بڑی رغبت سے کھاتے ، آخری سالوں میں کھانا صرف دن میں کھاتے اور رات کو چائے نوشی فرماتے ، دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد قیلولہ ضرور فرمایا کرتے تھے ،

آخری دنوں میں مریض قلب کے علاوہ ریاحی بواسیر ، مسوں میں کھجلی ، پیٹ میں حبس ، نزلہ ، رات کو بے چینی ، سردی کا لگنا ، اور نیند کا نہ آنا جیسے موذی امراض کے شکار ہو گئے تھے ، مولانا فرماتے تھے "آخر زندگی کب تک ساتھ دے گی ، صبح ہوتی ہے تو شام کا بھروسہ نہیں ، اور شام ہوتی ہے تو صبح کا بھروسہ نہیں ۔"

۴ دسمبر ۱۹۵۹ء مولانا احمد سعید کی زندگی کا وہ آخری دن تھا ، جب آپ نے روزانہ کے معمولات کے مطابق تمام کام انجام دیئے ، بعد نماز مغرب بیت الخلاء گئے ، واپس آکر بیٹھے اور اخبار ہاتھ میں اٹھایا پھر ایک لڑکے کو جو اتفاق سے تنہا تھا کہا ـــــ جا بے محمد سعید کو بلا کر لا ۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے یہ سنتے ہی لڑکا ان کو بلانے کے لئے زنانہ مکان پر گیا ، ادھر مولانا بیٹھے بیٹھے ہی پلنگ کے عرض میں لیٹ گئے اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی ، انا للہ وانا علیہ راجعون !

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

موت کی خبر آناً فاناً سارے شہر میں پھیل گئی ، دلّی میں صف ماتم بچھ گئی ، آخری دیدار کے لیے لوگوں کا تانتا بندھ گیا ، پنڈت نہرو بھی اپنے بزرگ ساتھی کا دیدار کرنے آئے ، دیر تک مکان پر جنازے کے سرہانے کھڑے رہے ، دوسرے روز صبح جنازے کو مہرولی لے جایا گیا ۔

تدفین کے وقت لاکھوں افراد کا ہجوم تھا ، آنجہانی اندرا گاندھی نے بھی مزار پر تشریف لاکر عقیدت کے پھول برسائے ۔

لحد میں جا سوئے یا الٰہی عزیز و غمخوار کیسے کیسے ۔

مولانا احمد سعید رح کو مہرولی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح کی درگاہ کے باہر ظفر محل کے قریب حضرت مفتی کفایت اللہ رح کے دائیں جانب دفنایا گیا۔ کسی نے سچ کہا ہے ؎

جسم احمد سعید فانی تھا نام احمد سعید باقی ہے

مولانا کو اپنے اُستاد مفتی کفایت اللہ سے اس قدر عقیدت تھی، کہ اپنی زندگی میں ہی مفتی صاحب کے قریب اپنی آخری آرام گاہ تیار کرالی تھی، اگر مولانا اپنی جگہ پہلے سے متعین نہ کر گئے ہوتے تو یقیناً انہیں جامع مسجد کے سامنے مولانا ابوالکلام آزاد کے قریب ہی سپرد خاک کیا جاتا۔

مولانا کے مزار مبارک کے سرہانے جو پتھر لگا ہوا ہے، وہ اُن کی وفات کے بعد چوڑیوالان کے رہنے والے ایک عقیدت مند محمد عاشقین نے نصب کرایا۔ یہ وہی محمد عاشقین ہیں جنہوں نے مولانا احمد سعید کے صاحبزادے مولوی محمد سعید کی وساطت سے درگاہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح میں پانی کی سپلائی کے لیے اپنی جیب خاص سے بجلی کا موٹر لگوایا تھا جو آج تک جاری ہے۔

سرہانے لگے پتھر پر جو عبارت کندہ ہے۔ اس سے بھی مولانا کی مکمل شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔

ملاحظہ فرمائیے:

۷۸۶

نذر عقیدت

داغِ فراقِ صحبت شب کی جلی ہوئی ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

۱ ۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی کا نڈر جنرل اور عظیم رہنما

۲ ۔ جمعیت العلماء ہند کے روحِ رواں

۳ ۔ آفتابِ فصاحت و بلاغت

۴ ۔ شہنشاہِ خطابت

۵ ۔ عارفِ اسرارِ شریعت و طریقت

۶ ۔ مبلغ اسلام

۷ ۔ متوکل علی اللہ

۸ ۔ علم مجلسی میں یکتا

٩ ۔ سخن فہم اور سخن گو

مفسر قرآن سبحان الہند حضرت علامہ حافظ الحاج مولانا احمد سعید نور اللہ مرقدہ،

تاریخ وفات ۴ دسمبر ۱۹۵۹ء بروز جمعہ بعد نماز مغرب ۱/۲ ، بجے

(نصب کردہ محمد عاشقین ۲۸۳۹ چوڑیوالان دہلی)

مولانا دراصل بڑے ہی صاحب کمال بزرگ تھے، وہ لوگوں میں اس طرح ملے جلے رہے، پھر بھی لوگ بخوبی نہیں سمجھ سکے، وہ کیا تھے۔؟

وہ درحقیقت دلّی کے آخری ولی تھے۔ دلّی کی آخری تہذیب کی یادگار تھے، دلّی والوں کا دل تھے۔

مولانا کے متعلق جتنا کچھ لکھا جائے کم ہے۔ مولانا کی شخصیت کا تقاضہ ہے کہ اُن کی ذات پر علیحدہ سے ایک سیمنار منعقد کیا جائے، تاکہ ان کی زندگی کے ہر گوشے کو واضح کیا جا سکے۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اِس بحرِ بیکراں کے لیے

ہو

سیّد آصف علی بیرسٹر

میں نے پہلی بار مسٹر آصف علی بیرسٹر (مرحوم) کو ان کے مکان واقع کوچہ چیلان میں اس وقت دیکھا تھا جب دلّی کے لال قلعہ میں جنرل شاہنواز جنرل سہگل اور جنرل ڈھلوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چل رہا تھا ہندوستان کے تمام وکیلوں کا ایک پینل بنا دیا گیا تھا جس کے کنوینر آصف صاحب ہی تھے لیکن مقدمہ کی پیروی میں جو شہرت بھولا بھائی ڈیسائی کو ملی وہ کسی کو نہ مل سکی یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ جب پنڈت نہرو اور بھولا بھائی ڈیسائی لال قلعہ میں پیروی کے لیے جا رہے تھے تو ان کے پاس وکالت کے گاؤن "نہیں تھے آصف صاحب نے اینگلو عربک سکول سے دو گاؤن منگوائے ایک پنڈت نہرو کے لیے اور دوسرا بھولا بھائی ڈیسائی کے لیے۔

یہ وہ دور تھا کہ ملک دوسری جنگ عظیم سے فاتحانہ نجات حاصل کر چکا تھا تحریک آزادی شباب پر تھی اس کے ساتھ ساتھ ملک کی فضا، فرقہ وارانہ تناؤ اور ہندو مسلم نفرت سے مسموم ہو چکی تھی کانگریس اور مسلم لیگ دونوں ایک دوسرے پر فرقہ پرستی کا الزام لگا رہے تھے۔ مسلم لیگی رہنما ان قوم پرور مسلمانوں کے دشمن بن چکے تھے جو کانگریس میں شامل تھے اس زمانہ میں قوم پرور مسلمانوں نے اپنے ہی بھائیوں سے جس قدر اذیت ناک روحانی اور جسمانی تکالیف برداشت کی ہیں ان کا

تذکرہ بے محل ہوگا۔

اس کا اندازہ صرف اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ کوچہ چیلان میں آصف صاحب کے مکان پر ان کے مخالفین روزانہ گالیوں سے مرتب قافیہ بند نعرے بڑے بڑے حرفوں میں لکھ دیا کرتے تھے اور آصف صاحب کے چاہنے والے اور جاں نثار کارکن ہر روز ان پر سفیدی پھیرا کرتے تھے یہ روزانہ کا معمول تھا اور آصف صاحب نے انتہائی صبر و تحمل سے یہ تکالیف برداشت کیں اور کبھی ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی۔

لیکن اس حقیقت سے بھی چشم پوشی نہیں کرنی چاہیئے کہ آزادی کے بعد قوم پرور مسلمان یا اُن کے نمائندوں کی حیثیت "فرد" کی رہی "فخر قوم کی نہ رہی۔ آصف صاحب اپنی ذاتی ڈائری میں اپنے حسب و نسب کے بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔

"کہ میں عجیب و غریب قسم کا مرکب ہوں ماں کی جانب سے مغل پٹھان اور باپ کے سلسلہ کی جانب سے برہمن وہ چاہے کچھ بھی تھے مجھے اس کے بارے میں کسی قسم کی شرمندگی نہیں ہے"

آصف صاحب کے دادا کے دو صاحبزادے تھے محسن علی خاں اور احسان علی۔ احسان علی کی شادی سترہ سال کی عمر میں ارتضیٰ خاں کی لڑکی سے ہوئی۔ اُن کی ماں کا حسب نسب مغل خاندان سے ملتا تھا اور باپ فنون لطیفہ میں یکتا تھا۔ وہ نہ صرف ایک اچھی خاتون تھیں بلکہ امور خانہ داری میں ماہر اور سلیقہ شعار ـــ وہ اپنے ساتھ اچھا جہیز لے کر آئی تھیں وہ اپنے شوہر کی خدمت گذاری میں لگ گئیں جنہیں اچھے کھانوں کا شوق اور اولاد کا ارمان تھا یکے بعد دیگران کے ہاں دو بچے پیدا ہوئے جو کچھ دن بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔

۱۱ مئی ۱۸۸۸ء کو خداوند تعالیٰ نے ایک چاند سا بیٹا دیا باپ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی بچے کا نام آصف علی رکھا گیا۔

آصف صاحب کی پیدائش کے اٹھارہ مہینہ بعد ان کے والد احسن علی پر ڈبل نمونیا ہو گیا ـــ اور وہ جان بحق ہو گئے۔ آصف صاحب کی والدہ عین جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں اس کے بعد ان کی ساری زندگی صرف اپنے بیٹے کے لیے وقف ہو کر رہ گئی تھی یہ اُن ہی کی طبیعت

کا نتیجہ تھا کہ آصف صاحب بچپن اور جوانی میں ہر بری صحبت سے بچے رہے ان کی غیر معمولی مادرانہ شفقت کی بھی وجہ تھی کہ آصف صاحب ان کی تمام تر اُمیدوں کا مرکز تھے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آصف صاحب اپنی والدہ کا بہت احترام کرتے اور حکم مانتے تھے جون ۱۹۱۷ء میں دہلی حکومت نے تاحکم ثانی انہیں پبلک جلسوں میں تقریر کرنے سے روک دیا تھا اس بندش کے کچھ دنوں بعد انھوں نے ایک پرائیوٹ جلسہ میں تقریر کی اور گرفتار کر لیے گئے اس موقع پر آصف صاحب کی والدہ کی طرف سے جو بیان شائع ہوا وہ بہت دل سوز ہے اس کے جستہ جستہ فقرے یہ ہیں ۔

"میں بیس سال کی عمر سے بیوگی میں زندگی گذار رہی ہوں میرا بیٹا ہندوستان کی آئینی آزادی کے لیے کام کر رہا ہے آج میرے لئے انتہائی مسرت کا دن ہے اس لئے کہ میں اپنے بڑھاپے کا واحد سہارا ملک و ملت کی نذر کر رہی ہوں"

آصف صاحب نے اینگلو عربک سکول اور اسٹیفن کالج میں تعلیم پائی ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۴ء تک انگلینڈ میں رہے جہاں انھوں نے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی انگلینڈ کے قیام دوران آصف صاحب اہم ہندوستانی اخبارات میں مضامین لکھتے رہے بمبئی کے کرانیکل اخبار میں تو وہ مستقل لکھتے دہلی سے مولانا محمد علی جوہر کا انگریزی اخبار "کامریڈ" کے پہلے دور میں متعدیہ مضامین ہیں راجہ غلام حسین کے اخبار "نیو ایرا" میں بھی اُن کی انگریزی نظمیں اور مضامین وقتاً فوقتاً نکلتے تھے یہ چیزیں کبھی تو اُن کے نام سے شائع ہوتی تھیں اور کبھی ان پر صرف "ایم ۔ اے" لکھا ہوا ہوتا ــــ آصف صاحب کے جگری دوست سید محمد رؤف علی بیرسٹر دہلی سے ایک ادبی رسالہ "یاران قدیم" کے نام سے نکالتے تھے اس میں آصف صاحب کے متعدیہ مضامین اور نظمیں موجود ہیں جو دہلی کی ٹکسالی اور بامحاورہ زبان کی عکاسی کرتی ہیں ۔ اگرچہ اُن کے بے شمار مضامین ادبی ماہانہ رسائل میں چھپتے رہے ہیں لیکن اب بھی ان کی تحریریں اور مضامین کو یکجا نہیں کیا جاسکا ــــ لیکن ان کی کچھ تصانیف ان کی چہیتی بیگم ارونا آصف کی دلچسپی کی وجہ سے محفوظ ہوگئی ہیں ۔ جیسے پرچھائیں، اسٹالن، پارسی ارمغان آصف، خود نوشت سوانح عمری وغیرہ

ارمغان آصف جو آصف صاحب مرحوم کی نثر و نظم کا مجموعہ ہے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

سابق صدر شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی نے ترتیب دیا ہے۔

ارمغان آصف میں ان کا ایک مضمون "میرن صاحب" ہے میرن صاحب آصف صاحب کے جگری دوست سید محمد رؤف علی صاحب بیرسٹر کے نانا تھے اور مرزا غالب کے ہم عصروں میں تھے مرزا کی دوستی پر ان کو بہت ناز تھا آصف صاحب "میرن صاحب" کی زبان کی چاشنی سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے اس مضمون میں ان کی گفتگو کو قلم بند کیا ہے۔ اسی طرح ایک افسانہ جو مسٹر آصف علی کے قلم کا نتیجہ ہے "زبیدہ سلطان کا نواسہ" لیکن یہ بھی ادھورا رہ گیا ہے۔ اس کی پہلی قسط "ارمغان آصف" میں موجود ہے جو "یاران قدیم" سے لی گئی ہے اس میں مسٹر آصف علی نے دلی کے ایک پرانے گھر کا صحیح نقشہ اور دلی کے رسم ورواج اور غدر کے بعد کی زندگی کا ایک خاکہ پیش کیا ہے۔ آصف صاحب شاعر بھی تھے اُن کی غزلیات، رباعیات قطعات منظومات کو بھی ترتیب دے دیا گیا ہے "سرزمین دہلی" کے عنوان سے ان کی طویل نظم میں دہلی کے عروج وزوال کی داستانیں پنہاں ہیں۔ ایک بند ملاحظہ ہو۔

نگاہِ چرخ نے وہ بھی سماں دیکھا ہے دِلّی کا
کہ دہلو راج کی ہیبت کا ہندوستان میں سکہ تھا
غزالانِ خطا، وہ سورما جو جاٹ کہلائے
کہ جن کی ترک تازی کا زمانے میں تہلکہ تھا
وہ جن کی چشم شہلا کے ہیں بسمل قاف و ایراں میں
وہ جن کی چیرہ دستی چارسو تھی کھیل چوگاں کا
وہ باگیں پھیر کر آخر دیار ہند میں پہنچے
نفاق بوستان ہند گل چینوں کو راس آیا
یہی کشورستان ملت کبھی دِلی کی بانی تھی
جو دہلو فخر ملت تھا تو دہلی راج دھانی تھی

کہا جاتا ہے کہ دِلی کی آواز بکتی ہے۔ بات بھی سچ ہے خواجہ محمد شفیع نے "نو" دِلی کی آوازیں" کتابی شکل میں شائع کردیں۔ آصف صاحب خواجہ صاحب سے بھی آگے بڑھ گئے

شہتوت کی، بیدانے والے کی، تربوز والے کی، مونیا کے پھول والے کی جھاڑی بوٹی کے بیر والے کی صدائیں ۔ نظم کردیں ۔

آصف صاحب نے جھاڑی بوٹی کے بیر والی نظم میں جو رنگ بھرا ہے اس سے ان کی شوخیٔ طبیعت اور دہلوی معاشرت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

یہ تازہ ہے بیر یہ میٹھا ہے بیر
کسی گھونگٹ والی نے توڑا ہے بیر
یہ کھٹ مٹھا نو جھاڑی بوٹی کا بیر
کسی جوبن والی نے توڑا ہے بیر
یہ فندق سا بیر یہ بندا سا بیر
کسی بھولی بھالی نے توڑا ہے بیر
یہ چنی سا لال یہ موتی سا بیر
نکیلی سجیلی نے توڑا ہے بیر
زمرد کی جھاڑی کا یہ لعل بیر
رنگیلی رسیلی نے توڑا ہے بیر
یہ جھومر سا بیر جھلنیاں سا بیر
کرن پھول والی نے توڑا ہے بیر
یہ ڈھلکا سا آنسو لہو لال بیر
یہ کانٹوں میں چھد چھد کے توڑا ہی بیر
یہ کھٹ مٹھا نو جھاڑی بوٹی کا بیر

انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ انگلستان سے واپسی پر آصف صاحب نے نہایت عبرت انگیز واقعہ سنایا وہ آتے وقت مصر ٹھہرے تھے وہاں کسی ہوٹل سے نکل رہے تھے کہ ایک مصری فقیر نے اُن سے بھیک مانگی انھوں نے اسے ایک سکّہ

دیا جس کی قیمت پانچ روپے کے برابر تھی اتنی بڑی رقم دیکھ کر مصری فقیر نے پوچھا کہ آپ کونسے ملک کے رہنے والے ہیں انھوں نے جواب دیا" ہندوستان " یہ سنتے ہی اس نے حقارت سے ان کی طرف دیکھا اور پھر نوٹ واپس کرتے ہوئے کہا کہ میں غلام ملک کے کسی فرد سے بھیک قبول نہیں کیا کرتا ، آصف صاحب کہتے تھے کہ اس طنز کا میرے دل پر بہت اثر ہوا اور میں نے اسی وقت طے کرلیا کہ ہندوستان پہنچتے ہی اسے آزاد کرنے کی کوشش شروع کر دوں گا "

اُن کی شخصیت پرکشش تھی اور چہرہ پر بھبن تھا کوئی بھی لباس وہ پہنتے خواہ ہندوستانی ہو یا انگریزی ان پر خوب پھبتا تھا اِسی طرح اُن کی تقریر کا انداز بھی دلکش تھا وہ آج بھی تقریر کے انداز میں آصف علی روڈ پر مجسمہ بنے کھڑے ہوئے ہیں ۔

وہ ایک ادیب تھے شاعر تھے قانون دان ہونے کے ساتھ ساتھ قانون شکن ـــــ سیاست دان بھی تھے لیکن ان کی شخصیت دہلوی معاشرت سے سرشار تھی اگرچہ وہ ملک کی آزادی کے علمبرداروں میں تھے گاندھی جی ۔ موتی لال نہرو مولانا آزاد پنڈت نہرو سردار پٹیل راجندر پرساد ، خاں عبدالغفار خاں اچاریہ کرپلانی ان کے ہم عصر تھے ، لیکن دلّی سے جوان کی جذباتی وابستگی تھی اس میں اُن کی قانونی اور سیاسی صلاحیتیں بہت زیادہ اجاگر ہوئی ہیں وہ نہ صرف میونسپل کمیٹی کے ڈھانچہ میں تبدیلی چاہتے تھے بلکہ دلی کے لیے اسمبلی کا مطالبہ کے وہ محرک تھے ، پرانے شہر سے انگریز بہت نفرت کرتے تھے اور شہر کی تنگ وتاریک گلیوں ـــــ سے خائف بھی بہت رہتے تھے یہ آصف صاحب کا ہی دم تھا کہ انھوں نے اس پرانے شہر کے لیے دہلی امپرومنٹ ٹرسٹ بنوایا ١٩٣٨ء تک شہر کے لیے ٧٥ . اسکیمیں تیار ہوگئیں تھیں لیکن پرانے شہر میں مالک جائیدادوں نے جن کے مکانات اسکیموں کی زد میں آگئے تھے شہر میں مختلف افواہیں پھیلادیں شہریوں میں شک وشبہات اور خوف وہراس اس قدر پھیل گیا تھا کہ ١٩٣٨ء کو دہلی کے شہریوں نے میونسپل کمیٹی چاندنی چوک پر بڑی تعداد میں مظاہرہ کیا تھا اس وقت ہاؤس میں تقریر کرتے ہوئے آصف صاحب نے دہلی اجمیری گیٹ اسکیم پر بولتے ہوئے فرمایا ۔ دلّی والوں کو گمراہ کُن پراپگنڈا سے ہوشیار رہنا چاہیے ٹرسٹ کی اسکیمیں کامیاب نہ ہوئی تو دہلی شہر پانچ لاکھ انسانوں کا ہسپتال بن جائے گا ۔

ٹرسٹ کا ہونا لازمی ہے میں علانیہ کہتا ہوں کہ میرا استعفا ہر وقت تیار ہے میرے کندھوں پر آئندہ نسلوں کی بھی ذمہ داری ہے اگر میں صحیح رائے نہ دوں تو میں حشر میں کیا جواب دوں گا ــــ وہ چاہتے تھے کہ دہلی کے ترقیاتی منصوبوں پر اس طرح عمل ہو جائے کہ لوگ کٹروں کی بدترین رہائشی زندگی سے نجات حاصل کر لیں۔ آج بھی دلی کو انہی مسائل کا سامنا ہے جس کے لیے آصف فکرمند رہتے تھے اور دلی اُن کے بعد سے جذباتی اور مخلص رہنمائی سے یتیم یتیم سی نظر آتی ہے۔

میرے والد رشید خاں صاحب نے جنگ آزادی میں آصف صاحب کی رہنمائی میں شرکت کی خلافت تحریک اور عدم تعاون کی تحریک کا آغاز تھا ۱۲ دسمبر ۱۹۲۱ء کانگریس تحریک کا سب سے پہلا مورچہ تھا اس زمانہ کے سیاسی ماحول میں اقتدار کی خوفناک ہیبت ہندوستانی عوام کے دلوں پر طاری تھی۔

آصف صاحب نے "آصف والنیٹر کور" کی تنظیم کی اور پہلے جتھے کی رہنمائی کرتے ہوئے کوچہ چیلان سے جامع مسجد کی جانب روانہ ہوئے اور گرفتاری کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا۔

تاریخی لحاظ سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جنگ آزادی میں آصف صاحب نے سب سے پہلے ایک پروگرام اور مقصد کے تحت اپنے سیکڑوں ساتھیوں کے ساتھ گرفتاری اور جیل کی ہیبت کو دور کیا۔ میرے والد نے مجھ کو بتایا کہ کوچہ چیلان سے جامع مسجد تک دونوں جانب مکانوں کی چھتوں پر عورتوں مردوں اور بچوں کا ایسا پرجوش منظر نظر آتا تھا کہ ہمارے اندر یہ احساس جاں گزیں ہو گیا تھا کہ جامع مسجد پہنچتے ہی ہم کو آزادی مل جائے گی۔ سچ جانئے تو جیل کا ڈر ہندوستانی عوام کے دل سے نکل گیا تھا اس کے بعد کانگریس کی ہر تحریک میں آزادی کے پروانے خوشی خوشی جیل جایا کرتے تھے، یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ ترک موالات کی تحریک کے شروع میں ہی آصف صاحب نے سب سے پہلے بیرسٹری کی ڈگری واپس کی۔

آصف صاحب ایک مشترک تہذیب کے نمائندہ تھے اور اُن کی سیاسی بصیرت کا اندازہ اس خط سے کیا جاسکتا ہے جو انھوں نے گجرات جیل سے ملّا واحدی صاحب کو لکھا تھا اور مشورہ دیا تھا کہ ہندوستان کی مشترک تہذیب کو اُبھارا جائے غالباً یہ زمانہ ۱۹۴۱ء کا

ہے ۔ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ مسلم لیگ نے مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور ریزولیشن پاس کیا جو سال ڈیڑھ سال بعد پاکستان ریزولیشن کے نام سے مشہور ہوا۔

آصف صاحب لکھتے ہیں کہ :

"کہ ہندوستان کی مرکب تہذیب کو ابھارا جائے چاہے ہندوستان ایک رہے یا ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم ہو جائے اس مرکب تہذیب کا تقاضا برقرار رہے گا اور اگر اس کے دس ٹکڑے بھی بن جائیں تو ہمسایوں کو سیاست اور تدبر رواداری اور میل ملاپ پر مجبور کریں گے لڑیں گیں بھی تو کسی دن صلح کرنی پڑے گی اور اس مرکب تہذیب کا نقشہ ہمیشہ اپنی سرحدیں وسیع کرتا رہے گا جو مفکر اس حقیقت سے چشم پوشی کرتا ہے وہ آنے والی دنیا کا مواخذہ مول لیتا ہے۔"

اب یہ کام دیکھنا ہمارا ہے کہ آج ہم ایک ایسی مشترک تہذیب کو اُبھارنے میں کتنے ایماندار ہیں جو مصنوعی حدبندیوں میں پھیلے ہوئے شک وشبہات کے جالوں کو صاف کردے۔

آصف صاحب عبوری سرکار میں ریلوے کے وزیر رہے۔ ان کو ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ہندوستانی سفیر مقرر کیا گیا ــــ آزادی کے بعد اڑیسہ کے گورنر پھر سوئٹزرلینڈ میں سفیر مقرر ہوئے۔ اُن کا انتقال بون (سوئٹزرلینڈ) میں جمعہ کے دن ۲ اپریل ۱۹۵۳ء کو ہوا۔ موت سے ایک دن پہلے اُن کی بیگم ارونا آصف علی بون پہنچ گئی تھیں ان کی نعش ۶ ــ ۷۔ اپریل کی درمیانی رات کو ہوائی جہاز سے دہلی لائی گئی اجمیری دروازہ سے جنازہ توپ گاڑی پر رکھا گیا وہاں سے اسے نظام الدین لایا گیا جہاں وہ اپنے خاندانی قبرستان میں سپرد خاک کردیے گئے۔

دہلی کی سیاسی تاریخ میں اُن کے گہرے نقوش ہیں۔ اگرچہ وہ صف اول کے قومی رہنماؤں میں سے ایک تھے لیکن اپنی وضعداری کی بندشوں کی وجہ سے میدان سیاست میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد سے آگے قدم نہ رکھا ــــ

جیسے جیسے آزادی کی منزل قریب آئی۔ اُن سے دِلّی دور ہوتی چلی گئی۔ پتہ نہیں کیوں؟

علامہ مولانا واصف دہلوی

آغا محمد طاہر دہلوی

المتوفا ۱۹۵۷ء

راقم الحروف نے آنکھ اس وقت کھولی جب کہ دہلیٔ مرحوم کے باعظمت و مقدس آثار میں سے کچھ تھوڑے سے بچے کھچے اور اجڑے بچھڑے آثار باقی رہ گئے تھے۔ شہر شاہجہاں آباد کا اجڑا ہوا کھنڈر عظمتِ رفتہ کا پتہ دے رہا تھا۔

از نقش و نگارِ در و دیوار شکستہ
آثار پدیداست صنادیدِ عجم را (عرفی)

بیسویں صدی عیسوی کی ابتدائی زمین دہائیاں اپنے اندر کچھ تھوڑی سی نشانیاں پرانی تہذیب و ثقافت اور پرانی شخصیتوں کے لیے ہوئے تھیں۔ حکیم اجمل خاں، نواب سراج الدین احمد خاں سائلؔ، آغا شاعر قزلباش، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا عبدالحق حقانی، نواب سعید الدین احمد خاں طالبؔ، پنڈت امرناتھ ساحرؔ، پنڈت دتاتریہ کیفیؔ، لالہ سری رام مصنف خمخانہ جاوید، چنڈی پرشاد شیداؔ، مولانا راشد الخیری، سید جالب دہلوی، قاری عباس حسین ایڈیٹر اخبار قوم، خواجہ حسن نظامی، سید وحید الدین بیخود دہلوی، جناب زار دہلوی، نواب مصلح الدین خاں، مولانا عبدالرحمٰن راسخ مولانا محمد ابراہیم واعظ دہلوی، مولانا احمد سعید دہلوی، اور کچھ اور ایسی ہی شخصیتیں موجود تھیں۔ ان حضرات کے دیوان خانے ادبی درسگاہیں تھیں۔

علاوہ ازیں جامع مسجد کی سیڑھیاں اور سامنے کا میدان اور ایڈورڈ پارک شام کے وقت کی ایک اچھی تفریح گاہ تھی۔ ہر قسم کا مذاق رکھنے والے شام کو ادھر تفریح کے لیے ضرور آتے تھے۔ ایڈورڈ پارک میں خاصا جمگھٹا رہتا تھا۔ اپنے اپنے مذاق کے مطابق اپنے ہم جنسوں کی ٹولیاں بنا کر بیٹھتے تھے۔ ایک ایک طرف چند شعرا بیٹھے ہیں کچھ شعر و شاعری ہو رہی ہے۔ نکتہ سنجی، سخن فہمی کا مشغلہ جاری ہے ایک دوسرے کو اپنا کلام اور نئی غزلیں سنا رہے ہیں۔ کسی جگہ کچھ طالب علم بیٹھے کسی علمی بحث میں یا صیغے وغیرہ پوچھنے میں مصروف ہیں ایک طرف دیکھو تو بہت بڑا مجمع ہے۔ چار سو پانسو آدمی بیٹھے ہیں۔ ایک آدمی "مسدس حالی" سنا رہا ہے۔ یہ مجمع عوام کے لیے سب سے زیادہ دلچسپ ہوتا تھا۔

دلی میں ایک بہت بڑا طبقہ کارخانوں کے مزدوروں کا تھا۔ لوگ اعزازاً ان مزدوروں کو کرخندار کہہ کر پکارتے تھے۔ کارخانے کیا تھے۔ گھریلو صنعتیں تھیں۔ مختلف قسم کی دستکاریاں تھیں تارکشی کا کارخانہ، دبکی کا کارخانہ، کلابتون کا کارخانہ، گوٹہ کناری کا کارخانہ، پیچک بننے کا کارخانہ، نگینے جڑنے کا کارخانہ۔ گھروں میں عورتیں بہت سی دستکاریوں میں مشغول رہتی تھیں۔ کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی اکثریت ناخواندہ ہوتی تھی۔ شام کے وقت کی تفریحات میں یہی لوگ زیادہ ہوتے تھے۔ انھیں میں سے بعض لوگ نظمیں یاد کرتے تھے۔ یہ لوگ وہ ہوتے تھے جو لکھنے پڑھنے سے ناواقف تھے۔ ان کی کوئی تعلیم اور سوسائٹی نہیں ہوتی تھی۔ دن بھر کارخانوں میں کام کرتے شام کو باغ میں یا جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جمع ہوتے تھے۔

میں نے گذشتہ سطور میں جس مجمع کا ذکر کیا ہے کہ ایک جگہ بہت سے آدمی جمع ہیں ایک آدمی نظم سنا رہا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہوتے تھے جن کو تھوڑی سی حرف شناسی حاصل ہوتی تھی یا دوسروں سے پڑھوا کر کسی نے پوری "مسدس حالی" یاد کر رکھی تھی۔ کسی نے پوری "مثنوی میر حسن"، کسی نے مولانا محمد حسین فقیر کی نصیحت آمیز نظمیں، کسی نے شیخ سعدی کی "کریما" اور ایسی ہی مختلف نظموں کی کتابیں یا شعرا کی غزلیں یاد کرتے تھے۔ شام کو باغ میں جمع ہو کر بیٹھتے تھے۔ بہت روانی اور صحت الفاظ کے ساتھ سناتے تھے۔

ایک آدمی نے مسدس حالی سنانی شروع کی۔ پندرہ سولہ بند سنانے کے بعد خاموش ہو گیا۔ دوسرے نے مثنوی میر حسن پڑھنی شروع کی۔ کچھ تھوڑا سا پڑھنے کے بعد وہ خاموش ہوا تو تیسرے نے کچھ اور سنانا شروع کیا۔ اس طریقے سے چار پانچ آدمی خوش الحانی اور اچھے ڈھنگ کے ساتھ سناتے تھے۔ اور کمال یہ ہے

کہ اتنا اچھا یاد کرتے تھے کہ کہیں بھولتے نہیں تھے۔ روانی کے ساتھ پڑھتے چلے جاتے تھے۔ جس نے جتنا پڑھا ہے دوسرے دن اس سے آگے پڑھتا تھا۔ یہ عوامی مجلسوں کا معیار اور شان تھی۔ باغ میں روزانہ اس قسم کا مجمع ہوتا تھا۔

جامع کی سیڑھیوں پر بہت سی خرافات کے ساتھ واعظ کھڑے ہو کر وعظ بھی کہتے تھے۔ ایک صاحب تھے حافظ محمد فضل ٹوپی والے بالکل ناخواندہ۔ نہ لکھنا جانتے تھے نہ پڑھنا۔ مگر حافظہ بڑا زبردست تھا۔ مولانا عبدالرحمٰن راسخ اور مولانا احمد سعید کے وعظ پابندی سے سنتے رہتے تھے۔ وعظ ان کو سنتے سنتے یاد ہو گئے تھے۔ اور وہی وعظ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر سنایا کرتے تھے۔ اسی طرح اور بھی چند حضرات تھے جو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر وعظ کہا کرتے تھے۔

غرضیکہ بیسویں صدی کا یہ ابتدائی زمانہ بہت سے جواہرات اپنے اندر رکھتا تھا۔ فرقِ مراتب ضرور ہے لیکن کسی نہ کسی حیثیت سے کچھ شخصیتیں بے نظیر اور بے مثال تھیں۔ انھیں بقیۃ السیف نشانیوں میں سے ایک آغا محمد طاہر دہلوی کی ذات گرامی تھی۔ یہ مولانا محمد حسین آزاد کے پوتے تھے۔ یہ غالباً باقاعدہ شاعر تو نہیں نہیں تھے لیکن اعلیٰ درجہ کے سخن فہم، اُردو زبان اور لغت میں محققانہ بصیرت کے حامل تھے۔ ان کا ایک شعر کسی نے سنایا تھا:

وہ پلٹ کے پھر نہیں آئیں گے یہ عیاں ہے طرزِ خرام سے
کوئی گردش ایسی بھی اے فلک جو ملا دے صبح کو شام سے

آغا محمد طاہر کے پردادا مولانا محمد باقر تھے وہ دہلی سے ایک اخبار نکالتے تھے جس کا نام "دہلی اُردو اخبار" تھا۔ مولانا باقر کی تحریریں بیباکانہ اور بے لاگ ہوتی تھیں۔ نظر بہت وسیع اور طبیعت حریت پسند تھی۔ ان کا قلم انگریزوں کے خلاف جہاد کے لئے وقف تھا۔ طبیعت کے اندر مذہبی رواداری بہت تھی۔ انگریزوں کی غلامی کا ان کے دل و دماغ پر بہت اثر تھا۔ اسلام کے خلاف عیسائیوں کا پروپیگنڈا کھٹکتا تھا۔ اس کو بے اثر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ تعلیم کے زبردست حامی تھے علم و ادب سے گہرا تعلق تھا۔ مذہبی اختلافات کو کم سے کم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

مولانا کے اجداد ہمدان (ایران) کے باشندے تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ملتا ہے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے: مولانا محمد باقر ابن اخوند محمد اکبر ابن اخوند محمد اشرف ابن اخوند محمد عاشور

ابن اخوند محمد یوسف ابن اخوند محمد ابراہیم ہمدانی۔

اخوند محمد عاشور ہمدان سے کشمیر آئے تھے۔ اور یہاں ان کے فرزند اخوند محمد اشرف پیدا ہوئے۔ اخوند محمد اشرف دہلی آئے اور مستقل سکونت اختیار کرلی۔

دہلی میں ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو جنگ آزادی شروع ہوئی۔ پہلی کھیپ میں مولانا باقر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے 'دہلی اُردو اخبار' ہی کو نہیں بلکہ خود کو بھی اس جنگ کے لیے وقف کردیا تھا۔ انگریزوں کا مخبر جیون لال لکھتا ہے ۱۷ مئی۔ آج کے دن بادشاہ نے مولوی باقر اور مولوی عبدالقادر کو باریاب ہونے کی عزت بخشی کیونکہ انھوں نے اپنے فرائض منصبی کو نہایت ذہانت اور بہادری سے سرانجام دیا تھا..... الخ

مولانا باقر میدان جنگ میں دشمنوں کے دانت کھٹے کرنے کے ساتھ باغیانہ مضمون اپنے اخبار میں شائع کرتے تھے۔

دہلی کی مشنریوں کے سرغنہ دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر تھے۔ جو اپنے اثرات اور حسنِ اخلاق سے ہندوستانیوں کو عیسائی مذہب کی طرف راغب کرتے تھے۔ ٹیلر کے اور دوسری مشنریوں کے مولانا باقر بھی خلاف تھے۔ وہ اپنے اخبار میں مشنریوں کے خلاف لکھتے رہتے تھے۔ اس بنا پر ٹیلر صاحب اور مولانا باقر کے درمیان سخت کبیدگی پیدا ہوگئی۔ جب ۱۸۵۷ء میں دہلی میں جنگ آزادی شروع ہوئی تو ٹیلر صاحب مولانا کے گھر پہونچا دیے گئے۔ کیونکہ مجاہدین کو ٹیلر صاحب کی وہاں موجودگی کی خبر ہوگئی تھی اس وجہ سے مولانا کے گھر پر مجاہدین نے یلغار کی تھی۔ مولانا نے اس یلغار کی وجہ سے ٹیلر صاحب کو ہندوستانی لباس پہنا کر چلتا کیا۔ جب یہ بہرام خاں کی کھڑکی کے قریب پہونچے تو لوگوں نے ان کو پہچان لیا اور لاٹھیوں سے مار مار کر ختم کردیا۔

جب انگریزوں نے دہلی کو فتح کرلیا تو ہندوستانیوں کو گرفتار کرنا اور قتل کرنا شروع کیا۔ مولانا باقر صاحب دسمبر ۱۸۵۷ء میں گرفتار کرلیے گئے۔ اور انگریز حاکم نے ان پر ٹیلر کے قتل کا الزام رکھ کر ان کو شہید کردیا۔

ان کے صاحبزادے مولانا محمد حسین آزاد تھے۔ جو یکم جون ۱۸۳۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کی طرح یہ بھی انگریزوں کے خلاف جہاد کرتے رہے۔ انگریزوں کا فتح یاب لشکر مولانا آزاد کے گھر میں گھس گیا۔ یہ یہاں سے بھاگ کر لکھنؤ پہونچے جب یہ معلوم ہوا کہ گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوچکا ہے تو وہاں سے مدراس پہونچے۔ ایک اسکول میں استاد کے طور پر نوکری کرلی۔ چند ماہ ملازمت کرنے کے بعد بمبئی روانہ ہوگئے۔ پھر وہاں سے پنجاب آئے۔ ریاست جیند میں چند مہینے ملازمت کی۔ اور چند مقامات پر ہوتے ہوئے آخر میں لاہور پہونچے۔ لاہور کے محکمہ تعلیم میں ۱۸۶۴ء میں ملازم ہوئے اور مختلف اخبارات

کے ایڈیٹر، سب ایڈیٹر رہے۔ مولانا آزاد کی ادبی حیثیت محتاج تعارف نہیں۔

مولانا آزاد کے فرزند آغا محمد ابراہیم تھے۔ اور یہی آغا محمد طاہر کے والد ہیں۔ آغا محمد ابراہیم کی پیدائش بھی لاہور میں ہوئی۔ اور بعض واقف حضرات کے قول کے مطابق آغا محمد طاہر کی پیدائش بھی لاہور کی ہے۔ سالِ ولادت کے بارے میں کوئی مستند روایت تو نہیں مل سکی لیکن بوقت وفات ان کی عمر ۸۰ سال تھی۔ اس سے اندازہ یہ ہے کہ آغا محمد طاہر کی پیدائش تقریباً ۱۸۹۹ء میں بمقام لاہور ہوئی۔ ان کے والد آغا محمد ابراہیم دہلی میں مصنف ہوکر آگئے تھے۔ ان کے اہل و عیال بھی دلی آگئے۔ اور غالباً یہ نقل وطن ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء میں ہوا۔

یہ صحیح طور پر نہیں معلوم کہ آغا محمد ابراہیم جب دلی آئے تو کون سے محلے میں سکونت اختیار کی۔ ہمیں صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ آغا محمد طاہر کا ذاتی مکان کوچہ چیلان میں تھا۔

۱۹۴۷ء میں آغا طاہر کے اہل و عیال پاکستان چلے گئے۔ اور آغا صاحب دلی میں تنہا رہ گئے۔ آغا صاحب کے دو لڑکے تھے۔ آغا محمد حسن اور آغا محمد حسین۔ ایک فرزند کا پاکستان میں انتقال ہوگیا تھا جس کے صدمے سے آغا صاحب بالکل مرجھا گئے تھے ایک فرزند آغا محمد حسین انگلینڈ میں موجود ہیں۔

آغا طاہر کے ذاتی مکان پر بھی لاہور سے آئے ہوئے ایک دوست کا قبضہ ہوگیا۔ آغا صاحب کا یہ آخری دور بہت پریشانی اور مایوسی کا گذر رہا تھا۔ دلی میں صرف وہ تنہا رہ گئے تھے۔ خاندان کے تمام افراد یہاں سے جا چکے تھے۔ طبیعت مضمحل رہتی تھی۔ ان کے ایک دوست علی گڑھ میں تھے۔ مجید یامین صاحب۔ ان سے ملنے کے لئے آغا صاحب وہاں جاتے رہتے تھے۔ اور بسا اوقات علی گڑھ کا قیام طویل ہوجاتا تھا۔ دلی آتے تھے تو متفرق مقامات پر ان کا قیام ہوتا تھا۔ آخری دنوں میں یامین صاحب کے صاحبزادے محمد یونس صاحب آغا صاحب کے ساتھ دلی آگئے تھے۔ آغا صاحب نے اپنے دوست سے ان کو اپنا رفیق بنانے کے لئے مانگ لیا تھا کیونکہ تنہا تھے۔ طبیعت گھبراتی تھی۔ ان کے انتقال تک یونس صاحب ان کے ساتھ رہے۔ اس وقت جہاں نما منزل قدیم کے ایک کمرے میں کرایہ پر رہتے تھے۔ ان کے مکان پر جس شخص کا قبضہ تھا اس کے خلاف مقدمہ دائر کیا اور آغا صاحب کے حق میں فیصلہ بھی ہوگیا لیکن افسوس قبضہ لینے سے پہلے آغا صاحب رحلت کر گئے۔

اس مقالے کی تحریر میں یونس صاحب سے بہت مدد ملی۔ علاوہ ازیں مولانا امداد صابری کی کتاب اردو کے اخبار نویس سے استفادہ کیا گیا۔

آغا طاہر شروع میں گوشہ نشین رہے ہوں گے لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد ہم لوگوں سے جان پہچان تعلقات آنا جانا شروع ہوا۔ اب یہ وہ وقت تھا کہ ایڈورڈ پارک کے جمگھٹے اور جامع مسجد کی سیڑھیوں کے اجتماعات ختم ہو چکے تھے۔ انقلاب آچکا تھا۔

واضح ہو کہ ۱۹۴۳ء میں موجودہ اُردو بازار کا نام خواجہ حسن نظامی نے تجویز کیا اور تمام تاجران کتب اور علاقے کے تعلیم یافتہ اصحاب کے محضر نامہ کے ساتھ سرکاری طور پر یہ نام ملا واحدی کی کوشش سے منظور کیا گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ یہاں کتب فروشوں کی متعدد دکانیں قائم ہو چکی تھیں۔ اور تعلیم یافتہ حضرات کو اس بازار سے ایک دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

یہاں ایک کتب خانہ علم و ادب بھی تھا۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے تک اہل علم اور ادبی حضرات وہاں جمع ہوا کرتے تھے۔ بیخود صاحب مولانا راشد الخیری وغیرہ اکثر تشریف لاتے تھے۔ اس کے مالک وصی اشرف خود اور ان کے بھائی ولی اشرف دلّی کے ایک تعلیم یافتہ اور معزز خاندان کے فرد تھے۔ ۱۹۴۷ء میں یہ لوگ چلے گئے۔ اس کے بعد شعراء وغیرہ کا رجحان کتب خانہ عزیزیہ کی طرف ہوا۔ تفریح کے طور پر یہ حضرات وہاں جمع ہو جاتے تھے۔

آغا محمد طاہر شام کو اُردو بازار کی طرف آتے تھے۔ اکثر کتب خانہ عزیزیہ پر ان کی نشست رہتی تھی۔ کبھی کبھی کتب خانہ رحیمیہ پر آبیٹھتے تھے۔

آغا صاحب ایک اچھے صحبت یافتہ متین اور اونچے اخلاق کے مالک تھے۔ ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ جس قسم کی محفل ہوتی تھی مجلس کے ماحول اور مزاج کے مطابق گفتگو کرتے تھے۔ چونکہ بہت وسیع معلومات اور ہر فن میں درک حاصل تھا۔ اس لیے وہ ہر قسم کی محفل میں ممتاز رہتے تھے۔ طبیبوں کی محفل میں گفتگو کرتے تو فاضل طبیب معلوم ہوتے تھے۔ علماء کی محفل میں وہ ایک فقیہ معلوم ہوتے تھے۔ بہت خوش اخلاق اور منکسر المزاج انسان تھے۔

آخری دور میں جب اہل و عیال نے ان کو چھوڑ دیا تھا اور وہ دلی میں تنہا رہ گئے تھے۔ بہت اضمحلال اور اضطراب کا عالم تھا لیکن ان کی اندرونی کیفیت کا چہرے سے اظہار نہیں ہوتا تھا۔ ہائی بلڈ پریشر کی شکایت رہنے لگی تھی۔

ان کو زبان کے لغات اور محاورات پر اتنا عبور حاصل تھا کہ اس کی اصل اور ماخذ بے تکلف

بیان کر دیا کرتے تھے۔ ہر قسم کا لہجہ بنا لیتے تھے۔ ایک روز راقم الحروف کے پاس کتب خانہ رحیمیہ پر آغا صاحب تشریف لائے۔ ان کے ساتھ حکیم محمد کامل بھی تھے۔ بیٹھنے کے بعد دونوں نے پٹھانوں کے لہجہ میں اُردو بولنی شروع کی۔ بڑی حیرت ہوئی۔ سننے والے کو یہ وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ دونوں ہندوستانی ہیں۔ اسی طرح وہ بنگالی اور کشمیری زبان میں اُنھیں کے لہجہ میں بے تکان گفتگو کر لیتے تھے۔

آغا صاحب کچھ چھوٹا سا کتابوں کا کاروبار گھر میں ہی کرتے تھے۔ تاجران کتب کو خود ہی کتابیں پہونچا دیا کرتے تھے۔ بل کی ادائیگی میں ایک تاجر بہت زیادہ نادہند واقع ہوئے تھے۔ ایک روز آغا صاحب نے ان سے مطالبہ کیا کہ بھئی خرچ کے لیے ضرورت ہے بل ادا کر دو۔ ان صاحب نے کہا آغا صاحب آپ یوم الجزار کو مانتے ہیں یا نہیں؛ آغا صاحب نے جواب دیا ہاں مانتا ہوں۔ ایک دن سب کو پیش ہونا ہے۔ اعمال کا بدلہ سب کو دیا جائے گا۔ ان صاحب نے کہا کہ وہاں ایک نیکی کا ستر گنا بدلہ دیا جائے گا۔ وہیں لے لینا۔ یہ ایک اچھا یا ستر اچھے ؛ آغا صاحب نے کہا وہاں تو مجھے ایک بھی نہیں مل سکے گا۔ لمبے لمبے ہزاروں ہاتھ تمہارے گریبان پر ہونگے۔ میرا یہ چھوٹا سا ہاتھ اس بھیڑ میں وہاں پہونچ بھی نہیں سکے گا۔ بھئی مجھے تو تم واجبی ہی دیدو۔ مجھے ستر گنا نہیں چاہیئے۔

ایک روز اپنے معمول کے مطابق شام کو اُردو بازار آئے۔ کتب خانہ عزیزیہ میں بیٹھ گئے۔ کچھ اور احباب بھی جمع تھے۔ آغا صاحب سست اور نڈھال سے معلوم ہو رہے تھے۔ اور اپنی عادت کے خلاف خاموش بیٹھے رہے۔ احباب نے پوچھا کہ آغا صاحب کیا حال ہے۔ کہنے لگے بھئی کچھ نہ پوچھو حال بہت بُرا ہے۔ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ لوگوں نے کہا کچھ تو کہئے۔ بھئی نہ پوچھو تو اچھا ہے نہ کہنا ہی بہتر ہے۔ حاضرین نے اصرار کیا۔ کہنے لگے۔ رات کو ایک خانقاہی مزاراتی آدمی میرے پاس آ گیا تھا۔ اس نے اپنی پیری مریدی کی باتیں شروع کیں۔ اور تمام رات اپنے پیر صاحب کی تعریف و توصیف میں قصیدہ خوانی کرتا رہا۔ ان کی کرامات بیان کرتا رہا۔ میں بہت کسمساتا رہا بہت کچھ پہلو بدلتا رہا۔ کبھی مجھ پر غشی طاری ہو جاتی تھی۔ مگر اس نے میری پریشانی کو بالکل محسوس نہ کیا۔ غرضکہ وہ مجھ کو ساری رات رگڑتا رہا۔ جب سویرا ہو گیا۔ اور اذان کی آواز آئی تو میں نے اس سے کہا میاں صاحب اب تو پو بھی پھٹ گئی۔ اب تو مجھے چھوڑ دو۔ جب وہ رخصت ہوا۔ تو بھئی آج تو میرا حال ناگفتہ بہ ہے۔ رات بھر جاگنے کی بہت تھکن ہے۔

اُردو زبان پر آغا طاہر نہ صرف اس وجہ سے کہ اہلِ زبان تھے مکمل طور پر حاوی تھے بلکہ زبان داں بھی تھے۔ زبان کی لطافت الفاظ کے مواقع استعمال سے گہری واقفیت پر منحصر ہے اور یہ ملکہ اسی شخص کو حاصل ہوتا ہے جو اہلِ زبان ہونے کے ساتھ ساتھ محقق بھی ہو۔ الفاظ و معانی کی حقیقت سے واقف ہو۔ آغا طاہر میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود تھی اور داغ نے جو کہا ہے:

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ

آغا صاحب اس مصرع کے پورے مصداق تھے۔

ایک موقعہ پر جگر مرادآبادی کسی مشاعرے کے سلسلے میں دہلی آئے ہوئے تھے۔ آغا صاحب سے اُردو بازار میں ملاقات ہوئی جس جگہ اب فلورا ہوٹل ہے وہاں تین پہلوان کا ہوٹل تھا۔ آغا صاحب ان کو ہوٹل میں چائے پلانے کے لئے لے گئے۔ جگر صاحب نے غزل سنائی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ اور انھوں نے آغا صاحب کا حال پوچھا۔ اور پوچھا کہ آج کل کہاں سکونت ہے؟ آغا صاحب نے اکبر الہ آبادی کا یہ شعر پڑھا۔

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا

کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جاکر

شاید آغا صاحب کے ذہن میں اپنے بے گھر ہونے کا تصور ہوگا۔ جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے۔ کوئی قریبی عزیز رشتہ دار یہاں نہیں رہا۔ اور گھر بھی قبضہ سے نکل گیا۔ اب ان کے انتقال کا واقعہ یونس صاحب نے سنایا۔ قادرِ مطلق کی بے نیازی کس قدر عبرت انگیز ہے۔

اُن دنوں جہاں نما منزل کے ایک کمرے میں کرایہ پر رہتے تھے۔ یونس صاحب بھی ان کے ساتھ رہتے تھے۔ کھانا اکثر آغا صاحب اپنے ہاتھ سے ہی تیار کرتے تھے۔ اس روز بھی کھانا خود ہی پکایا۔ دوپہر کا کھانا کھا کھلا کر سو گئے۔ تھوڑی دیر میں ان کے گلے سے ایک غیر معمولی آواز سنائی دی۔ یونس صاحب نے اُٹھ کر دیکھا۔ بلایا جلایا تو آغا صاحب اُٹھے نہیں اسی حالت میں قے ہوئی اور بیہوشی طاری ہوگئی۔ میر مشتاق احمد کو اطلاع دی گئی۔ میر صاحب آگئے اور آغا صاحب کو ٹیکسی میں ارون ہسپتال روانہ کیا۔ اور خود بھی ہسپتال پہونچ گئے۔ ڈاکٹروں نے بہت کچھ تدابیر کیں مگر جانبر نہ ہوسکے۔ دماغ کی رگ پھٹ گئی تھی۔ اسی دن یعنی مورخہ ۲۳ رجون، ۱۹۵۰ء کو رات کے دس بجے قفسِ عنصری

سے پرواز کر گئی۔ اور اُردو زبان کا یہ بلبل ہزار داستان خاموش ہو گیا۔ ہسپتال سے ۲۴ر جون کو نعش لائی گئی۔

خوش است عمر دریغا کہ جاودانی نیست
بس اعتبار بریں پنج روز فانی نیست
عمل بیار و علم بر مکش کہ مرداں را
رہے سلیم تر از کوئے بے نشانی نیست

(سعدی)

بیرونِ دہلی گیٹ میدان میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ دو نمازیں ہوئیں۔ ایک سنی عالم نے پڑھائی اور ایک شیعہ عالم نے۔ اور جدید قبرستان نزد کوٹلہ فیروز شاہ میں تدفین عمل میں آئی۔

ملکِ عدم کی سمت رواں کائنات ہے
باقی ہے جس کی شان وہی ایک ذات ہے

اور ہر چیز کی ابتدا اور انتہا اسی کے نام سے ہے۔

ھُو

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

مسز اندرا گاندھی

ان کی باتوں میں گلوں کی خوشبو

اگر میرا بس چلے تو میں تمام نیلگوں آسمان پر جلی اور سنہرے حروف میں صرف یہ جملہ لکھ دوں :

"اگر میں قوم کی خدمت کرتے ہوئے مر بھی جاؤں تو میرے لیے یہ بڑے فخر کی بات ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ میرے خون کا ہر قطرہ اس قوم کے فروغ میں کام آئے گا اور اسے مستحکم اور متحرک بنانے میں کار آمد ثابت ہوگا۔"

یہ جملہ مستقبل کا اشاریہ بھی ہے۔ تمنا اور آرزو بھی۔ اس میں ہندوستانِ قدیم کے اس ذہن کی ترجمانی بھی ہے جو موت کی حقیقت سے انکار کرتا ہے۔ اس میں یقین کی وہ دولت بھی پوشیدہ ہے جو سمجھتا ہے کہ زندگی موت پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ وہ تو دم لینے کے لیے ایک لمحہ ہے۔ اس میں جون آف آرک کی سی تمنا اور آرزو بھی چھپی ہوئی ہے جو شہادت سے کم درجہ کی موت پر راضی نہیں ہوتی۔

یہ آرزو جو مسز اندرا گاندھی بچپن سے اپنے سینہ میں چھپائے ہوئے تھیں بالآخر ۳۱ / اکتوبر ۱۹۸۴ء کو پوری ہوئی جب ان کے دو محافظین نے بتیس گولیوں سے ان کے جسم اطہر کو چھلنی کر دیا اور وہ فوراً جان بحق ہو گئیں۔

اس وحشیانہ قتل پر کئی مہینے گزر چکے ہیں لیکن اب بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام روشنیاں

گل ہو گئی ہیں۔ چاروں طرف اندھیرا ہے یہ آسمان، یہ زمین۔ یہ ستارے سب بے حس و حرکت ہیں۔ وقت کی رفتار تھم گئی ہے۔ تمدن کی نبض ٹھہر گئی ہے۔ ہمارے دل کی دھڑکن رک گئی ہے۔ ہر طرف اداسی ہی اداسی ہے۔ بےکسی ہی بےکسی ہے ع

سینہ خالی، آنکھیں ویراں، دل کی حالت کیا کہیے

یہ کیوں ہے؟ آسمان نے کس لیے خون کے آنسو بہائے ہیں۔ یہ ایک ایسے شخص کا ماتم ہے جس کا اٹھنا بیٹھنا۔ رفتار و گفتار و کردار اور زندگی کا ہر لمحہ آج سے نہیں، بچپن سے ہندوستان کی ہندوستان کی خدمت کے لیے وقف تھا جس نے مہاتما گاندھی، موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو کی آغوش میں پرورش پائی تھی اور جو دنیا کے ہر معیار سے بہت غیر معمولی ہستیاں تھیں۔ اندرا جی نے ٹیگور اور سی۔ وی۔ رمن سے خوشہ چینی کی تھی۔ آزادی کی تحریک میں پورا حصہ لیا تھا۔ جیل کاٹی تھی اس کی صعوبتیں اٹھائی تھیں۔ وہ ہماری اُمیدوں اور آرزوں کا مرکز اور محور تھیں۔ انھوں نے ہندوستان کو سربلند کیا۔ اور اس کو عالمی طاقتوں کی صف میں جگہ دلوائی انھوں نے غریبوں کو اونچا اٹھایا۔ ان کے ساتھ دردمندی کا سلوک کیا، وہ سلوک، جو مائیں اپنے بچوں کے ساتھ کرتی ہیں۔ انھوں نے اقلیتوں کو سرفراز کیا۔ ہندوستان کو نیوکلر کلب میں شامل کیا۔ جمہوریت اتحاد اور سیکولرازم کی بنیادیں مضبوط کیں۔ ملک کو ایک نیا سائنسی مزاج دیا۔ ان ہی کی بدولت انقلاب سبز Green Revolution رونما ہوا۔ ناوابستہ ملکوں کی سربراہی کی اور بتا دیا کہ وہ دنیا کے نقشے میں بہت ہی اہم ہیں اور ان کو نظر انداز کرنا تاریخی غلطی اور حق ناشناسی ہے انھوں نے دنیا میں امن اور بقائے باہم کی جدوجہد کی اور بالآخر ہندوستان کی سالمیت اور سیکولر کردار کے لیے اپنی جان دے دی۔

آپ کو یاد ہوگا۔ چند سال پہلے تک ہماری زیست PL 480 پر تھی اور ہم ایک مٹھی بھر اناج کے لیے دوسروں کے دست نگر اور محتاج تھے۔ یہ مسز گاندھی کی جان غیور پر بڑا ستم تھا انھوں نے PL ۴۸۰ کو ختم کیا اور انقلابِ سبز کا منصوبہ بنایا۔ آج اِس ۱۹۸۵ء میں ہمارے پاس اتنا غلہ موجود ہے کہ ہم ۷۰۰ ملین آدمیوں کو کھلانے کے بعد بھی، تین کروڑ ٹن غلہ باہر بھیج سکتے ہیں وہ اس بات کو اچھی طرح جانتی تھیں کہ آزادی کی بنیاد اسی وقت مضبوط ہو سکتی ہے جب ملک کو

اقتصادی آزادی حاصل ہو اور وہ روٹی کے معاملہ میں بھیک نہ مانگے۔

اندرا جی کے زمانے میں ہم نے جو ترقی کی ہے۔ جن رفعتوں اور بلندیوں کو چھوا ہے اس پر دشمنوں کو غصہ اور ہم وطنوں کو حیرت ہے۔ آج ہمارے پاس سائنس دانوں اور ٹکنیکی ماہرین کی دنیا میں سب سے بڑی تعداد موجود ہے جن کی لیاقت کا اعتراف نہ صرف ہندوستان میں بلکہ اس کے باہر بھی ہوا ہے مسز گاندھی کے زمانے میں پہلا ہندوستانی اسپٹنک چھوڑا گیا اور راکیش شرما نے خلاء کی سیر کی۔ واقعی، عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں۔ اصل میں یہی وہ بات ہے جو حاسدوں سے برداشت نہ ہو سکی اور ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر وہ دلوں میں کھٹکنے لگیں۔

اندرا جی کی ملکی اور عالمی بصیرت اور خدمات پر علیحدہ علیحدہ کتابیں لکھی جائیں گی لیکن میں نے ان کو صرف ایک انسان کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی مہربانیوں میں ان کی بڑائی کو ڈھونڈا ہے۔ ان کی شرافت، ان کی دردمندی، ان کی سیوا اور خدمت خلق کے جذبے سے ان کی عظمت کا اندازہ لگایا ہے۔

بس ان کا صرف ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ اس سے زیادہ میں کچھ اور کہہ بھی نہیں سکتا۔ جذبات کی فراوانی، مجھ سے صرف خاموشی کا مطالبہ کرتی ہے۔ دوسرے میں اگلے وقتوں کا آدمی ہوں۔ سرا میں شیشہ فروبند کا قائل ہوں لیکن یہ بات ایسی اور اتنی اہم ہے کہ بن کہے رہا بھی نہیں جاتا۔

جس زمانہ میں بنگلہ دیش کی آزادی کی تحریک چل رہی تھی میں جرمنی میں تھا۔ وہاں معلوم ہوا کہ التفات بھائی پورے مشرقی پاکستان کے کنٹرولر جنرل مقرر کئے گئے ہیں۔ جس تیزی سے یہ تحریک بڑھ رہی تھی اسی شدت سے آزادی کے مجاہدوں پر ظلم ہو رہے تھے اور لندن ٹائمس میں Mascarenhas کے قلم سے اس ظلم و ستم کی داستانیں پڑھ کے دل نکلا جاتا تھا۔ میں نے ہندوستان آگران مظالم کے خلاف ایک مضمون بھی لکھا تھا۔ Breathes there the soul so dead کیا کوئی اتنا بے حس ہو سکتا ہے؟ آخر ایک روز یہ خبر ملی کہ ڈھاکہ کا سقوط ہو گیا اور پاکستانی فوجوں نے ہتھیار ڈال دئے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بہت سے فوجی اور حکام غالباً ۹۰ ہزار قید ہو کر ہندوستان آ گئے ہیں اور ان کا ایک کیمپ رڑکی میں بھی ہے۔ بنگلہ دیش کی تحریک

بھی عجیب تحریک تھی اس میں ایک ملین آدمی مارے گئے۔ دس ملین ہجرت کر گئے اور بیس ملین بے گھر ہو گئے۔

اس پورے عرصہ میں التفات بھائی کی مطلق کوئی خیریت نہیں معلوم ہوئی۔ ان سے رشتے سے زیادہ دوستی کا تعلق تھا۔ ہر وقت ان کی اچھی اچھی باتیں۔ وہ مزے مزے کی حکایتیں یاد آتی تھیں اور طبیعت بے چین ہو جاتی تھی۔

میں اس بات کا برسرعام اقرار کرنا چاہتا ہوں کہ میں بڑا گنہگار آدمی ہوں۔ ہفتوں اور مہینوں نماز بھی نہیں پڑھتا۔ اور اگر پڑھتا ہوں تو گنڈے دار، کبھی صبح کی پڑھ لی کبھی عشا کی پڑھ لی۔

ایک روز صبح کو بہت سویرے آنکھ کھل گئی۔ میں نے وضو کی نماز پڑھی اور دعا کی کہ اللہ تعالیٰ التفات بھائی کو اپنے حفظ و اماں میں رکھے اور وہ خیریت سے ہوں۔

خدا کی رحمت کے قربان جایئے ابھی صبح کے صرف چھ بجے تھے کہ کسی نے گھنٹی بجائی میں دروازے پر گیا۔ دیکھا کہ ایک فوجی افسر کھڑے ہیں۔

انھوں نے پوچھا آپ فاروقی صاحب ہیں۔ آئی لے فاروقی کے Cousin۔ "جی ہاں"

" میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

بسم اللہ — یہاں ڈرائینگ روم میں آجایئے۔

انھوں نے فرمایا "کہ آپ کے بھائی میرے پاس رڑکی کے کیمپ میں ہیں۔ وہ اتنے اچھے اور پیارے آدمی ہیں کہ میں بے اختیار اور مجبور ہو گیا کہ اپنے اوپر اعتراض مول لوں اور ان کی خیریت آپ کو سناؤں۔ ان کا خط بھی لایا ہوں۔ پروفیسر صاحب! وہ دل کے مریض ہیں ان کو دواؤں کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "اس خط میں انھوں نے دواؤں کے نام نہیں لکھے۔ اچھا میں Red Cross کے ذریعہ دوائیں بھجواؤں گا۔ فی الحال یہ روپے۔ یہ کتابیں آپ ان کو دے دیں اور میرا سلام پہنچا دیں چائے حاضر ہے۔"

کہنے لگے" معاف کیجئے گا۔ وقت بہت ہی کم ہے میں چائے نہیں پی سکتا ورنہ اسی بہانہ آپ کے پاس اور بیٹھتا۔" وہ موٹر سائیکل پر بیٹھے اور چلے گئے؛

میں نے مسز گاندھی کو کبھی کوئی زحمت نہیں دی تھی ۔ دوسرے ان سے مراسم بھی تھوڑے سے تھے ۔ ایسے مراسم اُن کے کم ازکم ایک لاکھ لوگوں سے ہوں گے ۔ لیکن اس وقت دل پر قابو نہیں رہا میں نے مسز گاندھی کو خط لکھا کہ التفات بھائی میرے عزیز قریب ہیں ۔ قلب کے مریض ہیں ان کو دہلی کے کسی کلینک Clinic میں میرے خرچ پر داخل کر دیجئے یا اچھا تو یہ ہے کہ ان کو کراچی ان کے بچوں کے پاس بھیجدیجئے ۔ خط کے پہنچتے ہی مسز گاندھی نے ان کی رہائی کا انتظام کیا اور انٹرنیشنل ریڈکراس کے جہاز کے ذریعہ انھیں کراچی پہنچوا دیا ۔

عید کا دن تھا ۔ جنرل مانک شاہ کا ٹیلی فون آیا کہ آپ کے بھائی دہلی میں ہیں ۔ان کے کراچی بھیجنے کا انتظام کر دیا گیا ہے اگر آپ ان سے ملنا چاہیں تو اس جگہ آ کر مل لیں ۔میری بیوی مرحومہ اور پروین ملنے کے لیے گئے، اور وہ اتنی دیر صرف مسز گاندھی کا کلمہ پڑھتے رہے اور کہتے ہے کہ میں معاملہ کے ہر پہلو پر غور کرتا ہوں تو میری روح دو زانو ہو جاتی ہے ۔ یہ کام کوئی پرائم منسٹر نہیں کر سکتا تھا ۔صرف مسز گاندھی کر سکتی تھیں ۔ ان کی دردمندی اور انسان دوستی کا جواب نہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ نیکی اور بھلائی کا فرشتہ ہیں جو صرف دکھ درد کو دور کرنے اور آنکھوں سے آنسو پوچھنے کے لیے زمین پر اتری ہیں ۔

یہی جملے انھوں نے دوسرے دن، بھرائی ہوئی آواز میں، ریڈکراس انٹرنیشنل کے جہاز میں بیٹھتے وقت کہے تھے ۔

باہم نگریستیم و گریستیم و گزشتیم

مسز گاندھی یہ بات اچھی طرح جانتی تھیں کہ انسانی شرف کا دارومدار دل سوزی اور دردمندی پر ہے ۔آسمان پر اڑنا اتنا مشکل نہیں، جتنا زمین پر چلنا مشکل ہے ۔ بر زمین رفتن چہ دشوارش بود

میری ایک شاگرد تھیں ۔بہادر شاہ ظفر کے خاندان کی ۔ ان کے مراسم مسز گاندھی سے بھی تھے ۔ وہ اکثر اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ آجاتیں اور گھنٹوں گفتگو ہوتی ۔ ان کی باتوں میں بڑی نرمی، بلا کی شائستگی اور دہلی کی تہذیب کا سارا حسن تھا اس لیے وہ جب تشریف لاتیں تو پورا گھر ان کی باتیں سننے کے لیے جمع ہو جاتا وہ بار بار جانے کا ارادہ کرتیں اور ہم لوگ اصرار کر کے ان کو بٹھا لیتے ۔ایک روز وہ اسکوٹر میں اکیلی آئیں ۔ واپسی میں ان کے اسکوٹر کی ٹکر

ایک ٹرک سے ہوئی اور ان کی ٹانگ کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ میں بھاگا ہوا فوراً ان کے مسکن پر پہنچا۔
لیکن مجھ سے پہلے مسز گاندھی کی ایک سکریٹری، ڈاکٹر کے ساتھ موجود تھیں اور ان کا اصرار تھا کہ آپ
ولنگڈن یا ارون میں منتقل ہو جائیں۔ وزیر اعظم نے آپ کے علاج کا پورا بندوبست کر دیا ہے۔

یہ ہے ہماری تہذیب جس کی نمائندہ مسز گاندھی تھیں جس میں صوفی کا قلب گداز عارف کا
وجدانِ صحیح، دانشور کی فکر بیدار سب ہی شامل تھیں۔ اس تہذیب کا سرچشمہ موہنجدارو سے
بھی پہلے پھوٹا تھا اور اس کے نقش کو ان کی شوخیٔ تحریر نے پہلے سے زیادہ دلکش اور دلنواز
بنا دیا تھا۔

میری اور اندرا جی کی ایک عمر تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں ان سے سب سے پہلے کب ملا تھا
لیکن ایک ملاقات جس کا نقش میرے دل پر بہت گہرا ہے وہ ۱۹۳۸ء کی ملاقات کا ہے۔
غالباً ۱۹۳۸ء ہی تھا اگر مجھے غلط یاد نہیں۔ اندرا جی آنند بھون میں اپنی سائیکل لئے کھڑی تھیں
اس زمانہ میں سائیکل اتنی عام چیز نہیں تھی جتنی آج ہے۔ اور وہ بھی عورتوں کی سائیکل میں نے
عرض کیا "بڑی خوب صورت سائیکل خریدی ہے آپ نے"

انھوں نے فرمایا "لیجیے چلا کے دیکھئے۔"
میں نے کہا "میں سائیکل چلانا نہیں جانتا"
فرمایا "میں ابھی سکھا دوں گی۔ بس آپ اس پر بیٹھ جائیے۔"
عرض کیا "ہڈی پسلی ٹوٹ جائے گی حضت۔ مجھے ابھی سالانہ امتحان دینا ہے"
فرمایا "اتنا ڈریں گے آپ، تو سائیکل سیکھ چکے"
واقعی مجھے آج تک سائیکل پر چڑھنا نہیں آیا۔

اندرا جی نے بڑی عارفانہ بات کہی تھی۔ بغیر خطرہ کو مول لیے ہوئے کوئی نفع حاصل نہیں
ہو سکتا۔ ڈر تمام خرابیوں کی جڑ ہے اور وہ شخصیت کو مجروح کر دیتا ہے — گلستانِ سعدی میں
ایک بادشاہ کا قصہ لکھا ہے وہ شام کو کشتی میں بیٹھ کر دریا کی سیر کو نکلا۔ ایک غلام اور ایک حکیم فرزانہ
ساتھ تھا۔ بیچ دریا میں پہنچ کر آسمان پر کالے بادل چھا گئے۔ بجلی چمکنے لگی اور تیز و تند ہوا کی وجہ
سے کشتی بری طرح ہلنے لگی۔ غلام نے مارے ڈر کے کشتی سے بھی زیادہ ہلنا شروع کر دیا۔ بادشاہ کو بہت

برا معلوم ہوا۔ اس نے حکیم کی طرف دیکھا اس نے کہا: حضور اجازت ہو تو میں اس کا علاج کردوں"
حکیم فرزانہ نے غلام کے بال پکڑ کے اس کو پانی میں دو جھونٹے دیے اور پھر کشتی میں بٹھادیا۔
اب اس کا ڈر نکل چکا تھا اور وہ سیر کے درمیان، پوری شام خاموش بیٹھا رہا۔

اس کے بعد اندرا جی سے حیدرآباد ہاؤس میں شاستری جی کے انتقال کے بعد ملاقات ہوئی۔ انھوں نے وزیر اعظم ہونے کے بعد چند اہل علم کو کھانے پر مدعو کیا تھا۔ اس روز وہ بڑی دبلی پتلی اور کم عمر معلوم ہو رہی تھیں لیکن چہرہ پر یقین کا عجیب نور تھا۔ عرصہ کے بعد نیاز حاصل ہوا تھا اس لیے مجھ سے کافی دیر تک باتیں ہوئیں۔ پنڈت جی کی میرے حال پر بڑی عنایتیں تھیں ان کی شفقتوں کا اور ان کے خطوں کا بھی ذکر ہوا۔ فرمایا" بھائی وہ خط تو آپ ہمیں دیدیجیے۔ ہم ان کی سب چیزیں چھاپنے والے ہیں۔" یہ باتیں اتنی دیر تک ہوئیں کہ رفیعہ سجاد ظہیر تلملا اُٹھیں کہنے لگیں " تم گوندانی لے کر آتے ہو۔ ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتے "

پنڈت جی کے خط دل سے الگ کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا اس لیے میں نے وہ خط کئی سال کے بعد اندرا جی کو بھیجے۔ انھوں نے فوراً شکریہ کا خط بھیجا اس میں یہ لطیفہ بھی لکھا کہ آپ فرماتے ہیں کہ یہ خط چار ہیں۔ دراصل تین ہیں۔ ایک پنڈت جی کے سکریٹری کا ہے اور تین اُن کے اپنے ہیں" اس کے بعد اتفاق سے پھر کسی جگہ شرف نیاز حاصل ہوا تو کہنے لگیں " آپ کی گنتی صحیح نہیں۔ وہ خط تو صرف تین ہیں۔ آپ کو میرا خط مل گیا ہوگا۔

مشرق کی تہذیب کا بادل ہزاروں سال سے ہندوستان کی اقلیم کو سیراب کر رہا ہے کتنی بار یہ بادل ابر نیساں بن کر برسا اور اس نے اس سرزمین کا دامن لعل و گہر سے بھر دیا لیکن ۱۹ نومبر ۱۹۱۷ء کو اس بادل نے جو تراوش کی اس نے ہندوستان کے صدف میں ایک گوہر یکتا پیدا کیا جس کو عام لوگوں نے اندرا پریہ درشنی کے نام سے جانا اور جس کی چمک سے دنیا کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔

اندرا گاندھی کی ولادت کے بعد جب آنند بھون میں اسکاچ ڈاکٹر نے موتی لال نہرو کو یہ خوشخبری سنائی کہ آپ کے نہایت خوب صورت پوتی پیدا ہوئی ہے تو وہ خوشی سے اچھل پڑے لیکن ان کی بیوی سروپ رانی نے کہا" واہ لڑکا ہونا چاہیے تھا" موتی لال جی نے فرمایا:

" پگلی کہیں کی! تم دیکھنا جواہرلال کی لڑکی ہزاروں لڑکوں پر بھاری ہوگی۔"

منشی مبارک علی جو رؤسائے اودھ میں سے تھے اور انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں بگڑ گئے تھے اور اب نہرو خاندان کے بزرگوں میں شمار ہوتے تھے۔ اور ہمہ وقت آنند بھون ہی میں رہتے تھے، وہ سخت بیمار تھے۔ اندرا کو ان کے پاس لے جایا گیا۔ انھوں نے دعا دی کہ نومولود سے نہرو خاندان کا نام روشن ہو اور وہ صحیح جانشین ثابت ہو۔ مسز سروجنی نائیڈو نے جواہرلال کو خط میں لکھا: "یہ ہندوستان کے افق پر ایک نیا ستارہ طلوع ہوا ہے۔"

اندرا گاندھی کی پرورش آنند بھون میں ہوئی جہاں تمام دنیا کے عیش جمع تھے۔ زہرہ صبح تھا اور جام بلوریں۔ موتی لال جی اودھ یا اٹلی کے نوابوں کی طرح بسر کرتے تھے۔ لیکن 1915ء سے ان کے بیٹے جواہرلال گاندھی جی کے زیر اثر آگئے تھے۔ جب رولٹ ایکٹ کے خلاف جواہرلال نے ستیاگرہ کا ارادہ کیا تو موتی لال سخت ناراض ہوئے اور جواہرلال کو گھر سے نکالنے پر آمادہ ہوگئے کہ یہ سارنگی بجانا مجھے پسند نہیں۔ لیکن جلد ہی انھوں نے بھی گاندھی جی کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور آنند بھون میں بیس پچیس برس تک برابر جیل جانے اور برطانوی حکومت کے خلاف جدوجہد کا سلسلہ جاری رہا۔

اندرا گاندھی نے تین برس کی عمر سے یہ ہی دیکھا کہ دادا ابا، باپ ماں اور پھوپھی سب ہی جیل کے باشندے ہیں (اور اس زمانہ کی جیل) ناقابل بیان اذیتیں اٹھاتے ہیں انھوں نے انگریزی چیزوں اور انگریزی لباس کو ترک کردیا ہے اور سودیشی پر قناعت کرلی ہے۔ ایک روز ایک عزیزہ اندرا کے لیے جو چار برس کی تھیں! ایک فراک لائیں جو فرانس کا بنا ہوا تھا اور بڑا دیدہ زیب تھا۔ اندوہ نے اس کے لینے سے انکار کردیا کہ ہم تو کھادی پہنتے ہیں۔ وہ چچی بولیں: سودیشی کی خالہ مس سینٹ Miss Saint لیکن یہ گڑیا جسے تم ہر وقت کندھے سے لگائے لگائے پھرتی ہو وہ بھی تو بدیشی ہے۔ اندو اسی وقت چھت پر گئیں اور اس گڑیا کو آگ لگادی لیکن اس گڑیا سے انھیں اس طرح کا لگاؤ تھا کہ ان کی سرمگیں آنکھوں میں، دو بڑے بڑے آنسو بھی ڈبڈبا آئے۔

اندرا نے تین برس کی عمر میں کانگریس کے اجلاس میں شرکت کی اور بچپن سے ایسے لوگوں کی صحبت میسر ہوئی جو واقعی، منتخب روزگار تھے ان میں موتی لال، گاندھی، جواہرلال، ٹیگور

اور مِن کے علاوہ روماں رولاں اور البرٹ آئنسٹائن بھی شامل تھے۔ ان کی چار سال کی عمر تھی کہ وہ موتی لال کی گود میں بیٹھی ہوئی، دادا ابا کے خلاف مقدمہ کی روداد سنتی رہیں۔ گیارہ برس کی عمر میں انھوں نے بچوں کی گاندھی چرخہ سنگھ بنائی اور کتائی بنائی کا ریکارڈ قیام کیا۔ بارہ برس کی عمر میں بوزینہ فوج Monkey Brigade قائم کی جو پولیس کے چھاپوں کی مخبری کرتی تھی اور کانگریس کے کارکنوں کے پیغامات ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتی تھی۔

اندرا پنڈت جی کے ساتھ ۱۳ برس کی عمر میں سیلون بھی گئی تھیں اور وہاں کے لوگوں پر اپنی محبت، اپنی لیاقت اور حب الوطنی کا گہرا نقش قائم کیا تھا۔ میں جب ۱۹۷۲ء میں سری لنکا گیا تھا تو مسز بندرا نائیکا نے مجھ سے کہا تھا کہ مسز گاندھی کو میں کم عمری سے جانتی ہوں۔ وہ بڑی غیر معمولی خاتون ہیں، میں تو ان کے پاؤں کی خاک بھی نہیں۔"

مسز گاندھی نے سوئٹزرلینڈ، الہ آباد، پونے، شانتی نکیتن اور آکسفرڈ میں تعلیم حاصل کی لیکن کہیں پوری نہیں ڈال سکیں۔ اس کی وجہ پنڈت جی کے مسلسل جیل کے سفر، والدہ کی خطرناک علالت اور پھر ۱۹۳۶ء میں ان کا کم عمری میں انتقال اور آخر میں خود اپنی علالت ہے لیکن ڈگریوں سے زیادہ اہم زندگی کا عرفان اور اس کے گرم و سرد کا چکھنا ہے۔ ۱۹۲۸ء سے جیل خانہ میں بیٹھ کر پنڈت جی نے ان کو بہت پیارے خطوط لکھے جو مکتوباتی ادب میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور شائع بھی ہو چکے ہیں۔ باپ کے خط بیٹی کے نام۔ ان خطوں سے اندرا کو معلوم ہوا کہ ہر تاریخ، دراصل بین الاقوامی ہے اور کسی معاملہ کو بھی تنہا۔ سب مسائل سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ان خطوں نے ان کو یہ بھی سکھایا کہ سیرت اور کردار میں اصل چیز درد کا احساس دل کی دولت اور روح کی عفت ہے۔ مسز گاندھی نے جو ماحول پایا تھا اور جو اعلیٰ، غیر رسمی تعلیم حاصل کی تھی اس نے ان کے ذہن میں فراخی، نظر میں وسعت اور دل میں کشادگی پیدا کر دی تھی۔ یہ دولتِ سرمد صرف درد کی شدت اور روح کی پاکیزگی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

اگر کوئی شخص قسمیں کھا کر کہے کہ مسز گاندھی فرقہ پرست تھیں تو میں اسے باور نہیں کر سکتا۔ انھوں نے جون آف آرک کو پڑھا تھا اور ابتدا سے اس کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی تھی۔ گیری بالڈی اور ولیم ٹل Tell کے حالات سے استفادہ کیا تھا۔ مہاتما گاندھی، مسز اینی بسنٹ اور مسز نائیڈو کی گودوں میں کھیلی تھیں جولین کسلے، ایچ جی ویلز، گرودیو ٹیگور اور روماں رولاں کی حاشیہ نشیں

رہی تھیں۔ انھوں نے لاسکی کا ایک ایک لفظ پڑھا تھا۔ ایڈورڈ ٹامسن بیون کرپس اور براک وے کی وہ تحریریں جو سوشلزم سے متعلق تھیں، وہ سب ان کے مطالعہ میں آئی تھیں۔ اتفاق سے بنگال کے گورنر سر جان اینڈرسن شانتی نکیتن میں ان کے کمرے پر آئے اور وہ سوشلزم پر ان کی کتابیں دیکھ کر دنگ رہ گئے اور کہا "یہ بلاشبہ شانتی نکیتن کی سرخ خاتون ہیں" مطالعہ کا بے پناہ شوق تھا۔ وزیراعظم ہونے کے بعد بھی وہ معمولاً رات کے دو ڈھائی بجے تک پڑھتی رہتی تھیں۔

۱۹۴۲ء میں اندرا جی کی شادی فیروز گاندھی سے ہوئی جو ایک غریب پارسی خاندان کے فرد تھے اور یہ برہمن زادی تھیں۔ دولت میں کھیلی تھیں۔ بھوپیش گپتا نے ان سے فیروز کے متعلق پوچھا "آپ ان کو پسند کرتی ہیں؟ کہا "میں ان کو پسند نہیں کرتی۔ اُن سے محبت کرتی ہوں"

یہ شادی بھی قیامت کی تھی۔ تمام کشمیری پنڈت خلاف، تمام قدامت پسند برہمن گھرانے منحرف۔ لیکن اندرا اپنے فیصلہ پر اٹل رہیں۔ گرمیوں میں ہنی مون کے لیے کشمیر گئیں، پنڈت جی کو تار دیا "کاش میں آپ کو کشمیر کی ٹھنڈی ہوائیں بھیج سکتی" انھوں نے فوراً جواب دیا لیکن تمہارے پاس لکھنو اور بنارس کے آم نہیں ہیں۔

۱۹۴۲ء میں گاندھی جی نے کرپس مشن کی سفارشات کو مسترد کر دیا اور فرمایا کہ یہ ایک دیوالیہ بینک کا چیک ہے جس کی تاریخ نکل چکی ہے انھوں نے Quit India کی تحریک شروع کی اور فیروز اور اندرا دونوں الگ الگ جیلوں میں ڈال دیے گئے مسز گاندھی نے نینی جیل کا دلچسپ نقشہ کھینچا تھا۔ در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا۔ ہر جگہ پلاسٹر اکھڑا ہوا۔ چھتوں سے ریت کی بارش۔ تکئے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی قبر کا تعویذ ہیں۔ ایک ایک دن ایک سال کے برابر معلوم ہوتا تھا۔

آزادی کے بعد مسز گاندھی، وزیراعظم نہرو کے ساتھ رہنے لگیں اور ان کا اور ان کے مہمانوں کا اس طرح خیال رکھنے لگیں جیسے وہ ہمیشہ سے یہ کام خوش اسلوبی اور ماہرانہ لیاقت سے انجام دیتی رہی ہوں۔ اسی زمانہ میں ان کو خروشچیف۔ بل گینن، شاہ سعود شاہ ایران کرنل ناصر مارشل ٹیٹو چو این لائی، آن زن ہور ان کینڈی کو بہت قریب سے دیکھنے اور برتنے کا موقع ملا اور ہر شخص یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ میزبانی مسز گاندھی پر ختم ہے۔ شاہ سعود کے اعزاز میں رسمی دعوت تھی۔ دوپہر کے کھانے سے بیس منٹ پہلے یہ معلوم ہوا کہ شاہ سعود کے ڈاکٹر نے ان تمام کھانوں کو منع کر دیا ہے اور وہ خاص پرہیزی کھانے کھائیں گے۔ مسز گاندھی نے منٹ

کی چوتھائی میں وہ تمام کھانے ظہرانہ کے قبل تیار کروالئے اور میز پر آراستہ کر دیے لیکن مزہ کی بات یہ ہے کہ شاہ سعود نے ان پر ہیزی کھانوں کو چکھا تک نہیں اور وہ تمام دوسرے کھانے جس کی ڈاکٹر نے ممانعت کی تھی۔ خوب سیر ہو کر کھائے!

مسز گاندھی ایلزبتھ دوم کی تاجپوشی میں بھی شریک ہوئیں۔ ان کی کرسی سرونسٹن چرچل کے پاس تھی۔ چرچل نے اندرا جی سے کہا: "یہ کتنی عجیب بات ہے کہ آج ہم دوستوں کی طرح باتیں کر رہے ہیں اور کل تک ہم ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے۔ مسز گاندھی نے فرمایا:" ہم نے آپ سے نفرت نہیں کی لیکن میں نے قرار واقعی کی مگر اب نہیں کرتی۔"

مسز گاندھی کو کئی دفعہ روس جانے کا موقع ملا۔ وہاں کے نظم وضبط اور تکنیکی ترقی سے بے حد متاثر تھیں۔ وہ جارجیا اور ازبکستان کے مناظر سے سرشار ہو جاتی تھیں ان کو اس بات کی بید خوشی تھی کہ ازبک ہماری شاعری، ہماری موسیقی ہمارے ادب خاص طور غالبؔ اور بیدل سے اور ہماری فلموں سے محبت رکھتے ہیں اور اس کے قدرشناس ہیں ایک مرتبہ مسز گاندھی مجھ سے فرمانے لگیں:" میں جب پنڈت جی کے ساتھ روس گئی تو تاشقند میں ان کے اعزاز میں بہت بڑی دعوت ہوئی۔ کھانے کی میز پر اس کا ذکر تھا کہ ہندوستانی فلم یہاں بے حد مقبول ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جس نے ہندوستانی فلم آوارہ نہ دیکھی ہو۔ میں نے چپکے سے کہا:" لیکن میں نے نہیں دیکھی"۔ خروشیف نے گلاس سے کھٹکا کیا اور بڑے ڈرامائی انداز میں فرمایا: خواتین وحضرات میں آپ کے سامنے ایک اعلان کرنا چاہتا ہوں مسز گاندھی نے آوارہ فلم نہیں دیکھی۔"

میں نے عرض کیا:" ان فلموں کی مقبولیت کا منظر میں نے بھی دیکھا جب ہندوستانی فلم دکھائی جاتی ہے تو سڑکیں خالی ہو جاتی ہیں اور راہ گیر تک سینما ہاؤس سے لگ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

"آپ کب گئے؟"

"۱۹۶۷ء میں"

"اچھا، پھر نہیں گئے؟"

"پھر اتفاق نہیں ہوا۔ میں تو بالکل غیر سیاسی آدمی ہوں۔"

"یہی تو آپ میں خرابی ہے!"

مسز گاندھی عالمی سیاست دانوں میں بہت بڑا درجہ رکھتی ہیں لیکن وہ ان سب سے مختلف ہیں۔ مرد وزن کا کوئی فرق ان کے ذہن میں نہیں تھا۔ لیکن انھیں اپنی نسوانیت بہت عزیز تھی۔ گفت گو میں بھی انھوں نے اپنے نرم وشیریں لب ولہجہ کو نہیں چھوڑا ادائے حسن کی معصومیت تو ایسی دل نواز تھی کہ پتھر بھی پانی ہو جائے ایک مرتبہ میں نے پوچھا۔

" آپ کو غصہ کب سے نہیں آیا؟ "

فرمایا " پنڈت جی کے جانے کے بعد سے "

مسز گاندھی میں بلا کا تحمل تھا۔ طبیعت میں بڑی بردباری اور وضعداری تھی برولائی سارا بائی کو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ شیخ عبداللہ کی قید وبند کی ذمہ دار اندرا ہیں۔ ایک مرتبہ وہ گھر میں آکر بیحد خفا ہوئیں اور بہت سخت سست کہا۔ اندرا علیل تھیں لیکن انھوں نے جواب میں ایک لفظ نہیں کہا اور ہمیشہ کی طرح ادب واحترام سے پیش آتی رہیں۔

ایک دفعہ مسز گاندھی نے دعوت کی اور بڑے لذیذ کھانے پکوائے میں نے عرض کیا " بڑے لذیذ کھانے پکوائے ہیں آپ نے آج تو "

فرمایا " آپ آرہے تھے۔ یہ کھانے خوش ذائقہ کیوں نہ ہوتے "

میں نے پھر عرض کیا " اس پکوان میں کشمیری، لکھنوی اور دہلوی تینوں لذتیں شامل ہو گئی ہیں اور آپ کا تعلق ان تینوں علاقائی تہذیبوں سے بہت گہرا ہے "

فرمایا " بھائی۔ کھانے میں سچ پوچھئے تو لذت صحیح گوشت سے آتی ہے۔ قورمہ کے لیے اور قسم کا گوشت ہونا چاہیئے۔ بریانی کے لیے اور قسم کا، کبابوں کے لیے اور قسم کا ـــــ میری نہنیال بازار سیتارام میں ایک قصائی تھا جو بہت عمدہ گوشت دیتا تھا اور اس کے قدیم رسم تھی۔ اس پر نہ معلوم کیا خدا کی سنوار ہوئی کہ وہ دکان بند کر کے کراچی چلا گیا اور ہم لوگ بے سہارا سے ہو گئے۔ خدا کی شان اس دعوت سے ایک دن پہلے وہ حضرت آ کھڑے ہوتے۔ یہ سب میرا نہیں۔ اسی کا کیا دھرا ہے "

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس عالم گیر شہرت کے سیاست داں کا بہت سا وقت باورچی خانہ میں گزرا ہے اور وہ اچھی گھرستن کی طرح طباخی اور آتش پزی کے اسرار و رموز سے بھی بخوبی واقف ہیں۔

مسز گاندھی سے میری آخری ملاقات، ۸ نومبر ۱۹۸۳ء کو نئی دہلی کی Conference of Intellectuals دانشوروں کی کانفرنس میں ہوئی جہاں میں نے تعلیم کے مسئلہ پر تقریر کی تھی اور عرض کیا تھا کہ اس کا پیراہن ہندوستان کی ضرورت اور مزاج کے مطابق قطع ہونا چاہیے اور ہندوستان جیسے قدیم ملک میں وہ ہماری تہذیب اور اقدار عالیہ کی محرم ہو۔ مسز گاندھی نے اپنی کریم النفسی سے اس تقریر کی بہت تعریف کی اور فرمایا: "مجھے اس کا افسوسناک اعتراف ہے کہ ہم نے تعلیم کے معاملہ میں بڑی غفلت برتی ہے۔"

اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ایک مسیحی عشائے ربانی کی میز پر بڑی عاجزی سے اپنی فردگذاشت کا اعتراف کر رہا ہے۔

مسز گاندھی کی زندگی اس عظیم شاعری کی طرح تھی جس میں عاشقی و ہنرمندی حسن اور انقلاب کا خوب صورت امتزاج ہوتا ہے۔ ہندوستان نے ان کی خدمات کا اعتراف ۱۹۷۲ء میں بھارت رتن کا خطاب دے کر کیا لیکن افسوس ہے کہ زیادہ تر بین الاقوامی اعزاز و اکرام ان کی وفات کے بعد ملے جن میں جواہر لال نہرو بین الاقوامی انعام بی سی رائے انعام اور لینن پرائز بھی شامل ہیں۔ فرانسس بیکن نے کہا تھا: "میری روح خدا کے پاس پہنچ جائے گی اور میرا جسم منوں مٹی تلے دفن ہو جائے گا لیکن آئندہ نسلوں میں میرا کام اور محفوظ رہے گا۔" یہی صورت مسز گاندھی کی ہے۔ مسز گاندھی کے متعلق اتنی غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں کہ ان سب کا احاطہ اور ازالہ ناممکن ہے اردو کے متعلق ان کے رویہ کو شبہ کی نظر سے دیکھا گیا ہے اور یہ بات بار بار دہرائی گئی ہے کہ ان کی ساری بیک گراؤنڈ اور تربیت ہندی کی ہے۔ اوّل تو یہ پوری سچائی نہیں اور اگر ہو بھی تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اردو کی قدر شناس نہیں تھیں۔ معترض یہ بھول جاتے ہیں کہ ترقی اردو بورڈ جس کا بجٹ ایک کروڑ روپیہ سالانہ اور مختلف صوبوں کی اردو اکاڈمیاں جن کے سالانہ بجٹ کئی کئی لاکھ ہیں انھیں کے زمانے میں وجود پذیر ہوئیں اور یہ واقعہ بھی معمولی نہیں کہ بہار میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ انھیں کے زمانے میں حاصل ہوا۔

علی سردار جعفری نے مختلف زبانوں کے ادیبوں کی دستخطیں حاصل کی تھیں کہ اردو کو اس کا جائز حق دیا جائے اس محضر کو وہ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے تھے۔

وہ کسی مجبوری کی وجہ سے خود حاضر نہ ہو سکے۔ انھوں نے یہ خدمت میرے سپرد کی۔ وفد میں کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر بھی شامل تھے۔ ان کو دیکھتے ہی مسز گاندھی کہنے لگیں "اچھا آپ نے بھی اُردو پڑھ لی پھر میری طرف دیکھ کر فرمانے لگیں "آئین کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت ہر ریاست میں اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ ملنا چاہیے۔ زبان یہ کام خوش اسلوبی سے ہونا چاہئے۔ سب کو ساتھ لے کر۔ زبردستی ان کے سر پر تھوپا نہیں جاسکتا۔ شاستری جی کے زمانے میں زبان کے فسادات میں ٹامل ناڈو میں کیا قیامت آئی تھی۔ میں نہیں چاہتی، موافقت یا مخالفت میں کوئی ایسی صورت پیدا ہو۔"

ایک شخص کی بڑائی کا اندازہ اس وقت نہیں ہوتا جب آرام و عیش، اقتدار اور حاکمیت اس کے قدم چوم رہے ہوں۔ اس کی بڑائی کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ انصاف اور حق کے لیے لڑ رہا ہو۔ جب اس کے چاروں طرف اندھیرا ہو۔ دشمنوں کی یلغار ہو۔ مصائب کا ہجوم ہو اور وہ اپنے نصب العین پر نگاہ جمائے، ایمان و یقین کی روشنی میں آگے بڑھتا جائے اور جو نہ تلخی دوراں کا گلہ مند ہو اور نہ اپنے کارناموں کا رجز خواں ہو۔ مسز گاندھی کی زندگی، جرأت و ہمت، صبر اور استقلال کی عجیب و غریب مثال ہے۔ آسمان کی کمان جھک سکتی تھی لیکن مصائب کے آگے ان کا سر نہیں جھک سکتا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں ان کی والدہ کا انتقال، وہ بھی لاسین میں اور وطن سے دور۔ کیا گزری ہوگی ان پر۔ اس کے بعد شوہر کا انتقال (۱۹۶۰ء)، پھر شفیق باپ کا انتقال (۱۹۶۴ء) اس کے بعد عزیز بیٹے سنجے گاندھی کا ناگہانی انتقال (۱۹۸۰ء)۔ ۱۹۷۷ء کے الکشن میں شکست۔ اس کے بعد مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے مسز گاندھی اور سنجے کے خلاف ایک دو نہیں اٹھائیس تحقیقاتی کمیشن مقرر کیے اور کون سا جھوٹ تھا جو ان کی مخالفت میں آگ کی طرح نہیں پھیلا گیا۔ سب سے پہلے تو یہ کہا گیا کہ الکشن میں ہارنے کی خبر معلوم ہوتے ہی مسز گاندھی نے فوج سے کہا کہ وہ عنانِ اختیار اپنے ہاتھ میں لے لے اس کی بری بحری اور فضائی تینوں کمانڈروں نے یک زبان تردید کی اور کہا کہ یہ خبر بالکل بے بنیاد ہے۔ اس کے بعد یہ خبر مشہور کی گئی کہ مسز گاندھی کے پاس ایک چارٹرڈ ہوائی جہاز ہے جس کے ذریعہ وہ ہندوستان چھوڑ کر باہر کسی ملک میں آرام سے رہیں گی اور ان کے پاس بوریوں میں بھرے ہوئے کرنسی نوٹ ہیں جو ان کی دو تین نسلوں کے لیے کافی ہوں گے

اس کے علاوہ غیر ملکی بینکوں میں بھی ان کی دولت جمع ہے جس کا حد حساب نہیں۔ ایک صاحب نے یہ بھی بیان کیا کہ مسز گاندھی نے دفتر چھوڑنے سے پہلے سات سو فائلیں جن سے اُن کے "سیاہ کارناموں کی قلعی" کھل سکتی تھی۔ آگ میں جلا دیں۔ ڈاکٹر کوشی کو یہ تحقیق کرنے پر متعین کیا گیا کہ جے پرکاش نرائن کو کیا تکلیفیں پہنچائی گئیں جس سے ان کی صحت ہمیشہ کے لیے بگڑ گئی۔ ایمرجنسی کے دوران جو "مظالم" ہوئے تھے ان کی جانچ کے لیے ۱۹ مئی ۱۹۷۷ء کو شاہ کمیشن مقرر کیا گیا۔ داس کمیشن یہ معلوم کرنے کے لیے قائم کیا گیا کہ اخبارات۔ ریڈیو فلم اور ٹی وی نے مسز گاندھی کی من مانی کارروائیوں کی کس طرح پردہ پوشی کی اور کس طرح انھوں نے اپنے اثر اور رسوخ سے کام لے کر نام آوری حاصل کی۔ جسٹس کرد دیوان اس کے خلاف اور جسٹس ماتھر باردتی کے معاملات کی تحقیق کرنے پر متعین کیے گئے۔ ایک کمیشن فیملی پلاننگ کی ستم رانیوں کی تحقیق کے لیے اور ایک رام منوہر لوہیا کی موت کے اسباب دریافت کرنے کے لیے مقرر کیا گیا جو دس برس پہلے ۱۹۶۷ء میں واقع ہوئی تھی۔ اس کے بعد پی، سی سیٹھی، نندنی ست پتی۔ یش پال کپور۔ ذیل سنگھ۔ نرائن دت تیواری وی سی شکلا اور مسز گاندھی کے ہزاروں عقیدت مندوں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ بنسی لال کے ہتکڑیاں ڈال کر سڑکوں سے گزارا گیا! اور ۳ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو خود مسز گاندھی کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان کے خلاف مجسٹریٹ کو کوئی چیز ایسی نہیں ملی جو قید و بند کا جواز بن سکتی۔ اس لئے اگلے روز ان کو بلا شرط رہا کر دیا گیا۔ ان ناخوشگوار واقعات اور تحقیقاتی کمیشنوں نے مسز گاندھی کے پائے استقلال میں جنبش پیدا نہیں کی اور وہ سب کو دریائے بیتابی کی ایک موج خون سمجھ کر برداشت کرتی رہیں۔ ان کی جبین صبر پر ایک شکن نہیں آئی اس لیے کہ وہ جانتی تھیں کہ حق کی مظلومی تاریخ کا کوئی نیا واقعہ نہیں ہے اور بالآخر فتح سچائی ہی کی ہوگی۔

اس زمانہ میں بہتان طرازی کے جو نمونے سامنے آئے وہ جنگ عظیم دوم سے زیادہ عجیب تھے۔ کہا گیا کہ مسز گاندھی کے پاس منک کا کوٹ ہے جو ان کو رشوت میں دیا گیا ہے اور اس کی قیمت ایک ملین ڈالر سے زیادہ ہے۔ راجیو گاندھی کے متعلق کہا گیا کہ انھوں نے بوئنگ ہوائی جہاز کمپنی سے سودا کر کے کروڑوں روپے جمع کر لیے ہیں اور ان کی بیوی سونیا نے اٹلی میں بیسیوں بیش قیمت ہوٹل خرید لیے ہیں۔ ایسٹیمین اور انڈین اکسپریس جیسے اخباروں نے سوئس بینک کے ڈرافٹ کی فوٹو کاپی شایع کی جس سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ سنجے گاندھی اور ان کی بیوی کا بینک آف برن میں غیر قانونی

حساب ہے لیکن ۲۲ جولائی ۱۹۷۷ء کو وزیر مالیات نے برسرِ عام اعلان کیا کہ یہ سب افسانہ ہے اور اس بینک سے ان دونوں کا مطلق کوئی تعلق نہیں۔

یہی نہیں ڈاکٹر رام منوہر لوہیا جناب فخر الدین علی احمد، جے پرکاش نرائن اور حد یہ ہے کہ سنجے گاندھی کی موت کا ذمہ دار بھی بلاواسطہ یا بالواسطہ مسز گاندھی کو قرار دیا گیا۔

ناوک نے ترے صید نہ چھوڑا زمانے میں

لیکن مسز گاندھی صبر اور استقلال کا پہاڑ تھیں۔ وہ ہندوستان کا فخر اور جمہوریت کی آبرو تھیں ان کے دل میں نہ انتقام کا خیال آیا، نہ مکافات کا۔ اُن کے دنوں کی تپش، ان کی شبوں کا گداز۔ ان کے مقصد کی تابانی۔ اُن کے دل کی فراخی اور ان کی نظر کی وسعت نے عوام کے دلوں کو جیت لیا اور وہ الکشن میں بھر بھاری اکثریت سے جیت گئیں اور مخالفوں کی ریشہ دوانیوں اور دروغ بانیوں کا پردہ چاک ہوگیا۔ اس سے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ باہر بھی ان کی عظمت کو چار چاند لگ گئے ان کا شمار اثباتِ حق، روشن خیالی اور شرافتِ نفس کی وجہ سے دنیا کے عظیم رہنماؤں میں ہونے لگا ان کا آئینہ دل شفاف تھا۔ اس پر انتقام اور کدورت کی گرد نہیں پڑی تھی زمبیا کے سفیر نے لندن ٹائمس میں ایک خط ۳ مارچ ۱۹۷۸ء کو شائع کیا تھا جس میں لکھا تھا کہ مسز گاندھی ہر معیار سے دنیا کے عظیم ترین رہنماؤں میں ہیں۔ انھوں نے گیارہ برس تک کانگریس کے لیڈر اور ہندوستان کے وزیر اعظم کی حیثیت سے کام کیا ہے جو معمولی کارنامہ نہیں ہے اور ان کی بڑائی کا روشن ثبوت ہے۔ ایک ایسے عظیم المرتبت لیڈر کے ساتھ بدسلوکی، الکشن میں ہارنے کے بعد تمام جمہوری آداب کے منافی ہے اور ہندوستان جیسے قدیم ملک میں جس کی رواداری ضرب المثل ہے اور جو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا مرکز ہے۔ بہت ہی غلط مثال قائم کرنا ہے۔"

الکشن میں ہارنے کے بعد مسز گاندھی ۱۹۸۰ء میں اپنے اعجازِ عمل سے دوبارہ جیت گئیں اور اتنی شاندار فتح یابی و کامرانی پنڈت جی کو بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔

مسز گاندھی ہماری قدیم روایات کی امین تھیں لیکن وہ ان کے صحت مند عناصر میں جدید کی قلم بھی لگانا چاہتی تھیں۔ یہ کام وہ اتنی تیزی سے کرنا نہیں چاہتی تھیں کہ عوام کو اس سدھار ہی سے نفرت ہو جائے۔ ان کے خیال میں قومی اتحاد اور یک جہتی مسلسل تاریخی عمل ہے جس کی ہر مرحلہ پر آبیاری کرنے

کی ضرورت ہے۔ آزادی کی لڑائی کے زمانے میں ہمارے سامنے صرف ایک ہی مقصد تھا — آزادی کا حصول۔ اس جدوجہد میں تمام مذہبوں نے، تمام علاقوں نے حصہ لیا اور بالآخر عدم تشدد پر کاربند رہ کر آزادی حاصل کرلی لیکن اب ہمارے سامنے بہت سے مسائل ہیں۔ اقتصادی، سیاسی۔ اندرونی اور بیرونی" جب میں بیرونی مسائل کا ذکر کرتی ہوں تو ہمارے بعض حریف کہتے ہیں کہ ان کا ذکر اندرونی مسائل کے چشم پوشی کی غرض سے کیا جاتا ہے افسوس ہے کہ ہم نے اپنی تاریخ سے سبق نہیں لیا۔ ان علیحدگی پسند عناصر کو باہر کی قوتیں ہوا دیتی ہیں اوران کا مقصد یہ ہے کہ ہم کمزور، غیر متحد اور دست نگر رہیں۔"

مسز گاندھی نے ایک مرتبہ فرمایا تھا: "ہندوستان بہت بڑا ملک ہے اس کے مسائل بھی بہت بڑے ہیں۔ کوئی جادو کی چھڑی ایسی نہیں ہے کہ وہ تمام مسائل کو منٹ کی چوتھائی میں حل کردے۔ بیس نکاتی پروگرام اہم ہے لیکن وہ صرف ابتدا ہے۔ اسی طرح ہم ساتویں پلان میں غلہ کی پیداوار کو بڑھانا بے روزگاری کو کم کرنا اور خوداعتمادی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ پیداوار۔ روزگار اور غذا یہ سب مسائل ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور ہماری یہی کوشش ہے کہ ہم ہندوستان کے ہر رہنے والے کو روزگار اور روٹی فراہم کرسکیں۔"

مسز گاندھی کو اس کا پورا احساس تھا کہ یہ سارے کام دھرے رہ جائیں گے اگر ملک میں امن نہ ہو یا ملک کا دفاع مضبوط نہ ہو اس معاملہ میں بھی انھوں نے خوداعتمادی پر زور دیا اور یہ کوشش کی کہ ہم اپنے ہی وسائل پر بھروسہ کریں۔ ایک وقت تو وہ تھا کہ ہم سوئی اور دیا سلائی کی ڈبیا تک باہر سے منگاتے تھے۔ اب ہم ٹینک۔ بحری اور فضائی جہاز* تارپیڈو اور جٹ انجن سب ہی بنالیتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ابتدا ہے۔ یہ صرف کامیابی کے جزیرے ہیں۔ اگر ملک غیر ملکی خطرات سے محفوظ نہیں ہے یا اس کی دفاعی قوت کمزور ہے تو ہم ترقی کر ہی نہیں سکتے۔ ترقی کا صرف ایک ہی راز ہے۔ دل کی ناامیدی کو دور کرنا۔ اپنے اوپر بھروسہ کرنا۔ محنت کرنا۔

مسز گاندھی صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ اپنے ماحول، اپنی فضا اپنے گردوپیش، اپنے دریا اور سمندر اپنے پہاڑ، اپنے کھلیان اور کھیت، اپنے جنگل اور جانوروں کو بھی آلودگی سے پاک اور ظلم سے محفوظ رکھنا چاہتی تھیں اس معاملہ میں انھوں نے اشوک اعظم کے اقوال کو جابجا نقل کیا ہے جس کو فطرت کا حسن

اور قدرت کے مظاہر اسی طرح عزیز تھے جیسے ماں کو اپنے بچے عزیز ہوتے ہیں۔

بین الاقوامی سطح پر اور نام کے صدر کی حیثیت سے مسز گاندھی کا سب سے بڑا کارنامہ نا وابستگی کی تحریک کو ایک حقیقتِ بسیط بنا دینا ہے انھوں نے امن عالم اور نیوکلیائی اسلحہ کی تخفیف کی بھی پوری کوشش کی۔ وہ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ملکوں کے درمیان انصاف۔ اشتراک اور دوستی کا رشتہ پیدا کرنا چاہتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ خوش حالی، امن اور آزادی یہ نعمتیں ناقابل تقسیم ہیں اور سب ملکوں کو اس میں برابر کا حصہ ملنا چاہیے۔ جہاں ان کو محسوس ہوا کہ وقت کے قافلے ان کا ساتھ نہ دے سکیں گے، انھیں اکیلے چلنے میں بھی عار نہیں تھا۔ ٹیگور کا وہ گیت " اکلا چلو رے " انھیں بہت پسند تھا اور وہ اس پر عامل بھی تھیں۔

ایک بیرونی سفر پر روانہ ہونے سے قبل مسز گاندھی نے چند اہل علم کو غیر رسمی طور پر بلایا تھا۔ اس محفل میں یہ خاکسار بھی تھا۔ کہنے لگیں " ہم سے بعض ترقی یافتہ ملک کہتے ہیں کہ تم کو روٹی تو میسر نہیں لیکن تم ہوائی جہاز میں بیٹھنا اور خلا میں اڑنا چاہتے ہو۔ میں کہتی ہوں خلا سے ہم پورے ہندوستان کو ایک واحدہ کے طور پر دیکھ سکتے ہیں میں نے راکیش شرما کو خلا میں ٹیلی فون کیا اور پوچھا وہاں سے ہندوستان کیسا نظر آتا ہے۔ کہنے لگے سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔ یہ شاعری نہیں حقیقت ہے اور حقیقت خلا میں آنکھوں سے صاف نظر آجاتی ہے۔ آسمان ہی سے کان شناسی میں مدد مل سکتی ہے اور اقیانوسی ریسرچ ہی کے ذریعہ غذائی صورت حال کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔

غرض اس کرہ ارض کا کوئی مسئلہ اور خاکِ ہند کا کوئی ذرہ ایسا نہیں جو ان کی توجہ کا مرکز نہ رہا ہو۔ گلاب کی خوشبو۔ سرو شمشاد و چنار میں ہوا کی جنبش۔ سمندر کی بڑی بڑی لہریں۔ ہمالہ کی فلک بوس چوٹیاں، اینٹ آرٹ کی برفیلی زمین۔ خلا کی پرواز اور ستاروں کے آگے نئے نئے جہاں، ہمیشہ ان کے آدرشوں کی یاد دلاتے رہیں گے۔

مسز گاندھی کی زندگی ہندوستان کی نشاۃ الثانیہ کی بہترین ترجمان ہے ان کی زندگی صبح عید کی نوید، رجائیت کا نغمہ اور امید کی کرن ہے۔ اس کی حیثیت قدر مشترک کی ہے۔ ایک ایسی کڑی کی جو دلوں کو ملاتی ہے اور مختلف ملکوں کے درمیان رابطہ، اتحاد قائم کرتی ہے۔

مسز گاندھی نے جس وقت ہوش کی آنکھ کھولی، مغرب کا تیر ہندوستان کی روح میں بہت گہرا

پیوست ہو چکا تھا۔ اور یورپ کا سیاسی اور اقتصادی پرچم ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ملکوں پر لہرا رہا تھا۔ مشرق میں قدیم و جدید کی آویزش خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی اور اس نے پوری پوری آبادیوں کو جڑ سے اکھاڑ دیا تھا۔ لیکن مسز گاندھی جس کا ایمان مشرق کی انسانی اقدار پر بہت گہرا تھا اِن طوفانی ہواؤں میں ثابت قدم رہیں۔ انھوں نے صرف ہندوستان ہی کو نہیں بلکہ پورے مشرق کو سامراجیت اور نو آبادیاتی نظام سے نجات دلانے کی کوشش کی۔ نفی خودی اور کورانہ تقلید کے خلاف آواز اٹھائی۔ انھوں نے ایک نیا اقتصادی نظام قایم کرنے کی کوشش کی جس کی بنیاد استحصال نہیں، عالمی صلح و امن، خیر و بہبود، انصاف و دادرسی ہو۔ مغرب کے ساتھ یہ تصادم اور پھر یہ سنجوگ ہماری تاریخ کا عجیب و غریب واقعہ ہے۔ ان کا نقطہ نگاہ، یکسر عالمی اور بین الاقوامی ہے۔ ان کی نظر تاریخ کے تمام عوامل اور رجحانات پر تھی۔ اسی لیے وہ پنڈت جی کی طرح ہندوستان کی ترقی کو عالمی مرقع میں سجانا چاہتی تھیں۔ زراعت و صنعت، اقتصاد و حرفت، تہذیب و تمدن سائنس اور ٹکنالوجی، بچے، عورتیں، معذور و بے دست و پا۔ امن عالم، تخفیف اسلحہ اور بقائے باہم غرض اس دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں تھا جو ان کی گرفت سے باہر ہو یا جس کی گرہ کو انھوں نے اپنے ناخن تدبیر سے کھولنے کی کوشش نہ کی ہو اور یہ سب کام انھوں نے بڑی جرأت و ہمت اور مردانگی سے انجام دیے۔ ان کی کابینہ کے متعلق کسی نے کہا تھا کہ اس میں سب عورتیں ہیں۔ صرف ایک مرد ہے اور وہ مسز گاندھی ہیں۔

نپولین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ماسکو سے ناکام لوٹا لیکن یہ اس کی کم بڑائی نہیں ہے کہ وہ ماسکو تک پہنچا تو۔ مسز گاندھی ان تمام مسائل کے حل کرنے میں کامیاب ہوئی ہوں یا نہ ہوئی ہوں لیکن یہ کیا کم ہے کہ وہ ان اقدار عالیہ کو سینے سے لگائے رہیں اور ان ہی اقدار کی حفاظت کے لیے اپنی جان دی۔ بلاشبہ ان کے خون کا ہر قطرہ ملکی استحکام، سالمیت اور قومی یک جہتی کا ضامن ہے۔ ہر قطرہ اکیسویں صدی کے لیے چراغ راہ گذر ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام صرف اس لیے بڑے نہیں کہ انھوں نے کعبہ کی بنیاد ڈالی تھی بلکہ اس لیے بڑے ہیں کہ وہ نمرود کی آگ میں کود گئے تھے اور اسے اپنے بے پناہ عزم اور لازوال یقین سے گلزار بنا دیا تھا۔ آئن اسٹائن نے بھی اِس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہتا ہے:

"دنیا میں سب سے بڑی اور ناقابل تسخیر قوت ارادے کی مضبوطی اور اخلاقی توانائی ہے۔"

مسز گاندھی بہت کم کھاتیں، بہت کم سوتیں لیکن اُن کے پاس اخلاقی توانائی کا خزانہ تھا۔ ہندوستان کی خدمت کے لیے انھوں نے اپنی ساری ناتواں توانائیوں کو جمع کر لیا تھا اور اس راہ میں دل ونگاہ و نفس سب لگا دیا تھا۔ جب تک عورتوں میں حیا اور سلیقہ باقی ہے، جب تک معصوم بچوں کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلتی رہے گی۔ جب تک نوجوانوں میں غیرت اور ہمت کا خون گردش کرتا رہے گا۔ مسز گاندھی کی یاد ہمارے دلوں کو گرماتی رہے گی:

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

٭٭

ڈاکٹر کامل قریشی

وحید العصر وحید الدین احمد بیخود دہلوی

حیات۔ پیدائش خاندان

اُستاد وحید الدین احمد بیخود دہلوی بروز اتوار ۳ رمضان المبارک ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۵۸ء کو ریاست بھرت پور (راجستھان) میں پیدا ہوئے۔ یہاں آپ کے بزرگ ممتاز عہدوں پر فائز تھے۔ حسنی و حسینی سید ہونے کے سبب ان کے شجرۂ نسب کی کڑی جہاں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے بائیسویں پشت میں ملتی ہے وہاں حضرت خواجہ باقی باللہ سے بھی آپ کو خاندانی نسبت قائم ہے، آپ کے بزرگ اپنی خدا داد لیاقت و انتظامی صلاحیت کی وجہ سے مغلیہ بادشاہوں کے دور میں اعلیٰ مراتب پر فائز رہے اور بعد میں دیسی ریاستوں میں بھی اونچے عہدوں پر متعین کیے گئے۔ خاندانی افتخار و امتیاز کے اعتبار سے آپ کا ددھیال و ننہیال دونوں آفتاب و ماہتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بیخود صاحب کے پردادا امتیاز الدولہ، افتخار الملک نواب سید احمد خاں بہادر منصور جنگ عالمگیر ثانی کے وزیر تھے۔ نانا منشی محمد شفیع عرف منشی آغا جان صاحب میر منشی ریذیڈنسی راجپوتانہ تھے۔ اُن کے ایک بزرگ شاہ نظام الدین عرف شاہ جی نے دہلی میں شاہ جی کا تالاب اور شاہ جی کا چھتہ تعمیر کرائے تھے دہلی کی تاریخی جگہوں میں ان کا خاص ذکر موجود ہے۔ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے کے علاوہ اسلاف بیخود اپنے علم و فضل اور ذوق شعر کی وجہ سے بھی نمایاں اور ممتاز تھے۔ دادا سید بدر الدین احمد

عرف نیفر صاحب سالک و کاشف تخلص کرتے تھے اور مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ والد سید شمس الدین احمد عرف سید احمد سالم کو شاعری سے غیر معمولی شغف تھا۔ دو چچا سید عظیم الدین عرف سید محمد موزوں اور فرد کے علاوہ ہیں ماموں منشی کرم اللہ خاں عرف ننھے خاں شیدا حکیم عبد اللہ خاں رسا اور مولوی عبد الرحیم خاں بیدل دہلوی بھی شاعر تھے آپ کی والدہ کے پھوپھا صدر الصدور مفتی صدر الدین آزردہ سخن ور و سخن سنج اور غالب کے دوستوں میں تھے۔ بیخود صاحب نے خود لال قلعہ کی ایک بیگم کی آغوش میں پرورش پائی جنھوں نے اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے زمانے کے دربار دیکھے تھے۔ غرض یہ کہ ایں خانہ ہمہ آفتاب است...... بیخود صاحب کو پیدائش سے چند ماہ بعد دہلی لایا گیا اور اس طرح ان کو دولت و ثروت، علم و کمال اور عیش و عشرت کے ماحول میں پروان چڑھنے اور تربیت پانے کا موقع ملا۔

تعلیم و تربیت اور تلمذ ابتداً بیخود صاحب نے قرآن شریف ختم کر کے فارسی کی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی، اور چند سال میں ابتدائی درسی کتابیں ختم کر ڈالیں۔ مولانا الطاف حسین حالی سے مہر نیم روز اور دیوانِ غالب (فارسی) اور دیگر شعرائے فارسی کے دیوان پڑھے، فنِ عروض و بیان سیکھا اور اپنی شاعری کے آغاز میں اصلاح بھی مولانا حالی ہی سے لی تقریباً ۱۲ برس کی عمر میں انھوں نے یہ شعر کہا تھا:

دل سے نکل گیا کہ جگر سے نکل گیا
تیر نگاہِ یار کدھر سے نکل گیا

اُن کی شاعری کی ابتداء کے واقعات کچھ اس طرح بیان کیے جاتے ہیں کہ ایک بار آپ کے چچا موزوں ایک روز کچھ لکھ رہے تھے۔ آپ نے دریافت کیا، کیا لکھ رہے ہیں؟ فرمایا غزل لکھ رہا ہوں۔ بیخود صاحب نے کہا ہم بھی غزل لکھیں گے جواب ملا تم کیا غزل لکھو گے بیخود صاحب کو جوش آگیا اور ۱۴ سال کی عمر میں غزل کہی اور بہت خوب کہی، اور اس واقعہ کے ۲۵ سال بعد اپنے انہی چچا موزوں کی غزلوں کی اصلاح کی۔

ؔ ناصر وزیر فراق ـــ درشہوار بیخود ـ ص ۱۹۲

ایک دوسرا واقعہ یہ ہے :

ایک روز آپ کے ماموں[1] حکیم عبداللہ خاں رسا غزل کہہ رہے تھے، حال کب۔ خال کب۔ رسا صاحب نے یہ قطعہ کہا :

دیکھو تو آئینہ ذرا اے حضرتِ رسا چہرے سے آشکار تھا رنج و ملال کب
ہم نے نہ کہہ دیا تھا کہ اچھا نہیں ہے عشق کب تم تھے بے قرار ہوا تھا یہ حال کب

بیخود صاحب نے فوراً یہ مصرعے لگائے :

میری خطا معاف ہو بے شرم کی یہ جا یہ حالِ زار، اور ہو حضرت سا پارسا
بیخود کی شکل کو بھی تو دل سے بھلا دیا دیکھو تو آئینہ ذرا، اے حضرت رسا
چہرے سے آشکار تھا رنج و ملال کب

تھا قول آپ کا تو کہ گردوں نشیں ہے عشق یا کہتے ہو کہ موت سے بدتر کہیں ہے عشق
کیوں بے زباں پہ دشمنِ دنیا و دیں ہے عشق ہم نے نہ کہہ دیا تھا کہ اچھا نہیں ہے عشق
کب تم تھے بے قرار ہوا تھا یہ حال کب

جب مولانا حالی کو یہ شعر سنائے تو انھوں نے مسرت کے ساتھ مشورہ دیا کہ تم شعر کہا کرو۔ چنانچہ مولانا حالی کی تحریک پر بیخود صاحب غزلیں کہتے رہے اور اصلاح کے لیے بھی انھیں ہی دکھاتے رہے۔ اس زمانے میں وہ نادر تخلص کرتے تھے۔ ۱۶ برس کی عمر میں بیخود تخلص رکھا اور بعد میں مولانا حالی کے مشورے سے مرزا داغ کی خدمت میں شاگردی کے لئے گئے۔

مولانا حالی جب دلی سے علی گڑھ منتقل ہونے لگے تو انھوں نے بیخود صاحب کو ان کے ماموں عبدالرحیم خاں بیدل کے ہمراہ مرزا داغ کی خدمت میں شاگردی کے لئے بھیجا۔ داغ کے تقاضے پر بیخود صاحب نے اپنی تازہ غزل کا یہ شعر ؎

جب آنکھ پڑی اپنی اک بات نظر آئی
ان دیکھنے والوں نے تجھ کو ابھی کیا دیکھا

---

[1] گفتارِ بیخود۔ تقریظ حامد علی خاں بیرسٹر ص ۳۴۵-۳۴۶

سنایا تو داغ بھڑک گئے اور جب بیخود صاحب نے یہ انکشاف کیا کہ وہ روز ایک دو غزل کہتے ہیں اور پھاڑ دیتے ہیں اور اب تک ایک ضخیم دیوان ضائع کر چکے ہیں تو اُن کو مسرت آمیز استعجاب ہوا۔ اس طرح ۱۳۰۹ھ میں بیخود صاحب داغ کے شاگرد ہوئے۔

بیخود صاحب نے اُستاد داغ سے زبان و بیان میں مہارت حاصل کرنے اور اکتساب فن کے لیے دہلی کے بعد حیدر آباد میں بھی اُن کے ساتھ وقت گذارا، اور ان کی صحبتوں سے فیض اُٹھاتے رہے ذہین، روشن دماغ، طبّاع اور ہوشیار ہونے کے سبب انھیں شعر کی خوبیوں پر عبور حاصل کرنے کے لیے زیادہ وقت نہیں لگا بہت قلیل عرصے میں داغ نے ان سے کہہ دیا کہ اب انھیں اصلاح کی ضرورت نہیں۔ مرزا داغ۔ بیخود صاحب سے اس مطمئن اور خوش تھے کہ ان کی زبان کو اپنی زبان کہا کرتے تھے، اور اسی جذبے کے تحت انھوں نے بیخود صاحب کو وحید العصر کا خطاب دیا تھا، بیخود صاحب نے کہا ہے ؎

زباں اُستاد کی بیخود ترے حصے میں آئی ہے
پھر اتنا بھی نہیں کوئی خدا رکھے ترے دم کو

بیخود صاحب نے اپنے کلام پر داغ کا رنگ اس قدر چڑھایا ہے کہ داغ و بیخود کے شعروں میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے، صرف مقطع ہی سے فرق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کلام کی یہ یکرنگی ثابت کرتی ہے کہ استاد شاگرد رنگ و آہنگ اور فکر و مضمون میں کس قدر ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ گفتار بیخود اور درشہوار بیخود میں اس کی بیشتر مثالیں موجود ہیں۔ ادب و احترام کے رشتوں کے ساتھ بیخود داغ کے درمیان کس قدر خلوص و محبت اور بے تکلفی کے تعلقات تھے اس کا اندازہ ان خطوط سے ہو سکتا ہے جو داغ نے بیخود صاحب کو تحریر کئے ہیں جن سے اس بات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ کلام بیخود داغ کی نظروں میں کن خوبیوں کا حامل تھا، ملاحظہ ہو:۔

"میر صاحب اب تک بفضلہ میں خیریت سے ہوں اور آپ کے ملنے کا مشتاق، یہاں آئے تو میرے پاس نہ رہے، گئے تو دغا دے گئے۔

---

[1] "انشائے داغ" مرتبہ احسن مارہروی ص ۹۵

تخلص سے میں گھبراتا ہوں۔ اگرچہ یہاں روزگار عنقا ہے مگر اپنا گھر ہے امید پر آدمی کی زندگی ہے شاید کبھی تقدیر یاوری کرجائے، اپنے والد ماجد کی خدمت میں میری طرف سے تسلیم کہہ دیجئے اور غزلوں کے تو اشعار مجھ کو پسند آئے۔ پہلی غزل بے مثل ہے جس کی نقل میں نے لے لی۔ آپ کو اس کی قدر نہیں۔"

یکم ذی قعدہ ۱۲۱۰ھ

نواب مرزا داغ خاں عفی عنہ

"واہ[1] میر صاحب۔ کیا خوب غزلیں کہی ہیں نہایت جی خوش ہوا خود یہاں حاضر ہوکر ہم کو مبارکباد دو، دور کے ڈھول ہم نہیں سنتے۔ ہمارا دل دکھا کر تم چلے گئے ہو اس صبر میں تم گرفتار ہو، صاحب عالم مرزا خورشید عالم اور بھائی امیر مرزا یہیں موجود ہیں سب تم کو یاد کرتے ہیں۔ فقط سب کا سلام

"میر صاحب[2]۔ بہنوں کے بعد یاد کیا اور پھر الٹا اشتیاق چھوٹا جتلایا۔ میں چاوڑی کا رہنے والا نہیں چار مہینے سے بلائے ضعفِ معدہ میں مبتلا ہوں۔ آپ کی سب غزلیں بہت خوب ہیں کس کس پر صاد کروں۔

داغ دہلوی

۲۵ ستمبر ۱۸۹۳ء

بخود[3] بہانہ ساز ہو تم جانتے ہیں ہم

زبانِ دہلی میں غزل کیوں نہیں دیتے بھائی امیر مرزا صاحب جے پور واپس گئے صاحب سے مل کر بتادوں گا۔ اس وقت وہ خواب راحت میں ہیں دعا کرو کہ لوازم خطاب جلد ادا ہوں۔ بہت زیر بار ہوں۔ غزلیں بے مثل لکھی ہیں۔

داغ دہلوی

۲۲ جنوری ۱۸۹۴ء بوقت ۱۰ بجے شب

---

[1] "انشائے داغ" مرتبہ احسن مارہروی ص ۹۶ - ۹۷

[2] " " " ۱۰۰

[3] " " " ۹۸

"سید صاحب، میری غزل کی تو دھجیاں اُڑا دیں اور ابھی حسرت باقی ہے، کیا مضمون نکالے ہیں کہ رشک آتا ہے۔"

"سید بیخود صاحب تمہارا کلام ایک دن بھی یہاں نہیں رہتا۔ اسی وقت بہر حال سفر و حضر میں دیکھ کر بھیجتا رہتا ہوں۔ مجھ کو کیا خبر کہ تم تین مہینے سے دلّی میں ہو، پہلے نہ اطلاع کی، جہاں پہلے تم تھے وہیں کلام بھی گیا ہوگا۔ دریافت کرو۔"

نواب فصیح الملک داغ دہلوی

۱۸ شوال ۱۳۱۱ھ

ان خطوط کے علاوہ بیخود صاحب نے اپنے ایک مضمون[1] میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُس سے داغ کے ساتھ اُن کے والہانہ تعلقات پر گہری روشنی پڑتی ہے۔ اس کے اقتباس ملاحظہ ہوں۔

"شام کا وقت ہے دربار دہلی (۱۹۰۳ء) کا موقع ہے اعلیٰ حضرت حضور نظام کا کیمپ دلّی کلب میں رونق افروز ہے ایک خیمہ داغ صاحب کو ملا ہوا ہے میں حاضر خدمت ہوں رمضان کا مہینہ افطار کا انتظام، اُستاد خود افطار تیار کرا رہے ہیں گو روزے سے نہیں ہیں لیکن ثواب میں حصہ بٹانا چاہتے ہیں میں نے دست بستہ عرض کی کہ گھر جا کر روزہ کھولوں گا، آپ کیوں تکلف فرما رہے ہیں ارشاد ہوا سید تجھ کو تیرے نانا بخشوا لیں گے مجھ کو تو بھی کچھ ثواب کما لینے دے باتیں کرتے کرتے کہنے لگے۔ بیخود یار ہماری طبیعت تو کند ہوئی جا رہی ہے میں نے کہا اُستاد کیا فرما رہے ہیں آپ، آپ کی طبیعت اور کند۔ یہ تو خنجر براں تیغ آبدار ہے اس کو زنگ اور کثافت سے کیا کام، بولے تو تو جانتا ہے حسینوں کو دیکھتا ہوں اور خوب صورت شعر کہتا ہوں یہ ٹھہرا کیمپ کا معاملہ یہاں پریوں کے پر جلتے ہیں اور ہاں میاں بیخود ایک دفعہ تم نے ہرن کے کباب کھلائے تھے وہ اس مزے کی چاٹ تھی کہ آج تک ہونٹ چاٹتا ہوں۔ حیدر آباد میں ہرن دیکھنے کو نہیں ملتا اس کے گوشت کو جی ترستا ہے ایک دفعہ تو بیٹا پھر ویسے ہی کباب کھلا دے خدا کرے تیری طبع شوخ و

---

[1] انشائے داغ مرتبہ احسن مارہروی ص ۱۰۰ - ۱۰۱

تنگ میدانِ سخن میں ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرے۔"

اعلیٰ حضرت حضور نظام نے اُستاد کی تنخواہ میں اضافہ فرمایا۔ یہ واقعہ بھی قصہ طلب ہے حضرت داغ نے برسرِ دربار غزل گزرانی مقطع تھا:

تم نمک خوار ہوئے شاہ دکن کے اے داغ
اب خدا چاہے تو منصب بھی ہو جاگیر بھی ہو

وہاں کیا کمی تھی اور کیا دیر، حکم ہوا اور ترقی ہوگئی مجھے اطلاع ہوئی مبارکباد بذریعہ خط بھیجی جواب آیا دور کی مبارکباد ہم قبول نہیں کرتے۔ میں نے جانے میں عذر لنگ پیش کیا دوسرا خط آیا، اس میں یہ شعر درج تھا۔

دیکھئے تجھ سے ملاتا ہے خدا کون سے دن
کون سی رات ہو مقبول دعا کون سے دن

شعر کے نیچے لکھا تھا: یہ شعر تم کو مخاطب کر کے لکھا گیا ہے میرے عذر کے جواب میں یہ مصرع تحریر تھا۔

"بیخود بہانہ ساز ہو تم جانتے ہیں ہم"

ہم کو تو بہانہ درکار تھا۔ مجنوں را ہوئے بس است، ادھر پروانہ، اُدھر میں روانہ ہوا۔

جانشینی | مرزا داغ کی عمر کے آخری دور میں کسی نے دریافت کیا کہ آپ کے بعد آپ کا جانشین کون ہوگا داغ نے جواب دیا "بیخودین" اس جواب سے داغ کا اشارہ بیخود بدایونی اور بیخود بدایونی اور بیخود دہلوی کی طرف تھا گو علم و فضل کے اعتبار سے دونوں بزرگ اپنا جواب نہ رکھتے تھے اور دونوں میں تعلقات بھی بہت گہرے تھے۔ بیخود صاحب نے بیخود بدایونی کے دیوان کی اشاعت کے وقت منظوم تقریظ بھی تحریر کی تھی لیکن زبان و بیان کے پیش نظر وہ خود بھی بیخود صاحب کی قدر کرتے تھے۔ اس وجہ سے یہ عین ممکن ہے کہ "بیخودین" کے پردے میں جانشینی کے لئے داغ کا ترجیحی اشارہ بیخود دہلوی کی طرف ہو، مگر جانشینی کے سوال پر شاگردانِ داغ بالخصوص اہل دہلی میں نواب سراج الدین خاں سائل دہلوی کو اعتراض تھا ان کا دعویٰ تھا کہ وہ داغ کے داماد ہیں۔ اور جانشینی کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔ اور وہ اس بات پر برابر مصر تھے کہ انہی کو جانشینِ داغ تسلیم کیا جائے بیخود صاحب کی دلیل تھی کہ داغ انہیں سب سے زیادہ مانتے ہیں اور اپنے شاگردوں کے جملہ رجسٹر داغ نے ان کے حوالے کر رکھے ہیں اور شاگردوں کو اصلاح کی اجازت دی ہوئی ہے، اس لئے وہ جانشینی کے زیادہ مستحق ہیں یہ اختلاف اس قدر بڑھے کہ سائل اور بیخود کے شاگردوں میں گروپ بندی قائم ہوگئی اور بیخود صاحب نے دہلی کے مشاعروں میں شرکت تک بند کر دی۔ لیکن پھر دہلی کے

---

[1] افسانۂ داغ مرتبہ احسن مارہروی ص ۱۰۲ - ۱۰۳

چند بزرگوں کے درمیان میں پڑنے اور سائل صاحب کے صاحبزادے نواب قطب الدین احمد خاں فصیح کے شاگرد بیخود ہو جانے کے بعد صلح صفائی ہوگئی اور بعد میں یہ مسئلہ اس وقت آخری طور پر طے ہوگیا جب مرزا داغ کے بھائی مرزا خورشید عالم نے بیخود صاحب کے سر پر داغ کی جانشینی کی دستارِ فضیلت باندھ دی۔ اس سلسلہ میں مولوی سید احمد دہلوی مصنف فرہنگِ آصفیہ نے اپنے بیان میں مولانا حالی کی مندرجہ ذیل تحریر نقل کی ہے جس سے حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔

"رُوداد جلسۂ دستار بندی و جانشینی نواب فصیح الملک بہادر داغ دہلوی مرحوم دیکھ کر مجھے بے انتہا مسرت ہوئی اور اس بات کا افسوس ہوا کہ جلسۂ مذکور میں مجھ کو شریک ہونے کا موقع نہ ملا میں عزیزی و شفیقی سید وحید الدین احمد صاحب بیخود کو بلاشبہ داغ مرحوم کی جانشینی کا مستحق جانتا ہوں اور اُن کا رشید ترین شاگرد اور شاعری میں اُن کے قدم بقدم چلنے والا سمجھتا ہوں۔ اور جہاں تک مجھے معلوم ہے فصیح الملک مرحوم بھی ان کو ارشد تلامذہ میں شمار کرتے تھے اور اپنی جانشینی کا سب سے زیادہ مستحق سمجھتے تھے۔"[1]

راقم خاکسار الطاف حسین حالی بقلم خود

۱۷ فروری ۱۹۰۸ء

مولانا حالی کے اس مستند بیان پر مستزاد یہ کہ شاگردانِ داغ میں بیخود صاحب کا بھی احترام کرتے تھے شاعری میں زبان و بیان محاورات اور روزمرہ نیز دوسرے شعری مسائل پر ان کے خیالات اور فیصلے سند کی حیثیت رکھتے تھے، دُور، دُور سے لوگ نکاتِ شعری سمجھنے، فکروفن اور زبان و محاورے میں اپنے شبہات دور کرنے کے لیے ان سے رُجوع کرتے تھے، خود مرزا داغ بھی شعروسخن اور فکروفن کے بعض مسائل میں بیخود صاحب کی رائے کی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ دِلّی کی ٹیکسالی زبان کا استعمال اُن کے یہاں جس قدر اہتمام کے ساتھ گفتارِ بیخود اور درِ شہوارِ بیخود میں ملتا ہے وہ اپنا جواب آپ ہے اسی وجہ سے انھیں داغ ثانی بھی کہا گیا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ دنیائے ادب نے انھیں جانشینِ داغ تسلیم کیا ہے۔

مشاغل اور دلچسپیاں صاحب جائیداد اور متمول ہونے کے باوجود اپنے علم وفن کے تقاضے اور دلی ذوق و شوق کی تسکین کے لئے بیخود صاحب نے درس و تدریس کی خدمت اختیار کی اور تقریباً ۲۲ سال تک انگریزوں اور غیر اُردو داں افراد کو اُردو، فارسی کی تعلیم دی۔ اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ غیر ملکیوں کو اپنی زبان پڑھانے کے لیے جو مہارت ہونی چاہیے اور پڑھنے والوں کی زبان پر جو عبور ہونا چاہیے وہ سب بیخود صاحب کو حاصل تھا۔

[1] گفتارِ بیخود مرتبہ مولوی سید احمد دہلوی ص ۲۴۱

خاندانی روایات کے مطابق شہ سواری، سپہ گری، سیر و شکار، پیراکی، پہلوانی، پتنگ بازی، کبوتر بازی کے علاوہ اور دوسرے فنون میں بھی بیخودؔ صاحب کو گہری دلچسپی تھی۔ رنگینؔ دہلوی کی طرح شہ سواری کی باریکیوں، گھوڑے کی نسلوں اور اُن کے عیب و ہنر پر گہری نظر رکھتے تھے وہ اس فن کے سلسلے میں مرزا داغؔ سے رجوع کرتے تھے۔ داغؔ کے ایک خط سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے، جو انھوں نے بیخودؔ صاحب کو جواباً تحریر کیا تھا۔

"چکاول[1] کے باب میں جو لکھا ہے پہلے یہ لکھو کہ گھوڑے کا سن کیا ہے چکاول کتنے زمانے سے ہے، کیا کیا علاج ہوئے ہیں، ورم تحلیل کیا گیا یا مادہ بہایا مفصل لکھو تو کچھ میں بھی لکھوں۔"

سپہ گری اُن کا آبائی فن تھا۔ تلوار چلانا، تیر اندازی کرنا، اور بندوق کا نشانہ وہ خوب جانتے تھے، سیر و شکار کا انھیں بے حد شوق تھا وہ چھوٹا بڑا ہر قسم کا شکار کھیلتے تھے، نوابوں، راجاؤں وغیرہ سے اُن کے گہرے تعلقات تھے۔ خاص طور پر مہاراجہ گوالیار سے اُن کی اچھی دوستی تھی۔ اُن کے سیر و شکار اور نشانہ بازی کے قصے بہت مشہور ہیں جن میں سے کچھ پر شاہد احمد دہلوی نے بڑے پُرلطف انداز میں روشنی ڈالی ہے۔[2] پیراکی بھی اُن کا پسندیدہ مشغلہ تھا، دلّی کی پیراکی تعلیموں سے وہ وابستہ تھے جمنا کے پیراکی میلوں اور مقابلوں میں وہ پیش پیش رہتے تھے۔ پیراکی کے فن سے انھیں کماحقہ واقفیت تھی، ان کے جسم کی ساخت اور مختلف اعضا کی بناوٹ سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ناسخؔ لکھنوی کی طرح یقیناً کبھی پہلوانی کرتے ہوں گے اور کشتی بھی لڑتے ہوں گے۔ وہ نجی صحبتوں میں دوستوں سے فنِ کشتی پر بڑی دلچسپی سے باتیں کرتے تھے، اور یہ جان کر حیرت ہوتی تھی کہ اس فن کے داؤ پیچ پر ان کی کتنی گہری نظر ہے۔ پتنگ بازی اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس فن کے بڑے بڑے ماہر اُن سے پتنگ لڑانے اور کاٹنے کے طریقے جاننے آتے تھے۔ کبوتر بازی کے وہ دیوانے تھے، انھوں نے بہت سی

---

[1] انشائے داغؔ مرتبہ احسن مارہروی ص ۹۰

[2] گنجینۂ گوہر اُستاد بیخود دہلوی ص ۵۵-۵۶

قسم کے کبوتر آخری عمر تک پال رکھے تھے وہ لوگوں سے کبوتر کی نسلوں، قسموں اور کبوتر بازی کے مختلف گروں پر بڑے مزے لے لے کر باتیں کرتے تھے بعض اوقات کبوتر بازی میں اُن کی دلچسپی اور انہماک اس قدر گہرا ہوتا تھا کہ وہ کسی اور کام پر توجہ نہیں دیتے تھے۔

بیخود صاحب ایک دین دار آدمی تھے وہ شرافت و طریقت دونوں کے دلدادہ تھے اعتکاف چلّہ کشی اور عبادت میں مصروف رہنا اُن کے شب و روز میں شامل تھا، ہزار دانے کی تسبیح اُن کے ہاتھ میں رہتی تھی اور وہ زبان پر ہر وقت اللہ کا ورد جاری رکھتے تھے۔ بیماروں اور سحر زدوں کا علاج کرتے تھے۔ تعویذ، گنڈے اور جھاڑ پھونک کے ذریعہ بد رُوحوں سے بندگانِ خدا کو نجات دلانا اور چھتنی، بھوت، پریت، آسیب اور جن اُتارنا انھیں خوب آتا تھا۔ وہ بعض اوقات جب مُوڈ میں ہوتے تھے تو بڑے لُطف کے ساتھ انسانوں کو پریشان کرنے والی پلید روحوں کا ذکر کرتے، اور بیان کرتے تھے کہ وہ کس طرح ان کو کیفر دار تک پہنچاتے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی نے اُن کے اس کمال پر انھی کی زبان میں روشنی ڈالی ہے عام طور پر ضرورت مند ان سے ملنے صبح اور شام دونوں وقت آتے تھے اور اپنی پریشانیاں بیان کر کے تعویذ گنڈے اور دم کیا ہوا پانی وغیرہ لے جاتے تھے۔ بیخود صاحب انھیں ورد وظائف بھی بتاتے تھے۔ ان میں سے بہت سے بندگانِ خدا کو صحت بھی ہو جاتی تھی۔ یہ شغل اُن کی زندگی کے آخری دنوں تک جاری رہا۔ تصوّف و روحانیت کے نقوش ان کے کلام میں موجود ہیں۔ ان کے بیشتر اشعار میں وحدت الوجود کی روح کارفرما ہے وہ بزرگانِ دین، صلحائے کاملین اور اولیائے کرام کے بڑے معتقد تھے۔ اُن سے گہری عقیدت کو انھوں نے اپنے اشعار میں بھی جگہ دی ہے جس سے بیخود صاحب کے کلام میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو گئی ہے نیز اس طرح جہاں اُن کے عقائد کا پتہ چلتا ہے، وہاں وہ اپنے معاصرین میں الگ نظر آتے ہیں صوفیانہ خیالات آدمی میں جو خلوص، محبت، مذہبی رواداری، انساں دوستی، وسیع النظری اور فراخ دلی کے جذبات پیدا کر دیتے ہیں، وہ سب بیخود صاحب کی ذات میں موجود تھے اُن کے دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں میں مختلف مکتبِ خیال، مذہب و ملت اور افکار و نظریات کے لوگ شامل تھے۔

---

[۱] گنجینۂ گوہر۔ استاد بیخود دہلوی ص ۵۳

جس سے اُن کے تعلقات بڑے مخلصانہ و دوستانہ اور مشفقانہ تھے۔ یوں تو ہندوستان بھر میں لوگوں سے اُن کے گہرے مراسم تھے لیکن دِلّی والوں میں حکیم عبدالمجید خاں، حکیم اجمل خاں، خواجہ حسن نظامی خواجہ ناصر نذیر فراق، لالہ سری رام ایم۔ اے (مولف خمخانہ جاوید) لالہ سری رام (دلّی کلاتھ مل والے) لالہ ملاپ چند جوہری، لالہ الوپی پرشاد۔ پنڈت تربھون ناتھ زار دہلوی اور نواب سراج الدین احمد سائل دہلوی وغیرہ سے اُن کے خصوصی تعلقات تھے ان بزرگوں میں پنڈت امرناتھ مدن ساحر اور نواب سائل دہلوی سے بعض علمی معاملوں پر ان کی چلتی بھی رہتی تھی۔ انھوں نے ساحر کی بزمِ سخن کی شعری نشستوں میں تو آنا جانا ترک کر دیا تھا لیکن وضعداری کا یہ عالم تھا کہ دونوں مزاج پرسی کے لیے ایک دوسرے کے گھر ضرور آتے جاتے تھے۔ بیخود صاحب نے کچھ وقفہ کے لیے ان مشاعروں میں بھی شرکت بند کر دی تھی جن میں نواب سائل شریک ہوتے تھے۔ لیکن دونوں میں ادب و احترام کے رشتے کبھی نہیں ٹوٹے۔ سائل صاحب نے اپنے بیٹے نواب قطب الدین احمد فصیح کو بیخود صاحب کی شاگردی میں دے دیا تھا اور بیخود صاحب نے بھی فصیح کی شاعرانہ تربیت پر اپنے حقیقی بیٹے سے زیادہ توجہ دی تھی۔

جمیل الدین عالی کے قول کے مطابق سائل کی وفات کے وقت بیخود پھوٹ پھوٹ کر روتے تھے اور اُن کو اکیلا چھوڑ کر جانے پر بے وفا، وعدہ شکن اور دشمنِ بےخود کہتے تھے۔ اس سے اس سے بیخود کی محبت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مشاعرے

بیخود صاحب نے اپنی زندگی میں عظیم سے عظیم اور یادگار مشاعروں میں شرکت کی۔ اس دور کے اساتذہ اور اپنے ہم عصروں کے سامنے کلام پڑھ کر دادِ سخن حاصل کی، مشاعروں میں ان کی شرکت، مشاعروں کی کامیابی کی ضامن ہوتی تھی۔ دلی کے علاوہ دِلی کے باہر کے مشاعروں میں بھی وہ شریک ہوتے تھے۔ حالانکہ بعض اوقات احباب سے اختلاف اور اپنی نازک مزاجی کی بناء پر کچھ عرصے کے لیے انھوں نے دِلّی کے مشاعروں میں شرکت موقوف کر دی تھی پھر بھی بعض خصوصی احباب کے اصرار پر کہیں کہیں چلے جاتے تھے۔

مشاعروں کے سلسلے میں اُن کے متعلق بہت سے دلچسپ قصے مشہور ہیں۔ ان میں سے کچھ اس طرح بیان کئے جاتے ہیں:

ایک دفعہ دلّی کے ٹاون ہال میں ایک شاندار مشاعرہ ہوا۔ بیخود صاحب تازہ غزل کہہ کر لے گئے۔

وہ زیادہ تر اپنی غزل کسی خوش آواز شاگرد سے پڑھواتے تھے اس روز وہ خوش آواز شاگرد مشاعرے میں نہ پہنچ سکا۔ مشاعرے میں سامعین نے بے خود صاحب کو دیکھ کر جب فرمائشیں شروع کیں اور اصرار بڑھنے لگا تو منتظمین مشاعرہ نے بیخود صاحب سے درخواست کی۔ بیخود صاحب نے ایک اور شاگرد سے جو بد آواز تھا اور موزوں طبع بھی نہ تھا، غزل پڑھنے کے لیے کہا۔ اس نے اپنی بھدی آواز میں شعر ناموزوں پڑھنے شروع ہی کیے تھے کہ مشاعرے میں عجیب طرح شور بلند ہونے لگا۔ بیخود صاحب سمجھے کہ داد مل رہی ہے۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ یہ داد نہیں بیداد ہے تو وہ آپے سے باہر ہوگئے اور بڑے غصے کے عالم میں مائک پر آئے اور شاگرد کے ہاتھ سے غزل چھین لی۔ اس واقعہ کی منظر کشی کرتے ہوئے شاہد احمد دہلوی کا بیان ہے۔

> مشاعرے میں کھلبلی مچ گئی اور اک شور قیامت برپا ہوگیا۔ بارے بیخود صاحب کا کڑا کا سنائی دیا اور انھوں نے اپنے شعر تحت اللفظ پڑھنے شروع کردیئے ہال میں سناٹا چھاگیا۔ شعر ختم ہوتا تو داد کا شور بلند ہوتا سبحان اللہ غزل کا تو ان کی جواب ہی ہوتا تھا مشاعرہ انہی کے ہاتھ رہا"

ایک زمانے میں دستور تھا کہ اساتذہ ہمیشہ بعد میں اپنا کلام پڑھتے تھے۔ شروع میں مبتدیوں کو پڑھوایا جاتا تھا۔ اور بعد میں کم سینیر لوگوں کو، پھر آخر میں اساتذہ کا نمبر آتا تھا۔ سامعین اساتذہ کو سننے کے لیے مشاعرے میں آخر تک بیٹھے رہتے تھے۔ صدر یا ناظم مشاعرہ کی طرف سے اگر تقدیم و تاخیر کے معاملے میں ذرا بھی چوک ہوتی تھی تو قیامت برپا ہوجاتی تھی اور ماحول کو قابو میں لانا مشکل ہو جاتا تھا۔

ایک مرتبہ دلی کی ہارڈنگ لائبریری میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ سر رضا علی صدارت کر رہے تھے جو بڑے موقعہ شناس تھے، احباب کسی نہ کسی طرح بیخود صاحب کو بھی رضامند کر کے مشاعرے میں لے گئے۔ باہر کے مہمانوں میں ثاقب لکھنوی بھی موجود تھے۔ سب شاعروں نے جب پڑھ لیا اور صرف بے خود و ثاقب باقی رہ گئے تو صدر مشاعرہ نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر اعلان کیا کہ اب دو محترم بزرگ باقی رہ گئے ہیں، ان میں سے جو صاحب چاہیں گے پڑھیں گے۔ اس پر بیخود صاحب نے پہلے پڑھنے کی خواہش ظاہر کی، ثاقب صاحب نے کہا پہلے میں پڑھوں گا۔ بیخود صاحب نے

اصرار کیا پہلے مجھے پڑھنے دیا جائے، ثاقب صاحب مُصر تھے کہ پہلے میں ہی پڑھوں گا۔ غرض یہ کہ دونوں بزرگ پڑھنے کے لیے ایک دوسرے پر تقدم چاہتے تھے اور دونوں کی پہلے میں ہی پڑھوں گا، کی تکرار واصرار سے مشاعرہ کیا سے کیا بنتا جا رہا تھا اس کیفیت کا خلاصہ شاہد احمد دہلوی کی زبانی سنئے:

"مشاعرہ میں ہنسی پڑ گئی، قصہ مختصر۔ بیخود صاحب نے فرمایا: آپ ہمارے مہمان ہیں اس لیے پہلے میں پڑھوں گا۔ میرے بعد آپ پڑھیں گے یہ کہہ کر پڑھنے بیٹھ گئے۔"

تقسیم ہند کے بعد غالباً ۱۹۴۸ء میں جب حالات ذرا سازگار ہوئے تو آنجہانی سر شنکر لال کی کوٹھی نئی دہلی میں ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوا جس میں اس وقت کی نامور ہستیاں شریک ہوئیں نوح ناروی زار دہلوی، جوش ملیسانی، جگر مراد آبادی، اور دیگر مشہور اساتذہ کے علاوہ اُستاد بیخود بھی بڑی آب وتاب کے ساتھ شریک مشاعرہ تھے۔ مشاعرہ کے آخر میں بیخود صاحب سے درخواست کی گئی۔ بیخود صاحب مائک کے سامنے آئے کہ ہر نگاہ ان کی طرف اُٹھ گئی اور سامعین ہمہ تن گوش ہو گئے۔ بیخود صاحب نے اپنی پُر رعب اور گرجدار آواز میں تحت اللفظ شعر پڑھنے شروع کیے تو فضائیں گونج اُٹھیں۔

کس شعر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن، ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے

بیخود صاحب کا تحت اللفظ پڑھنے کا انداز کچھ ایسا دلکش اور متاثر کرنے والا ہوتا تھا کہ اُس پر ہزار ترنم قربان کیے جا سکتے تھے وہ شعر پڑھتے وقت لفظوں کو اس خوبی کے ساتھ ادا کرتے تھے کہ زبان کا لطف آجاتا تھا۔ اور ہر لفظ کے معنی دل نشیں ہو جاتے تھے۔ یہی حال اس مشاعرہ میں بھی تھا، وہ مصرع پڑھتے شعراء مصرع دہراتے، ادھر وہ شعر ختم کرتے اور اُدھر سبحان اللہ واہ، واہ اور مرحبا کا شور بلند ہوتا، پوری غزل انھوں نے ایسی فضا میں پڑھی اور مشاعرہ لوٹ لیا۔

بیخود صاحب نے تقسیم ہند کے بعد بہت سے نمائندہ مشاعروں میں شرکت کی۔ لال قلعہ کے جشن آزادی کے ایک مشاعرہ میں ان کی شرکت تاریخی حیثیت رکھتی ہے آل انڈیا ریڈیو نے ۶۰ سال سے اُوپر کی عمر والے بزرگوں کا ایک مشاعرہ کیا تھا جس میں وہ صفِ اول میں تھے یہ

مشاعرہ بھی اپنی جگہ غیر معمولی یادگار ہے۔

بیخود صاحب روایات کے آدمی تھے۔ دلّی اور اس کے مشاعرے اُن سے عبارت تھے اُن کے زمانے میں آدابِ محفل کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا۔ مشاعرے میں سامعین بڑے مؤدب، بہت محتاط اور ہمہ تن گوش ہوتے تھے۔ ان کے سامنے کوئی دم نہ مارتا تھا۔ مصرع اُٹھانا شعر دُہرانا مکرر پڑھنے کے لیے کہنا، شعور اور حوصلہ چاہتا تھا۔ لوگ انھیں سننے کے لیے اختتام تک بیٹھے رہتے تھے اور اُن کے کلام سے استفادے کے بعد ہی رخصت ہوتے تھے۔ غرض یہ کہ اُن کے دور کے مشاعرے اب دلّی کی تاریخ کا حصّہ بن گئے ہیں۔ ان کے بعد کوئی مشاعرہ ایسا منعقد نہ ہو سکا جو اُن کے دنوں کی یاد تازہ کرتا، وہ دنیا سے کیا گئے، اپنے ساتھ ایک زمانے کی تہذیب شائستگی دیرینہ روایات، اور گذشتہ مجلسی زندگی کی یادیں بھی لے گئے۔

بذلہ سنجی و حاضر جوابی

بیخود صاحب باغ و بہار، پُر مذاق اور خوش مزاج آدمی تھے حاضر جوابی میں اُن کا جواب نہ تھا۔ شعر و سخن کے بحث و مباحثے میں اُنھیں کوئی شکست نہیں دے سکتا تھا دلّی والوں کی طرف سے باہر والوں کو ترکی بہ ترکی جواب دینے والوں میں وہی پیش پیش رہتے تھے، ان کے ادبی معرکے دلچسپ لطائف اور خوش مذاقی کے قصّے یوں تو بہت ہیں، لیکن کچھ ایسے ہیں جن کا جواب نہیں، ملاحظہ ہو:

ایک بار حضرت صفی لکھنوی نے کسی محفل میں اُستاد بیخود سے دریافت کیا:

"ان دنوں ملک میں مستند اور باکمال شاعر کون ہیں؟

اُستاد پہلے تو ٹال گئے، لیکن جب صفی صاحب نے اصرار کیا تو فرمایا:

"بس دو ہیں، آپ اور میں۔" اور کچھ تامل کے بعد کہا "اور آپ بھی کیا؟"

شاہد[۱] احمد دہلوی نے اُن کا ایک دلچسپ لطیفہ نقل کیا ہے:

"جارج پنجم کی تخت نشینی اور دلّی میں دربار کرنے کے موقع پر بیخود صاحب نے ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا تھا۔ قصیدے کے آخر میں خاصی تعلّی بھی تھی۔ منشی دین صاحب کو جب قصیدہ سنایا

---

[۱] گنجینۂ گوہر۔ استاد بیخود دہلوی ص ۵۵

تو منشی جی نے کہا!

"آپ نے اپنا مرتبہ بھی بادشاہ کے لگ بھگ ہی کرلیا!"

بیخود صاحب نے فرمایا:

"اور کیا؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں اُن سے کچھ کم ہوں؟ وہ بادشاہ ملک ہیں تو میں بادشاہ سخن ہوں۔"

گلزار[1] دھلوی نے ایک واقعہ اس طرح بیان کیا ہے:

ایک مرتبہ چچا استاد بیخود نوح ناروی سے کچھ برگشتہ خاطر ہوگئے۔ ایک ملاقات میں فرمانے لگے۔

"میاں دیکھتے ہو بیٹے! وہ نوح صاحب ہمیں شعر کہہ کے دینے لگے۔"

میں نے پوچھا، حضور کیسے؟

فرمایا، اُن کا مصرع ہے ؎

پردے میں دہلوی کے کوئی ناروی تو ہے

میں کچھ مزاج سے واقف تھا، میں نے مودبانہ عرض کی:

'قبلہ! وہ تو آپ کی اور دِلی کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ کسی نے آپ کو غلط طریقہ پر بہکایا ہے۔"

پوچھا — کیوں کر؟

میں نے نوح صاحب کا ایک اور شعر سنایا ؎

سو وصف تجھ میں ہوں مگر اے نوح ناروی
یہ داغ ہے ضرور کہ تو دھلوی نہیں

بس یہ شعر سن کر ایک قہقہے میں سب غصہ تھوک دیا۔ اب جو نوح صاحب قبلہ دہلی تشریف لائے تو اُسی طرح بغل گیر ہوئے۔"

شاہد احمد دہلوی ہی کی زبان میں اور قصہ سنیئے!

---

[1] بیخود دہلوی ہفت روزہ آئینہ نئی دہلی مورخہ ۳۱ ر اکتوبر ۱۹۵۵ء، ص ۵

ایک مہربان اپنے صاحبزادے کو لے کر عین اس وقت پہنچے، جب اُستاد کی جان کبوتروں میں پڑی ہوئی تھی، بہت مکدّر ہوئے، بُرا بھلا کہتے نیچے آئے، مہربان نے مٹھائی کی ٹوکری پیش کی اور بولے:

"یہ میرا لڑکا ہے شعر کہتا ہے، اسے شاگردی میں قبول فرمالیجئے"۔ ٹوکری تو استاد کا پوتا لے کر فوراً اندر چلا گیا۔ اور اُستاد نے فرمایا۔ اپنے کچھ شعر سناؤ۔ وہ شامت کا مارا نہ جانے کس سے لکھواتا تھا، لگا ناموزوں شعر سنانے۔ بےؔخود صاحب بکھر گئے۔ بولے "نکل میرے گھر سے باہر نکل"۔ کھڑے کھڑے اسے اور مہربان کو گھر سے نکالا اور کنڈی لگا، اوپر جاکر پھر کبوتر اڑانے لگے"

مرزا داؔغ کے ساتھ بیخوؔد صاحب کی پہلی ملاقات کے سلسلے میں بھی ایک قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے:

بیخوؔد صاحب اپنے ماموں عبدالرحیم خاں بیدل کے ہمراہ جب مرزا داؔغ کی خدمت میں شاگردی کی غرض سے پہنچے تو داؔغ اس وقت اپنے احباب کے ساتھ دسترخوان پر تھے بیخودؔ صاحب سے گفتگو کے دوران وہ کھانے میں بھی مصروف رہے۔ داؔغ کے تقاضے پر بیخوؔد صاحب اپنا کلام سناتے رہے داغ، بیخوؔد کی نوعمری کے عالم میں زبان و محاورے سے مرصّع اور پختہ شعر سن کر بہت متاثر ہوئے اور اس قدر جوش میں آئے کہ جس انگلی سے وہ حلوا چاٹ رہے تھے اُس انگلی کو بیخوؔد صاحب کے آگے کرتے ہوئے کہا کہ اسے چاٹ لو۔ بیخوؔد صاحب نے وہ انگلی چاٹ لی۔ چنانچہ۔ انھوں نے پھر وہ شعر کہے کہ دنیائے شعر و ادب سے داد حاصل کی اور زندگی بھر کسی نے اُن کے کلام پر انگلی نہ اٹھائی۔

ان باتوں کے علاوہ اُستاد بیخوؔد زبان و بیان کی باریکیوں، شعر و سخن کے نکات، الفاظ و معنی کی بحثوں، ضرب الامثال کی نوک پلک کے مسائل فصیح و غیر فصیح کے مباحثوں، اور دیگر بہت سے شعری معاملات پر دلائل دینے کے لئے سینہ سپر رہتے تھے۔ ان کے سامنے کوئی مشکل ہی سے ٹک پاتا تھا وہ اپنے حریف کو شکست دینے اور اُس سے اپنی بات منوانے کے استاد انہ گر جانتے یہی وجہ تھی کہ اپنی زندگی میں انھوں نے دلّی کا سر کبھی نیچا نہ ہونے دیا۔ اس سلسلے میں کئی واقعات مشہور ہیں ایک اس طرح بیان کیا جاتا ہے۔

باہر کا کوئی شخص کسی کے خاص ایما سے دلّی آیا دِلی کے شعرا سے مل کر آمد کی غرض وغایت بیان کی اور زبان و بیان اور محاورہ و روزمرّہ سے متعلق اپنے کچھ شبہات دور کرنے کے لیے دلّی کے اساتذہ میں کسی معتبر و مستند شاعر سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو اسے بیخودؔ صاحب سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا گیا ـــــ کسی نے بیخودؔ صاحب کو بھی اس بات کی اطلاع دے دی کہ کوئی شخص اس مقصد سے ملنے کا خواہشمند ہے۔ بیخودؔ صاحب سارا معاملہ بھانپ گئے۔ وقت طے ہوا۔ ملاقات ہوئی، اس شخص نے زبان و محاورے سے متعلق اپنے سوال پیش کئے۔ بیخودؔ صاحب تو پہلے ہی تیار تھے فوراً جواب میں کچھ ایسے سوال کر ڈالے کہ وہ چوکڑی بھول گیا اور لگا، بغلیں جھانکنے۔ جب اس کو اپنا بھانڈا پھوٹتا نظر آیا تو خفیف ہو کر بیخودؔ صاحب سے رخصت کی اجازت مانگنے لگا لیکن بیخودؔ صاحب اس کے پیچھے پڑ گئے، تنگ آکر جب وہ بھاگنے لگا تو بیخودؔ صاحب نے کہا کیوں بے بہروپئے اپنا بھید تو دیتا نہیں اور ہم دلّی والوں کی ٹوہ لینے آیا ہے "ٹھہر تو سہی تجھے ابھی مزا چکھاتا ہوں۔" یہ سن کر وہ اس طرح سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا کہ پھر دلّی کا رُخ نہ کیا۔"

بیخودؔ صاحب کا ایک دلچسپ واقعہ اس طرح ہے کہ:

ایک صاحب کو اپنی شاعری پر بڑا زعم تھا۔ ان کے نوعمر شاگردوں کی ٹولی اُن کی ہوا باندھنے میں پیش پیش رہتی تھی کبھی کبھی وہ خود بھی ہوا بازی کے جوش میں ایسے آجاتے تھے کہ اُستادوں کو بھی نہیں بخشتے تھے۔ اُڑتے اُڑتے یہ خبر استاد بیخودؔ کے کانوں تک بھی پہنچ گئی اتفاق سے کسی محفل میں شاعر موصوف اپنے نوعمر شاگردوں کی ٹولی کے ساتھ بیخودؔ صاحب کو مل گئے۔ بیخودؔ صاحب نے موقع غنیمت جان کر تیر چھوڑا:

"کیوں میاں صاحبزادے! اب ایسوں کے بھی منہ کو آنے لگے ہو جنھوں نے بچپن سے اب تک خلوت و جلوت میں نہ جانے تمہیں کس کس عالم میں دیکھا ہے، میاں تم تو کیا، ایک بار تمہارے اُستاد نے بھی بل کی لی تھی، تو ہم نے انھیں یہ شعر سنا دیا تھا ؎

نہ خنجر اُٹھے گا، نہ تلوار ان سے

یہ بازو مرے آزمائے ہوئے

وہ ہوشیار تھے سمجھ گئے، زندگی بھر سنبھل کر رہے۔ اب تم یہ شعر سن لو:

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

بیخود صاحب کا نشانہ ٹھیک بیٹھا۔ شاعر موصوف اپنے شاگردوں کے جھمگٹ میں عرق عرق ہوگئے دوسرے روز یہ بات سارے شہر میں مشہور ہوگئی اور بیچارے شاعر صاحب کو پھر دلّی کے مشاعروں میں کسی نے نہیں دیکھا۔

آخر میں ایک پر لطف قصہ اور سن لیجیے:

کسی نے استاد بیخود کو اپنا کلام اسی دعوے کے ساتھ بھیجا کہ اگرچہ وہ دلّی والا نہیں، لیکن دلّی کے زبان و بیان کی سب خوبیاں اُس کے کلام میں موجود ہیں نیز زبان کی سند کے لیے دہلوی ہونا ضروری نہیں۔

اُستاد بیخود نے معاملے کو تاڑ کر جواب دیا۔

میر نے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر زبان سیکھی، دِلّی سے لکھنؤ تک دہلوی زبان کی حفاظت کی۔ ذوق نے دکن کی قدرِ سخن کے مقابلے میں دلّی کی گلیوں کو مرتے دم تک اس لیے نہیں چھوڑا کہ کہیں زبان نہ بگڑ جائے۔

غالب قحطِ غمِ الفت کے باوجود اس معمورے میں یوں آباد رہے کہ زبان برباد نہ ہوجائے اس لیے اگر دہلوی زبان میں شعر کہتے ہیں تو قلعۂ دلّی کی ہوا کھائی ہوگی، جامع مسجد کا طواف کرنا ہوگا، اور اُردو بازار کی خاک چاٹنی ہوگی:

شاگرد

بیخود صاحب کے شاگردوں کی تعداد تقریباً تین سو بتائی جاتی ہے جن میں مقامی وغیر مقامی، ہندو مسلمان شامل ہیں۔ ان شاگردوں میں نواب قطب الدین احمد فصیح، ابن سائل، عاصی نظامی، صابر دہلوی وغیرہ تو پاکستان منتقل ہو گئے تھے۔ آغا حیدر حسن قدر دہلوی حیدر آباد دکن جا بسے تھے۔ لالہ پنالال جوہری، لالہ شنکر لال شنکر، لالہ مرلی دھر شاد کیلاشی رام تمر، یکتا دہلوی۔ سید محی الدین سید (جعفری) ابن بیخود۔ تاب دہلوی ڈاکٹر مبین احمد سرشار دہلوی اُستاد رفیق احمد رسا دہلوی مخمور دہلوی۔ اختر ہاشمی راقم اور کچھ دوسرے شاگرد بیخود صاحب کی حیات میں دہلی

ہی میں تھے۔ان کے ایک عزیز شاگرد عبدالغفار قیصر دہلوی کی وفات ان کے سامنے ہوگئی تھی۔ ان کے علاوہ دیگر شاگردوں میں قمر، مسرور، خاور، ناقد میکش اور بشیر وغیرہ کے نام بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن کا ذکر خود انھوں نے بھی کیا ہے۔ بیخود صاحب کے آخری دنوں تک بھی یہ شاگردی کا سلسلہ قائم رہا۔

تقسیم ہند کے بعد پنالال جوہری، تنکر لال تنکر، مری دھر شاد راقم اور دلی میں مقیم دوسرے شاگرد بیخود صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ تنکر و شاد ان کی مالی خدمت بھی کرتے تھے شاد کی دلچسپی کی وجہ سے گفتارِ بیخود کا دوسرا ایڈیشن زیورِ طبع سے آراستہ ہوا تھا۔ اُستاد بیخود کو یوں تو اپنے تمام شاگرد بے حد عزیز تھے لیکن تنکر و شاد کی نیازمندی اور خصوصی توجہات نے اُستاد کا دل موہ لیا تھا۔ جس کا اظہار وہ بڑی محبت سے کرتے تھے۔ اپنے عقیدت مند شاگردوں کی بے پناہ محبت اور احترام سے متاثر ہو کر ہی انھوں نے کہا ہے۔

ہم جانتے ہیں بیتاب ہیں سارے شاگرد ۔۔۔ اللہ نے بخشے ہیں یہ پیارے شاگرد
جس طرح سے ہم داغ کے شیدائی تھے ۔۔۔ عاشق ہیں اُسی طرح ہمارے شاگرد

قیصر ہو قمر ہو یا ہو اس میں مسرور ۔۔۔ میکش ہو، بشیر ہو کہ دونوں مخمور
خاور سہی ناقد سہی یا قدر سہی ۔۔۔ دم بھر نہ رہے گا مرے دل کی کوئی دور

بیخود صاحب کے شاگرد بنانے کا طریقہ یہ تھا کہ جو شاگرد بننے کے لیے اُن کے پاس آتا، وہ اُس سے سوال کرتے کہ اس کا مبلغ علم کیا ہے، کتنے اساتذہ کا کلام اسے یاد ہے فکر و فن پر اس کی کتنی نظر ہے۔ اس کی مشقِ سخن کتنی ہے۔ زبان، محاورہ اور روز مرہ کے علاوہ عروض و بیان پر اُسے کس قدر عبور ہے؟

ان سب باتوں سے مطمئن ہونے کے بعد وہ شیرینی سے شاگرد کا منہ میٹھا کرتے، اس کا تازہ کلام سنتے اور ضروری اصلاح دیتے۔ ان حالات میں کبھی کبھی ناخوشگوار صورت بھی رونما ہو جاتی جس کی وجہ یہ ہوتی کہ وہ غلط زبان و محاورہ اور ناموزوں شعر سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ شعر جیسی لطیف شے کے ساتھ کسی بھی قسم کی بدمذاقی اُن کی طبع نازک پر گراں گذرتی تھی۔ جو غصے کے عالم میں بعض

اوقات انھیں حد اعتدال سے بھی گزار دیتی تھی اُن کا شاگرد ہونا خود کو مستقل آزمائش کی کسوٹی پر رکھنا تھا۔ اپنی سخت مزاجی کی وجہ سے بعض اوقات وہ شاگردوں سے اُلجھ جاتے تھے۔ اس میدان میں ثابت قدم اور مودب شاگرد ہی جم رہ سکتا تھا۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خلاف مزاج اور خلاف زبان و ادب کوئی بات سُننا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس معاملے میں اپنے پیر بھائیوں، معاصروں اور حریفوں سے آئے دن کچھ نہ کچھ اُن کی چلتی ہی رہتی تھی .... بعض شواہد کے مطابق وہ اپنے اُستاد مرزا داغ سے بھی اُلجھ جاتے تھے اور زبان و بیان کے معاملے میں اُن سے بھی بحث و مباحثہ کرتے نہیں چوکتے تھے۔

اولاد

بیخود صاحب کی اولاد میں ایک صاحبزادے سید محی الدین جو سید تخلص کرتے تھے اور تین صاحبزادیاں تھیں۔ سید صاحب بھی شاعری کرتے تھے اور بیخود صاحب کے شاگرد تھے وہ دراز قد، خوش رو، خوش طبیعت اور خوش مزاج آدمی تھے بیخود صاحب کے انتقال کے بعد وہ پاکستان چلے گئے تھے جہاں اُن کے لڑکے دلّی کلاتھ مل (لائلپور) میں ملازم تھے وہیں انھوں نے انتقال کیا۔ بیخود صاحب کی تینوں صاحبزادیاں بھی پاکستان چلی گئی تھیں۔

وفات

بیخود صاحب تقسیم ہند (۱۹۴۷ء) کے بعد ہندوستان میں ہی رہے خواجہ میر درد کی طرح انھوں نے بھی مرتے دم تک دلی نہیں چھوڑی۔ ہرچند کہ آمدنی کے ذرائع محدود ہو گئے تھے لیکن ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۳ء تک سابق وزیر اعظم ہند آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو انھیں کچھ وظیفہ دیتے رہے۔ اس کے بعد مرکزی وزارت تعلیم سے کچھ وظیفہ مقرر ہوا، جو زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکا۔ لیکن ان کے مالدار شاگرد لالہ شنکر لال شنکر، اور لالہ مرلی دھر شاد ان کی مالی مدد کرتے رہتے تھے۔

بیخود صاحب نے مشاعروں میں شرکت تو پہلے ہی بہت کم کر دی تھی۔ صرف گنے چنے نمائندہ مشاعروں اور جلسوں میں قریبی احباب کے اصرار پر شرکت کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ سلسلہ بھی کم ہوتا جا رہا تھا۔ وہ عام طور پر گھر میں زیادہ وقت گزارتے تھے۔ مطالعہ و شعر گوئی ان کے اس دور کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ اپنے ان آخری ایام میں اساتذہ کی زمینوں میں غزلیں کہہ رہے تھے۔ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ ان دنوں میں بھی وہ دوستوں سے ملنے، سودا سلف خریدنے اور کسی نہ کسی طرح چہل قدمی کے بہانے گھر سے روزانہ نکلتے تھے۔ ان کا یہ معمول زندگی کے آخری دم تک رہا۔

ضعیف العمری اور آئے دن کی بیماری کے سبب بیخود صاحب دن بدن کمزور ہوتے جا رہے تھے خوش خوراک ہونے کی وجہ سے وہ بعض اوقات بدپرہیزی سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ یونانی علاج معالجے کے ساتھ بدپرہیزی کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ چنانچہ ایک روز غیر معمولی اسہال شروع ہو گئے اور پھر وہ کسی طرح سنبھل نہ پائے۔ اسی حالت میں انھوں نے ۲ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو ۹۰ سال کی عمر میں انتقال فرمایا اور قبرستان درگاہ خواجہ باقی باللہ دلی میں انھیں دفن کیا گیا۔ اس طرح داغ کا جانشین قدیم تہذیب و شائستگی کا علمبردار اور دلی کی ٹکسالی زبان کا آخری تاجدارِ سخن، دنیائے ادب سے رخصت ہوا۔ پورے ہند و پاک اور خاص طور سے دلی میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ تعزیتی جلسے ہوئے اور ہر طرف سے یہی آواز آئی کہ ؎

زندہ تھا بیخود کے دم سے نام داغ و میر کا
آج رخصت ہو گیا وہ خانماں برباد بھی

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

علامہ پنڈت تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی

سخت گرمی کا موسم تھا غالباً جولائی ۱۹۴۲ء کے پہلے اتوار کی بات ہے۔ میں پہلی بار خواجہ شفیع کی اردو مجلس میں حاضر ہوا۔ مجھے حکومت ہند نے نیشنل فرنٹ کا آرگنائزر بنا کر دلی تعینات کر دیا تھا۔ میرے فرائض منصبی میں سب سے زیادہ اہم اور مفید کام ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دینا تھا اور یہ کام مجھے پسند بھی بہت تھا چنانچہ میں تمام تر انہماک کے ساتھ اس کام میں جُٹ گیا لیکن چونکہ اس کام کی تکمیل اور ترویج کے لیے مجھے علماء ادبا و شعرا اور سیاسی اور سماجی رہبران کے تعاون کی بھی سخت ضرورت تھی یہی غرض مجھے خواجہ شفیع کی اردو مجلس میں لے آئی۔ میں نے سن رکھا تھا کہ خواجہ شفیع کے ہاں ہر اتوار کی شام کو اردو مجلس کا اجلاس ہوتا ہے۔ چنانچہ اس شام میں اپنے دوست عزیز وارثی کی معیت میں وہاں پہنچا۔ اس شام دیگر شعرا اور ادبا کے علاوہ قبلہ زار صاحب بھی شریک مجلس تھے۔ خواجہ شفیع نے مجھے باری باری سب سے متعارف کرایا۔ زار صاحب کے علاوہ اس روز قبلہ خواجہ حسن نظامی مولانا ماہر القادری۔ فیض جھنجھانوی۔ صابر دہلوی رحیم اللہ قابل۔ خاصی نظامی رشید اخورجوی۔ پنا لعل جی جوہر اور کئی حضرات موجود تھے اردو مجلس میں شریک ہونے والوں کو اپنا تازہ ترین کلام سنانا ہوتا تھا۔ میں تو چونکہ پہلی ہی بار گیا تھا۔ میرا پرانے سے پرانا کلام بھی ان حضرات کے لیے تازہ ترین تھا۔ سب حضرات نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ قبلہ خواجہ حسن نظامی صاحب شعر نہیں کہتے تھے۔

لیکن سامع کے طور پر کبھی کبھی تشریف لے آتے تھے یا جب کبھی کسی ادبی مسئلہ پر بحث و مباحثہ ہوتا تو اس میں شرکت بھی کرتے تھے۔ سب کے بعد خواجہ شفیع نے قبلہ زار صاحب کو دعوت کلام دی۔ یہ تھی قبلہ زار سے میری پہلی ملاقات۔ اس ملاقات کے بعد تادم حیات ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اور اردو مجلس کے علاوہ بھی کئی بار ان کی خدمت میں حاضر ہونے کے مواقع ملے۔ ان کے دولت کدہ پر بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ ہر بار ان کے علم و فضل سے متاثر ہوا اور میرے دل میں ان کے لیے عقیدت و احترام میں اضافہ ہوتا گیا۔

ان دنوں دلی میں فصیح الملک جہاں استاد نواب مرزا داغ دہلوی کے تین ممتاز شاگرد تھے۔ نواب سائل، بے خود اور قبلہ زار۔ یہ تینوں اساتذہ تو دلی میں تھے۔ لیکن داغ صاحب کے شاگرد دلی کے علاوہ بھی آسمان شاعری پر درخشندہ و تابندہ ستاروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ علامہ اقبال کا تو انتقال ہو چکا تھا لیکن سیماب اکبرآبادی۔ دل شاہجہاں پوری نوح ناروی ناطق گلاوٹھی اور لبھورام جوش بقید حیات تھے اور اپنے اپنے حلقہ اثر و رسوخ میں اردو کی نمایاں خدمت کر رہے تھے۔

مجھے ان سب حضرات سے ملنے اور کلام سننے کا اتفاق ہوا۔ بے خود سائل اور نوح تو داغ صاحب ہی کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے لیکن ڈاکٹر اقبال اور قبلہ زار کا رنگ اپنے استاد سے بالکل الگ تھا۔

قبلہ زار دہلی کی تہذیب اور تمدن۔ وضع قطع اور روایات کے پابند تھے چوڑی دار پائجامہ۔ شیروانی شیروانی ہی کے رنگ کی ٹوپی پاؤں میں دلی کی نرم و نازک جوتی اور سفید جرابیں۔ ہاتھ میں چھڑی منہ میں گلوری اور جیب میں سفید رومال۔ میں نے انہیں جب بھی دیکھا اسی لباس میں دیکھا۔

خواجہ شفیع کی مجلس میں کبھی کبھار کسی ادبی مسئلہ پر بھی گفتگو ہوتی تھی۔ میں بھی دو ایک ایسے مواقع پر موجود تھا۔ ایک بار زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ صحیح ترکیب روحِ رواں ہے یا روح و رواں۔ ایک مرتبہ شروعات کی ترکیب بھی زیر بحث رہی۔ ان مباحثوں میں فیض جھنجھانوی۔ رحیم اللہ قابل خواجہ حسن نظامی۔ پنڈت برج موہن دتاتریا کیفی اور قبلہ زار نے بھی حصہ لیا۔ ان تراکیب کے حق میں اور خلاف سب نے اپنی دلائل پیش کیں۔ بڑی دلچسپ بحث رہی جس سے مجھ ایسے کم علم لوگوں نے استفادہ کیا۔

قبلہ زار زبان اور بیان پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ فن و فکر پر عبور حاصل تھا بہت کم بولتے تھے لیکن جب بولتے تھے تو ہر بات نپی تلی ہوئی ہوتی تھی۔ انہیں اپنی عظمت منوانے کی فکر نہیں تھی وہ ملنے ہوئے مفکر اور دانشور تھے۔ صرف شعر و شاعری کے میدان میں نہیں وہ سماجی اور سوشل سرگرمیوں میں

بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ہر مذہب اور قوم اور ہر طبقہ کے لوگ انہیں اپنا بزرگ تصور کرتے تھے اور اہم اور پیچیدہ مسائل پر ان سے مشورہ کرتے تھے۔

نواب سائل اور بیخود صاحب کے تعلقات کشیدہ رہتے تھے اور تادم مرگ سائل کشیدہ رہے اس میں سائل صاحب کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ وہ تو مرنج مرنجان قسم کے بزرگ تھے مگر بیخود صاحب قدرے اکھڑ تھے اور اپنے علاوہ کسی کو شاعر ہی نہیں مانتے تھے۔ ان کا یہ لطیفہ مشہور ہے کہ ایک بار وہ سائل کہیں اکٹھے ہو گئے تو بیخود نے کہا کہ سائل بھائی اب دلی میں شاعر ہی کون رہ گئے ہیں بس ایک تم ہو اور ایک ہم اور پھر اگر غور سے سوچو تو تم بھی کیا ہو،

زار صاحب کی ہر وقت یہی کوشش ہوتی تھی کہ ان کے یہ دو برگزیدہ استاد بھائی اپنے تعلقات دوستانہ رکھیں اور اپنے استاد کا نام روشن کریں لیکن ان کی یہ کوشش ناکام رہی۔ نواب سائل کے انتقال پر جب ہم ان کے جنازے کے ساتھ مہرولی کی جانب روانہ ہونے لگے تو زار صاحب مجھے ایک طرف لے گئے اور فرمانے لگے کہ بیدی صاحب اگر بیخود شریک جنازہ نہ ہوئے تو ان کی بدنامی تو ہوگی لیکن استاد مرحوم کے نام پر بھی حرف آئے گا۔ آپ جایئے بیخود کو لے آیئے۔

چنانچہ میں ان کے حکم کے مطابق گیا اور بیخود صاحب کو لے آیا اور وہ شریک جنازہ ہوئے بلکہ میں نے انہیں اس وقت آبدیدہ دیکھا جو ایک غیر متوقع بات تھی۔

حضرات خاکہ لکھنے والے عام طور پر موضوع خاکہ میں کوئی نہ کوئی انوکھی ادا دیکھ لیتے ہیں یا کسی کمزوری پر انگلی دھرتے ہیں اور پھر اس پر خاکہ لکھ مارتے ہیں میں نے ہر چند کوشش کی مجھے زار صاحب کی زندگی میں کوئی ایسی بات نظر آئے لیکن ان کی ہستی اس قدر متوازن اور ہموار تھی اور ان کا ہر پہلو اس قدر روشن تھا کہ میں بے بس ہو گیا۔

ایک آخری بات کہہ کر ختم کرتا ہوں۔ ایک بار میں نے ان سے پوچھا کہ جب آپ علم کے مخزن ہیں آپ کا ارشاد کیا ہوا ہمارے لیے ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے لیکن آپ بہت ہی کم بولتے ہیں اور ہمیں یہ موقعہ ہی نہیں دیتے کہ ہم آپ کے ارشادات سے استفادہ کریں تو فرمانے لگے کہ بیدی صاحب یہ بولنے اور متواتر بولتے رہنے کا فریضہ میں نے اور میرے کل خاندان نے میرے چھوٹے فرزند جگر بند یعنی گلزار کے حوالے کیا ہوا ہے۔

خیّام الہند حضرت حیدر دہلوی

سمندر کی تہہ میں جتنے موتی ہوتے ہیں غوطہ زن کا ہاتھ سب کو سمیٹنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا وہ صرف اتنے ہی موتی باہر لاتا ہے جو اُس کی گرفت میں آسکیں۔ ان میں معمولی قیمت والے موتی ہوتے ہیں اور گراں بہا بھی۔ ممکن ہے کہ جن موتیوں تک غوطہ زن کا ہاتھ نہیں پہنچ سکا باہر نکلے ہوئے موتیوں سے بھی زیادہ قیمت رکھتے ہوں لیکن جب تک وہ سمندر کی تہہ میں پڑے رہیں گے کسی بڑے سے بڑے جوہری کو بھی ان کی قیمت کا اندازہ تو کیا ان کے وجود کا علم بھی نہیں ہو سکے گا۔

یہی حال اہل کمال کا ہے کسی فن۔ کسی میدان میں بھی اہل کمال کی کمی نہیں لیکن بقول اکبر الہ آبادی ہے۔

نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانے کی
کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتوں میں نہاں ہو کر

اس کے لیے بھی نگاہِ جوہر شناس کی ضرورت ہے نہ صرف نگاہِ جوہر شناس کی بلکہ وہ جذبہ بھی درکار ہے جو کسی صاحبِ کمال کو روشناس کرانے کے لیے ایک انصاف پسند طبیعت بھی رکھتا ہو۔

اردو دنیائے شاعری میں دورِ اوّل سے اب تک ہزاروں شاعر پیدا ہوئے اور جب تک شعر و سخن کی

گرم بازاری باقی رہے گی شعراء پیدا ہوتے رہیں گے لیکن شہرتِ عام اور بقائے دوام کی عزت حاصل کرنے والے پہلے بھی گنے چنے ہوئے ہیں اور آئندہ بھی ان کی تعداد انگلیوں پر گنے جاتے تک محدود رہے گی ان میں سے بیشتر کا نام و کلام گوشۂ گمنامی کی نذر ہو کر رہ گیا۔ پنڈت امرناتھ مدان ساحر دہلوی۔ سید وحید الدین بیخود دہلوی۔ ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی۔ آغا شاعر قزلباش۔ پنڈت چندی پرشاد شیدا سید جلال الدین حیدر دہلوی ان ناموں سے کتنی خوشگوار یادیں وابستہ ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان شعراء میں جو شہرت و قبولیت سے محروم رہے وہ جوہر نہیں تھے جو ان کو بامِ عروج تک پہنچاتے بلکہ اس کا یہ سبب رہا اور یہی رہے گا کہ ان خوابیدہ قسمت اربابِ کمال کو منظرِ عام پر لانے والے موجود نہیں تھے یا موجود نہیں ہیں ان ہی محروم شہرت اربابِ شعر و سخن میں حیدر دہلوی بھی ہیں جو "خیام الہند" کہلاتے ہیں۔

خیام الہند سید جلال الدین حیدر دہلوی کی ولادت ۱۰ جنوری ۱۹۰۶ء کی صبح کو گلی شاہ تارہ اجمیری گیٹ دلی میں ہوئی تیرہ برس کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا عربی کے لیے مولوی کرامت علی صاحب سے رجوع کیا اور فارسی مولانا مرزا مرزا حیرت دہلوی سے پڑھی آپ کے والد سید جمال الدین صابر اور دادا سید کمال الدین ولی اپنے موروثی وطن بغداد سے بغرض تجارت بمبئی آئے جہاں ایک کپاس کا کارخانہ قائم کیا اور وہیں مستقل طور پر اقامت اختیار کر لی آپ کے والد کی شادی دلی کے مشہور مولوی خاندان میں مولانا نعیم اللہ صاحب خلف مولانا حفیظ اللہ صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی۔

ششی چند سکسینہ طالب دہلوی نے اپنی کتاب "یہ تھی دلی" میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ حیدر صاحب پنڈت امرناتھ مدان ساحر دہلوی کے تلامذہ میں سے تھے مگر اپنے مجموعۂ کلام "صبح الہام" میں خود نوشت حالات میں قبلہ حیدر صاحب رقم طراز ہیں کہ

"میں نے شاعری کے باب میں نہ کسی سے اصلاح لی نہ کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا نو سال کی عمر سے شعر کہہ رہا ہوں تیرہ سال کی عمر سے مشاعروں میں شرکت شروع کی اور طرح میں غزلیں کہہ کہہ کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔"

غالباً ان حقائق کی بنا پر فرماتے ہیں:

سخن شناس کی حیدرؔ تلاش ہے بے سود
تو جس کو ڈھونڈ رہا ہے وہ اس جہان میں نہیں

مزید لکھتے ہیں "میرے کلام میں جس قدر خوبیاں نظر آتی ہیں وہ سب اساتذہ متقدمین و متاخرین کے فیضانِ روحانی کا کرشمہ ہے ورنہ میں بھی خطا و نسیاں کا پتلا ہوں اور ذرے سے لے کر خورشید تک کو اپنا معلم اور خود کو متعلم سمجھتا ہوں۔"

حیدرؔ صاحب کے بارے میں طالب دہلوی اسی مضمون میں ان کی شخصیت کا یوں اعتراف کرتے ہیں کہ :

"حیدر صاحب غزل اور رباعی اچھی ہی نہیں بہت اچھی کہتے تھے آپ سے متعلق عجیب و غریب باتیں سُنیں معلوم ہوا بہت مُدمِّغ ہیں کسی کو خاطر میں نہیں لاتے کسی کا ادب ملحوظِ خاطر نہیں رکھتے وغیرہ لیکن جب میری اُن سے چند ملاقاتیں ہوئیں تو ان سنی ہوئی باتوں کی تصدیق نہ ہو سکی کم از کم اُن کا سلوک اور برتاؤ مجھ راقم الحروف سے مختلف تھا اور مجھے اُن سے وہ شکایات نہ ہوئیں جو دوسروں کو تھیں۔ آپ کی حیات میں آپ کی رباعیوں کا مجموعہ "رباعیاتِ حیدر" کے نام سے شائع ہو گیا تھا اور مجموعۂ غزلیات بعد از مرگ ان کے کچھ تلامذہ نے (خواہ وہ کسی بھی طرح چھپا) پاکستان میں شائع کر دیا جو "صبحِ الہام" کے نام سے مشہور ہے۔ ایک ادبی ماہنامہ "الہام" نکالتے تھے۔ ۱۹۴۹ء میں پاکستان تشریف لے گئے لیکن وہاں کا ماحول آپ کو راس نہ آیا اور آپ شاکی رہے۔ انجام کار وہیں کی خاک کا پیوند ہو گئے۔ استاذی مرحوم حضرت برقؔ کے مجموعہ کلام "حرفِ ناتمام" پر آپ نے الہام میں ریویو شائع فرمایا یہ ریویو آپ کی غیر جانبداری اور دیانت کا حامل ہے میری خبر بھی لی گئی ہے لیکن جو کچھ رقم کیا گیا ہے وہ سو فیصد برحق ہے :"

معتقداتِ فن کے بارے میں حیدر صاحب اپنی الگ رائے رکھتے تھے فرماتے ہیں :

"شاعری ایک لطیف و شریف فن ہے اس کے ذریعے معاش پیدا کرنا حرام نہیں تو "مکروہ" ضرور ہے بدیں وجہ کہ شعر اولادِ مجازی ہے جس کی بیع بردہ فروشی اور

آمدنی ناجائز کمائی کے مترادف ہے۔"

کم عمری میں حیدر صاحب کے کلام کی شہرت ان کے لیے خاصی مہنگی پڑی۔ معمر اور بزرگ شعرا در پے آزار ہو گئے بدقسمتی سے دوستوں اور بعض شاگردوں نے بھی وفا نہ کی یہی وجہ ہے کہ مالی اطمینان کے باوجود آسودہ خاطری کبھی نصیب نہیں ہوئی پاکستان جانے کے بعد مالی آسودگی بھی نہیں رہی بظاہر وہ ہشاش بشاش دکھائی دیتے تھے مگر دل و دماغ اور روح کے کرب نے انہیں فن تک کی طرف سے بددل کر دیا تھا اور اس بات کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے

فقر و فاقہ ذلت و بغض و حسد — روح فرسا فکر و کاوش کا مآل

واہ یہ انسانیت دشمن سلوک — آہ تف بر علم لعنت بر کمال

حیدر صاحب گھڑی سازی بائنڈنگ کمپوزنگ لیتھو پریس کی چھپائی سنگ سازی اور پریس لائن سے جس قدر بھی متعلقات اس زمانے میں رائج تھے سب میں دسترس رکھتے تھے۔ سیوا جینتی پریس لال کنواں اور نیمل آرٹ پریس رودگراں فراشخانہ انہیں کی بدولت قائم ہوئے جو آج بھی موجود ہیں اسی طرح حیدر صاحب اپنے دور کے صف اول کے صحافی بھی رہے مفتی شوکت علی فہمی۔ دیوان سنگھ مفتوں۔ حافظ محمد یوسف عبداللہ شمیم ملا واحدی۔ سردار علی صابری۔ ہلال زبیری محمد عثمان آزاد۔ وحدت دہلوی عزیز حسن بقائی اور زیڈ اے بخاری ان کے ہم عصر تھے۔ موصوف کی نگرانی میں دلی سے کہکشاں۔ الہام فرمان۔ سادات۔ تیغ۔ چنگاری اور ایسے بہت سے اخبارات و رسائل کا اجرا ہوا جن کے وہ سرپرست رہے مگر کبھی کہیں خودنمائی کو قریب نہیں آنے دیا۔

حیدر صاحب کے تلامذہ کا یوں تو سلسلہ بہت وسیع ہے جن میں دس بیس یا سو پچاس نہیں بلکہ بہت ایسے ہیں جو اپنی قادر الکلامی اور کہنہ مشقی کی وجہ سے خود مرتبۂ استادی کو پہنچ گئے ان میں کچھ صاحب دیوان بھی ہیں۔

خورشید حسن نازش حیدری دہلوی۔ مرزا غلام عباس زاہر حیدری لکھنوی۔ حکیم ہاشم جان کیف دہلوی۔ سید انتقام الحسنین منتقم ایڈوکیٹ۔ سید مسعود الحسن رضوی شہاب دہلوی حکیم حبیب اشعر دہلوی۔ فیض احمد فیض جھنجھانوی۔ مولانا فضل الرحمٰن رہبر پرتاب گڑھی۔ کرار نوری عالم حیدری۔ فرید جاوید۔ شیدا گجراتی۔ منظور اشعر۔ انور دہلوی۔ کنہیا لعل آزردہ حیدری۔

ستیہ پرکاش حباب۔ آرمورس سنگھ عارف۔ افضل پشاوری۔ نواب احمد علی خاں تاباں۔ نواب حامد علی خاں حامد۔ امیر اللہ حیرت جبلپوری اور شیون رضوی۔ یہاں یہ بات بھی قابل تذکرہ ہے کہ حیدر صاحب کے تلامذہ کی دوسری نسل میں اقبال ساجد (لاہور) بسمل شاہجہاں پوری۔ پروفیسر وسیم بریلوی۔ جوہر زاہری (لندن)۔ سلام ساگری (ساگر ایم۔ پی) قمر سنبھلی کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔

اس دور میں اُردو ادب کے شعراء جرأت کی معاملہ بندیوں کو قلعۂ معلّیٰ کی کوثر سے دھلی ہوئی زبان میں پیش کرنا قابل فخر کارنامہ سمجھتے تھے خیالات میں پاکیزگی تقریباً عنقا تھی چنانچہ ابتذال اور سوقیانہ اندازِ کلام کے زہریلے اثرات اعلیٰ ادب کے لیے گھن کا کام کرنے لگے اور یہ انداز عوام و خواص میں اس قدر مقبول ہوا کہ منشی امیر احمد امیر مینائی جیسے ثقہ شاعر بھی عام مشاعروں میں فخریہ اس قسم کے شعر پڑھتے ہوئے دیکھے جانے لگے ؎

آنکھیں دکھلاتے ہو جوبن تو دکھاؤ صاحب

وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ایسے ماحول کی آغوش میں پرورش پانے والے نے جب ہوش سنبھالا تو گردوپیش کا کوئی تاثر قبول نہیں کیا اور رطب ویابس۔ رکاکت بیان اور ابتذال سے بچ کر اپنے لیے ایک نیا راستہ نکالا فرماتے ہیں ؎

منافی اس قدر تقلید کے ہے میری خودداری

قدم بچ بچ کے رکھتا ہوں میں نقشِ پائے رہبر سے

ظاہر ہے کہ حیدر صاحب نے اساتذہ متاخرین اور اساتذہ حاضرین کو رہبر تو تسلیم کیا لیکن اپنی ذہنی اپج اور خودداری کے سبب اس کا اہل نہ پایا کہ ان کی تقلید کی جائے اور یہی مرحوم کی خوددارانہ زندگی کا نقطۂ آغاز ہے۔ شعر و ادب کی پاکیزگی سے فطری لگاؤ کے سبب مرحوم نے جو اسلوب اختیار کیا وہ اس دور کی مسموم ادبی فضاؤں میں اجنبی محسوس کیا گیا۔ مضمون آرائی جدت طرازی اور ماحول کی ترجمانی وغیرہ سے بھی مرحوم کا کلام تہی دامن نہیں۔ آہنگ کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص لہجہ بھی حیدر دہلوی مرحوم کے کلام کا ایک خاصہ ہے اس نئی اور اجنبی آواز نے رفتہ رفتہ ماحول کو متاثر کرنا شروع کیا لیکن اس تاثر پذیری کی رفتار اس قدر سست تھی کہ مرحوم کو کہنا پڑا ہے

ابھی ماحولِ عرفانِ ہنر میں پست ہے حیدر
یکایک ہر بلند آواز پہچانی نہیں جاتی

یہ پہلا ادبی تجربہ تھا جسے مرحوم نے پیش کیا یہ تجربہ بھی تلخ تھا اور اس کا پس منظر بھی۔ ادب کی اس بگڑی محفل کو آراستہ کرنے کی یہ کوششیں اساتذہ وقت کی حیدر صاحب سے ضد اور دشمنی پر منتج ہوئیں مختلف ادبی جماعتوں نے اساتذہ کی سرکردگی میں متحد ہو کر اس ابھرتے ہوئے شاعر کے خلاف ایک مستقل محاذ قائم کر لیا ادب میں اپنی اجارہ داریوں کو خطرہ میں دیکھ کر تسبیح کے دانوں پر غلیظ اور فحش گالیاں بھی جانے لگیں۔ مالی جسمانی اور ذہنی کوئی تکلیف ایسی نہ تھی جو مرحوم کو پہنچانے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔

حضرت حیدر دہلوی دلی مرحوم کی آخری بہار تھے قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۹ء میں یہ بہار ڈھاکے اور کراچی کے دامن میں سمٹ آئی تھی اور پھر کراچی ہی میں یہ بہار خزاں کی نذر ہوگئی لیکن حیدر صاحب جس قلعے کو چھوڑ کے ڈھاکے گئے تھے اس قلعے کی تہذیبی علامات اور اثرات ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

حضرت حیدر شاعروں کی جس نسل سے تعلق رکھتے تھے وہ داغ و مجروح کی تربیت کردہ نسل تھی داغ و مجروح کے اتباع میں اس نسل نے زبان و بیان کی صفائی اور برجستگی بھی حاصل کر لی اور اپنے لیے ایک نیا راستہ بھی نکالا۔ ان شعراء نے قدیم و جدید کی آمیزش سے اردو شاعری کو ایک نیا انداز دینے کی کوشش کی تھی اگرچہ اس نئے انداز میں قدیم روایت شریک غالب کی حیثیت رکھتی ہے تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس انداز میں عصری صداقتوں اور نئے ماحول کی پرچھائیاں جابجا موجود ہیں۔ چند شعر اس سلسلے میں ؎

نہ اذنِ زمزمہ سنجی نہ مہلتِ گلگشت
برائے نام علاقہ ہے گلستاں سے مجھے

ہمراہ سرشکِ خونیں کے آنکھوں سے جگر بھی ٹپکا ہے
تارے تو ہمیشہ ٹوٹتے تھے اب کے مہ کامل ٹوٹ گیا

حیدر صاحب بنیادی طور پر زبان کے شاعر ہیں ان کے کلام سے حیرت انگیز قدرتِ زبان

اور قادر الکلامی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ سنگلاخ زمینوں اور مشکل طرح میں عموماً طبع آزمائی کرتے ہیں۔ سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی وقت پسندی کے رجحان کی علمبردار اور اُستادانہ وقار برقرار رکھنے کی علامت ہے اُردو کے بہت سے اساتذہ اس رجحان کا شکار ہوئے ہیں لیکن بعضوں نے اسے فن بھی بنایا ہے۔ حیدر دہلوی کا شمار ایسے ہی اساتذہ میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی مشکل پسندی کو فن بنالیا ہے اس مشکل پسندی کی وجہ سے حیدر صاحب نے صاف اور سادہ زبان کے بجائے مشکل زبان استعمال کی ہے لیکن زبان مشکل ہونے سے ان کی قادر الکلامی اور نکھر گئی ہے خوب صورت فارسی ترکیبیں حیدر صاحب کے کلام میں جابجا موجود ہیں۔

یہ تیرے صبحِ نشاطِ عارض یہ شام ماہ دو ہفتہ کا کل
نجومِ عالم فروز قرباں بہارِ عنبر فشاں تصدق

اب سے نہیں اوّل سے ہوں مشتاقِ نظارہ
آنکھوں سے نہیں نیند مقدر سے اُڑی ہے

بالآخر پھوٹ نکلیں سب گُلِ آتش بکف بن کر
چھپادی تھیں کسی نے بجلیاں خاکِ گلستاں میں

آپ کے کلام کا دوسرا رُخ مستی اور وارفتہ پن جوش اور سرشاری ہے مستی اور جوش حیدر صاحب کا انفرادی مزاج ہے یہ مستی اور جوش روحانی گہرائیوں سے تعلق رکھتی ہے اس جوش و مستی نے حیدر صاحب کو خیام الہند کا موزوں خطاب عطا کیا تھا افسوس یہ ہے کہ یہ مختصر مضمون اس کا متحمل نہیں کہ اس جوش و مستی کے بارے میں کھل کر کچھ کہہ سکوں صرف اتنا عرض کرسکتا ہوں کہ یہ مستی وارفتہ پن جوش اور سرشاری حیدر صاحب کی روح ہے۔ جس کلام میں عرفانِ ذات اور روح کی سرشاری کی یہ فضا موجود ہو اس کی خوبی اور عظمت میں کوئی شبہ نہیں۔ ان کی غزل اور رباعی دونوں میں یہ فضا موجود ہے۔

نمونہ کلام: چند شعر

مہِ نو کہکشاں قوسِ قزح کچھ بھی سمجھ لیجے	تڑپ کر چند موجیں گر پڑی ہیں حوض کوثر سے

رفتار تری مے کا برستا ہوا بادل	جس راہ سے تو گزرے وہی راہ گزر مست

عشق کی چوٹ تو پڑتی ہے دلوں پر یکسر	ظرف کے فرق سے آواز بدل جاتی ہے

چمن والوں سے مجھ صحرا نشیں کی بود و باش اچھی
بہار آ کر چلی جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی

تمہارے گرمیٔ محفل کے رنگ نے اُڑ کر	کہیں پناہ نہ پائی تو آفتاب بنا

حیدر میرے وطن میں ہمیشہ سے ہے روا	اہلِ ہُنر کے باب میں تضحیک بالخصوص

تم آج بے ربط ایک جملہ کچھ اِس تکلف سے کہہ گئے ہو
مبالغے کا تو ذکر کیا ہے مسلسل ایک داستاں تصدق

نمونہ رُباعیات

میکش ہمہ تن علم و عمل ہوتے ہیں	یہ زیر کہیں آج نہ کل ہوتے ہیں
اُلجھے ہوئے حکمت کے مسائل لاکھوں	اک جامِ مۓ ناب میں حل ہوتے ہیں

دل زاہد کے نزدیک نہ رکھا ہم نے　　عصیاں کا کوئی ٹھیک نہ رکھا ہم نے
اک چاند ہم آغوش جوانی سے رہا　　اس رات کو تاریک نہ رکھا ہم نے

آئینۂ گل، وجہہ تحیّر ہیں ہم　　بیگانۂ عالم۔ بہ تنفّر ہیں ہم
خودداریٔ شاعر میں کہیں لوچ نہیں　　حقا اک شیت کا تکبّر ہیں ہم

اک تو کہ جسے عزّو تعیّش کا جنوں　　ارباب زر و مال پہ شیدا مفتوں
اک میں وہ سخن سنج و فقیر خودار　　ملتی ہو خوشامد سے خدائی تو نہ لوں

یہ آواز ۱۰ نومبر ۱۹۵۹ء کی صبح کو ۵۲ سال کی عمر میں گلے کے سرطان کے آپریشن کے دوران ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی

خواجہ حسن نظامی

دِلّی کو ہندستان کا دل کہا جاتا ہے۔ یقیناً ہے۔ مگر دلّی کا دِلّی بستی حضرت نظام الدین ہے۔ جو فصیل شہر سے باہر جانب جنوب واقع ہے۔ یہ جگہ پہلے غیاث پور کہلاتی تھی اور یہیں حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا، محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ نے معز الدین کیقباد کے زمانہ حکومت میں اپنی خانقاہ بنائی تھی جس کا تھوڑا سا عمارتی حصہ آج بھی مقبرہ ہمایوں کے شمال مشرق میں باقی ہے۔ دِلّی والے اس علاقے کو "سلطان جی" بھی کہتے تھے۔ پرانے لوگ اب بھی کہتے ہیں۔ یہاں وہ چہل پہل نہیں تھی جو اب نظر آ رہی ہے۔ دِلّی گیٹ سے نکلنے کے بعد ہُو کا عالم ہوتا تھا۔ چاروں طرف گھنی جھاڑیاں تھیں اور دن میں بھی بس اِکّا دکّا سواری بستی کی طرف آتی جاتی نظر پڑتی تھی۔ اِس بستی میں پیرزادوں کے چند خاندان آباد تھے جو حضرت محبوب الٰہی کے روضے کی خدمت کرتے اور نذر نیاز کی آمدنی سے گذر بسر کرتے تھے۔ زندگی کے اسبابِ راحت میں سے یہاں کچھ نہ تھا۔ سادہ، بے تکلف، یک رنگ و یک آہنگ زندگی تھی۔ تعلیم بھی واجبی سی ہوتی تھی۔ قرآن شریف ناظرہ پڑھ لیا، یا بہت ہوا تو حفظ کر لیا۔ کچھ فارسی کی کتابیں جیسے پند نامہ، کریما، مامقیماں گلستان، بوستاں پڑھ لیں۔ اللہ اللہ خیر صلاّ۔ اتنی تعلیم بھی ہر ایک کو نصیب نہ ہوتی تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ جسے ملے یوں وہ کھیتی کرے کیوں"؟ فتوحات کا دروازہ کھلا ہوا تھا اس لیے کسی

در پر دستک دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا نے اپنے انتقال سے پہلے گودام لٹوا دیئے تھے اور جو کچھ خانقاہ میں تھا سب مساکین وفقرا میں تقسیم کرا دیا تھا۔ اُن کی زندگی ہی میں شہزادہ خضر خاں نے عالی شان گنبد والا سنگ سرخ کا مقبرہ تعمیر کرایا تھا۔ لیکن حضرت نے فرمایا کہ میں کھلے آسمان کے نیچے آرام کروں گا۔ اس مقبرہ کے سامنے کی حوض کو پاٹ کر اس میں حضرت محبوب الٰہی کا جسد مبارک دفن کیا گیا تھا۔ ان سے یہ بھی پوچھا گیا کہ آپ کے خدام اور اہلِ خاندان و متوسلین خانقاہ کا کیا ہوگا؟ تو انھوں نے فرمایا تھا کہ ان شاء اللہ اتنی فتوحات آتی رہیں گی جو اُن کے گذر بسر کو کافی ہوں۔ پھر کسی نے پوچھا کہ روضہ کا متولی کون ہوگا؟ تو آپ نے فرمایا کہ "جو اپنے حق سے دست بردار ہو جائے"۔ بستی میں چار خاندان تھے جن میں سے تین ماشاء اللہ اب بھی باقی ہیں۔ ان کو نبیرگان، بارونیان، قاضیان اور ہندوستانیان کہا جاتا تھا۔ فریقِ اوّل نبیرگان" حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر اجودھنی علیہ الرحمۃ کے نواسوں کا خاندان تھا۔ فتنۂ تاتار میں جب بہت سے خاندان وسطِ ایشیا سے ہجرت کر کے ہندوستان کی طرف آئے تھے تو انھیں میں ایک خانوادہ دِلی میں آکر آباد ہو گیا تھا جو اس وقت رشکِ بغداد بنی ہوئی تھی۔ اس خاندان کے ایک فرد خواجہ بدر الدین اسحٰق تھے جنھوں نے دلّی کے علمار سے اس وقت کی مروّجہ تعلیم حاصل کی۔ دلّی میں عہد فیروز تغلق تک چھوٹے بڑے ایک ہزار مدرسے تھے جن میں منقولات و معقولات کے نامی گرامی علمار بیٹھے درس دیتے تھے۔ پھر بھی جسے مزید اعلیٰ تعلیم کی خواہش ہوتی تھی وہ بلخ، بخارا، سمرقند بغداد یا مدینہ منورہ کا رخ کرتا تھا۔ خواجہ بدر الدین اسحٰق نے دِلّی میں تعلیم تو مکمل کر لی مگر بعض مسائل میں شرحِ صدر نہیں ہوا تھا اور وہ ان علمی مسائل کا حل ڈھونڈھنے کے لیے بخارا کی طرف چل پڑے۔ بخارا کا راستہ دیپال پور ہو کر جاتا تھا جو سلطنت ہند کی سرحدی چوکی تھی۔ اس سے پہلے اجودھن پڑتا تھا جسے آج کل پاک پٹن کہتے ہیں۔ یہاں حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ اور حضرات خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے جانشین حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کی خانقاہ تھی جس کا دور دور شہرہ تھا۔ حضرت بدر الدین اسحٰق اِدھر سے گذرے تو ملاقات کے لیے بابا صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ انھوں نے باتوں باتوں میں از خود

انہیں مسائل کا تذکرہ چھیڑا جو حضرت بدر اسحٰق اپنے ذہن میں لیے بخارا کی طرف جا رہے تھے اور اُن کا حل بھی ایسا پیش کر دیا کہ اِنھوں نے سوچا مجھے اتنی دور جانے کی کیا ضرورت ہے، مقصود تو تو یہیں حاصل ہو گیا۔ غرض انھوں نے حضرت بابا صاحب کے دست مبارک پر بیعت کر لی اور وہیں خانقاہ میں رہنے لگے یہ حضرت بابا صاحب کے خادم خاص تھے اور ہمہ وقت حجرہ کے سامنے بیٹھے رہتے تھے۔ اِن کے علم و فضل اور کمالاتِ ظاہری و باطنی کو دیکھ کر حضرت بابا صاحب نے اپنی صاحبزادی بی بی فاطمہ سے ان کا عقد بھی کر دیا تھا۔ حضرت بابا فریدؒ کے آخری زمانے میں حضرت بدر اسحٰق نے کسی موقع پر حضرت نظام الدین اولیاء کا تذکرہ کیا اس پر بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ میں بھی اپنے پیر و مرشد کے انتقال کے وقت موجود نہیں تھا، نظام الدین آئیں گے تو میرا خرقہ، عصا، مُصلا اور تسبیح وغیرہ انھیں دے دینا۔ مراد یہ تھی کہ وہی میرے جانشین ہوں گے۔ بابا صاحبؒ کی اولاد نے اس بات کو پسند نہیں کیا وہ سمجھتے تھے کہ اگر حضرت بدر اسحٰق اُس وقت حضرت نظام الدین اولیاء کا تذکرہ نہ چھیڑتے تو وہ جانشین بنانے کی وصیت بھی نہ کرتے۔ حالانکہ یہ محض غلط فہمی تھی۔ حضرت بدر اسحٰقؒ اپنے پیر و مرشد کے انتقال کے بعد اجودھن کی ایک مسجد میں آکر بیٹھ گئے اور بچوں کو پڑھانے لگے۔ یہیں انتقال ہوا، اور اسی مسجد میں مدفون ہیں۔ حضرت بدر اسحٰق کا انتقال ہوا تو ان کے دو چھوٹے بچے تھے محمد اور موسیٰ اور ایک بیوہ بی بی فاطمہ۔ حضرت نظام الدین اولیاء صدر حیات میں تھے انھیں معلوم ہوا کہ میری مرشد زادی اور اس کے بچے وہاں تکلیف اٹھا رہے ہیں تو آپ نے اس خاندان کو دہلی میں بلا لیا اور ان کی پرورش کی۔ اس وقت سے یہ خاندان دلّی میں ہے اور یہی بنیرگان کہلاتے ہیں۔ حضرت بدر اسحٰق کے بڑے بیٹے سید محمد امام کہلاتے ہیں اس لیے کہ یہ خانقاہ میں امامت کیا کرتے تھے اور حضرت محبوب الٰہی ان کی اقتدا میں نمازیں ادا کرتے تھے۔

اس خاندان میں دنیوی اعتبار سے کچھ کشائش رہی ہو یا نہ رہی ہو، مگر زہد و ریاضت تقوی اور عبادت میں ہر زمانے میں نہ کوئی نہ کوئی فرد اپنے معاصرین میں ممتاز رہا۔ پچھلی صدی کے آخر میں ایک بزرگ سید عاشق علی تھے۔ انھوں نے قرآن شریف حفظ کیا تھا، مگر لکھنا پڑھنا نہ جاننے کی برابر جانتے تھے۔ اتنے خود دار ضرور تھے کہ درگاہ کے چڑھاوے پر گذر کرنے کے

مقابلے میں اپنی محنت اور" کدِ یمین" کی کمائی کو ترجیح دیتے تھے۔ انھوں نے جلدیں باندھنے کا ہنر سیکھ لیا تھا۔ اس سے کبھی پانچ روپیہ روز بھی مل جاتے تھے جو اس زمانے میں بڑی رقم تھی، ورنہ اتنی آمدنی تو ہو ہی جاتی تھی کہ جسم و جان کا رشتہ باقی رہے۔ اِنھیں حافظ عاشق علی کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام قاسم علی رکھا گیا۔ ۲ محرم ۱۲۹۶ھ

چار ساڑھے چار سال کی عمر میں اس بچّے نے قرآن شریف ناظرہ پڑھا پھر فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں بنگلہ والی مسجد میں چھپّر پڑے ہوئے تھے اور مغلوں کی سلطنت ختم ہونے کے بعد شاہی خاندان کے بعض بچے کھچے افراد بستی نظام الدین اور عرب سرائے میں آباد ہو گئے تھے۔ اُن کے بچّے بھی اسی چھپّر کے نیچے پڑھتے تھے اُن کے درمیان حافظ عاشق علی کا یہ بیٹا قاسم علی بھی تھا اور پڑھانے والے مولوی محمد اسمٰعیل کاندھلوی تھے جن کے چھوٹے بیٹے مولانا محمد الیاس علیہ الرحمۃ نے تبلیغی جماعت کی بنیاد ڈالی اور جو آج ایک عالمی تحریک بن چکی ہے۔ قاسم علی کو اس کے ماموں بہادر علی شاہ" علی حسن" کہہ کر پکارتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہی نام زبانوں پر چڑھ گیا۔ ابتدائے عمر میں سید محمد علی حسن نظامی کے نام سے ایک آدھ کچا پکا مضمون لکھنے والا آج" شمس العلماء، مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی" کہلاتا ہے۔ اور اب ہم اختصار کے ساتھ صرف" خواجہ صاحب" کہہ کر انھیں یاد کرتے ہیں۔

خواجہ صاحب نے ۴۰۔ ۴۱ سال کی عمر میں اپنا حلیہ اس طرح بیان کیا تھا:

"بہت لمبا قد۔ اس قدر دُبلا کہ سوائے ہڈیوں اور کھال کے گوشت کا نام نہیں۔ رنگ گورا چہرہ کتابی، آنکھیں سفید و سیاہ اور بڑی بڑی۔ دونوں بھوؤں نے وسط میں ہلکا سا ایک سرخ نشان (جس کو بچپن سے آج تک پیشین گوئیاں کرنے والوں نے خوش نصیبی کی علامت بیان کیا) پیشانی چوڑی، ناک سیدھی، رخسارے نہ بہت پچکے ہوئے نہ گوشت سے بھرے ہوئے۔ ہونٹ موٹے موٹے۔ دہانہ بڑا۔ دانت اب تک سلامت۔ داڑھی ایک مشت اور بھری ہوئی سر کے بال کمر تک جن میں بل ہیں یعنی گھونگھر والے ہیں (۲۔ محرم ۱۳۴۰ھ کو بال کٹوا دیے) سینہ بہت چھوٹا جیسا کہ بارہ سال کے بچّے کا ہوتا ہے۔ سینے کی ہڈیاں اتنی ابھری ہوئی کہ ایک ایک ہڈی گن لو۔ ان پر گوشت بالکل نہیں۔ گردن بہت پتلی اور کشیدہ (جو بچپن میں بہت لمبی اور

بہت سیدھی تھی) گردن سے ناف تک کا حصہ بہت لمبا اور یہی وجہ ہے کہ کمر چلنے میں ذرا جھکی رہتی ہے۔ کان درمیانے، ٹانگیں لمبی، پانو درمیانے۔ سر لمبوترا اور بڑا۔

آواز بہت بڑی اور ذرا گرج دار (جو لحن کی شیرینی نہیں رکھتی اگر گانے کی کوشش ہو تو بہت بھدّی اور مکروہ معلوم ہوگی)، بال بالکل سیاہ۔ جسم کے کسی عضو میں کمزوری نہیں ہے سوائے جگر اور معدہ کے کہ دماغی کام کرنے سے وہ عموماً خراب رہتے ہیں۔ دماغ میں اب تک شدید سے شدید محنت کی برداشت ہے اور رات دن میں بارہ گھنٹے مسلسل کام کرسکتا ہے۔

داڑھی صرف ایک دفعہ منڈوائی تھی پھر کتروانے لگا۔ اب پوری ہے سالہا سال سے ہے"

خواجہ صاحب کا یہ حلیہ آج سے ۶۵ سال پہلے کا لکھا ہوا ہے میں نے ۲۹ - ۳۰ سال قبل ۵۴ - ۱۹۵۵ء میں دیکھا تھا۔ اس وقت بھی ان میں سے بہت سی خصوصیات موجود تھیں۔ یہ اُن کا آخری زمانہ تھا۔ وہ تقریباً نصف صدی تک دلّی ہی میں نہیں پوری اردو دنیا پر چھائے رہے۔ بقول میرؔ

جب جنوں سے ہمیں توسّل تھا ٭ اپنی زنجیر پا ہی کا غُل تھا

ابتدائی نصابی کتابوں کے بعد انھوں نے عربی پڑھنی شروع کی اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کے والد بزرگوار شیخ محمد یحییٰ مرحوم جو مولانا محمد اسمٰعیل کے منجھلے بیٹے تھے انھیں اپنے ساتھ گنگوہ لے گئے جہاں انھوں نے مولانا رشید احمد گنگوہی سے بھی برس، ڈیڑھ برس تعلیم حاصل کی۔ لیکن غالباً درس نظامی پورا نہیں پڑھا۔ دہلی واپس آنے کے بعد سب سے بڑا مسئلہ وجہ معاش کا تھا۔ یہاں سوائے نذر نیاز کے دوسرا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔ ابتدائی زمانے میں خواجہ صاحب نے درگاہ شریف کے دروازے پر بیٹھ کر زائرین کی جوتیوں کی رکھوالی بھی کی تھی جس سے دو چار آنے آمدنی ہو جاتی ہوگی اس زمانے میں تو کوڑیاں بھی سکے کی جگہ چلتی تھیں۔ بعض تماش بین درگاہ کے بچوں کو باؤلی میں چھلانگ لگانے پر بھی پیسے دیتے تھے خواجہ صاحب نے یہ بھی کیا۔ مگر ان کے والد مرحوم کی وصیت تھی کہ اپنی محنت کی کمائی سے پیٹ بھرنا اس وصیت کی وہ زندگی بھر تعمیل کرتے رہے بلکہ اپنے دوستوں، ساتھیوں اور مریدوں کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے کہ وہ تجارت کریں یا کسی کاروبار میں لگیں اور جس نے بھی خواجہ صاحب

کی نصیحت پر عمل کیا وہ اپنے کاروبار میں نمایاں طور پر کامیاب رہا۔

خواجہ صاحب کو ابتدائی زمانے میں ایک مخلص انسان مل گئے۔ یہ محض ہدایت ربانی سے مسلمان ہو گئے تھے۔ غلام نظام الدین خاکسار نظامی کہلاتے تھے اور آج بھی خواجہ صاحب کے مقبرے میں اُن کے ساتھ ہی آرام کر رہے ہیں۔ دلی میں پانوں کے دریبے میں ان کی کتابوں کی دکان تھی۔ خواجہ صاحب کو مضمون نویسی کی جانب مائل کرنا انہیں کا کام تھا ایک طرف تو خواجہ صاحب نے مضمون نگاری کا مشغلہ شروع کیا دوسری طرف وہ گھوم پھر کر دلی کی تاریخی عمارتوں کے فوٹو اور چھوٹی موٹی عام دلچسپی کی کتابیں بیچنے لگے کتابوں کی گٹھری کندھے پر رکھ کر ۴ ۔ ۵ میل پیدل جاتے تھے۔ جامع مسجد، چاندنی چوک اور دوسرے علاقوں میں گھوم پھر کر یہ کتابیں فروخت کرتے تھے اور شام کو اسی طرح گٹھری سر پر رکھے بستی نظام الدین کی طرف پیدل واپس آتے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں جب دلی میں شاہی دربار منعقد ہوا تو تمام ریاستوں اور رجواڑوں اور ہندستان بھر کی ممتاز شخصیتوں کے کیمپ مال روڈ سے آگے لگے ہوئے تھے اسی لیے یہ جگہ آج تک کنگزوے کیمپ کہلاتی ہے۔ موجودہ دلی یونیورسٹی کی عمارت اس وقت وائسرائے کی کوٹھی تھی۔ بستی نظام الدین سے ۱۵ ۔ ۲۰ سیر کتابوں کا بوجھ کندھے پر رکھ کر یہ دبلا پتلا منحنی ساڈیڑھ پسلی کا انسان کنگزوے کیمپ تک پیدل جاتا تھا اور وہاں کتابیں فروخت کرتا تھا۔

رفتہ رفتہ سید محمد علی حسن نظامی 'حسن نظامی' ہو گئے اور یہ نام بچے بچے کی زبان پر چڑھ گیا۔ اس وقت کے ممتاز رسالوں اور اخباروں میں ملکی و قومی معاملات پر مضامین شائع ہونے لگے اور پھر تو ۵۰ برس تک خواجہ صاحب نے مسلسل لکھا اور اتنا لکھا کہ صحیح تعداد بتانا تقریباً ناممکن ہے۔

وہ پیرزادے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی سے خاندانی نسبت رکھتے تھے اور ایک دو نہیں بیس پشتوں نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی تھی اس لیے حسن نظامی بھی بنیادی طور پر ایک صوفی اور درویش ہی رہے۔ انھوں نے بچپن ہی میں اپنے والد اور بڑے بھائی کے ساتھ بہت سی خانقاہوں اور درگاہوں کی زیارت کر لی تھی۔

خواجہ اللہ بخش تونسوی سے بیعت بھی کی تھی۔ اسی طرح پنجاب کے مشہور صوفی شاعر خواجہ فرید سے

سے بھی بیعت تبرک رکھتے تھے۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو غلام نظام الدین خاکسار نظامی کے مشورے سے انھوں نے تیرتھ یاترا بھی کی۔ بندرابن، متھرا ہری دوار، رشی کیش اور ہنجا نے کہاں کہاں گئے۔ مندروں اور مٹھوں میں جوگیوں سے ملاقاتیں کی اور اُن کے روحانی تربیت کے طریقوں سے واقفیت حاصل کی۔ لیکن اُس زمانے میں اُن کے خلاف ہنگامہ آرائی بھی ہوگئی تھی خود درگاہ شریف کے لوگوں نے بہت اودھم مچایا۔ کفر کے فتوے بھی صادر ہوئے اس لیے "تیرتھ یاترا" کا سفرنامہ جو اسی نام سے لکھا تھا شائع نہیں ہوسکا۔ وکیل امرتسر اور پیسہ اخبار لاہور جیسے رسالوں میں مضامین چھپے تو خواجہ صاحب نے اہل نظر کو بہت جلد اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ اب انھوں نے خود قومی و معاشرتی اصلاح کے لیے باقاعدہ کام شروع کیا حلقہ نظام المشائخ قائم کیا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ تمام درگاہوں کے حضرات کو متحد کیا جائے۔ فضول رسموں سے درگاہوں کو پاک کیا جائے اور اہلِ درگاہ کے سیاسی حقوق کی حفاظت ہو۔ رسالہ نظام المشائخ کئی برس تک پابندی سے نکلتا رہا اور بہت مقبول ہوا۔ اسے دیکھ کر تصوف کے موضوع پر دوسرے کئی رسالے بھی نکلے جن میں بعض دیر تک چلے اور مقبول بھی ہوئے مگر نظام المشائخ کا اپنا ہی انداز تھا۔

خواجہ صاحب کو ابتدا ہی سے کسی مرشد کامل کی تلاش تھی خواجہ اللہ بخش تونسوی اور خواجہ غلام فرید سے ان کی بیعت زمانہ کم سنی میں ہوئی تھی۔ اس لیے سلوک طے کرنے کا موقع نہیں ملا تھا اب انھوں نے حضرت پیر مہر علی شاہ نظامی رگولڑہ شریف کے دست مبارک پر بیعت کی اور ان سے اجازت بھی مل گئی۔ جب خواجہ صاحب نے لوگوں کو دست بیعت دینا شروع کیا تو بلا مبالغہ ہزاروں انسانوں نے اُن سے بیعت کی۔ چالیس سال کی عمر تک ان کے تقریباً ساٹھ ہزار مرید ہو چکے تھے۔

انھوں نے اپنی کتابیں خود چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا۔ پہلی کتاب جو چھاپی وہ تھی "مفلسی کا مجرب علاج"۔ اس کے بعد چھوٹی بڑی کتابیں تین سو سے زیادہ شائع کیں جن میں غدر دہلی کے افسانے بہت مقبول ہوئی۔ یہ کتاب بارہ حصوں میں ہے اور اس میں انھوں نے افسانہ و تاریخ کی آمیزش کر کے خاندان مغلیہ کے زوال اور خاتمہ اور عبرت ناک انجام کی داستانوں کو محفوظ کر دیا ہے۔ ان میں بعض دوسری کتابوں کے ترجمے یا خلاصے بھی ہیں لیکن بہت سی کہانیاں اور قصے

وہ ہیں جو خواجہ صاحب نے اپنے بچپن میں بڑی بوڑھیوں اور بزرگوں سے سنے تھے اُن کے بچپن تک ایسے ہزاروں افراد زندہ تھے جنھوں نے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کا زمانہ دیکھا تھا اور جو ۵۰-۶۰ برس پہلے کے بھی چشم دید واقعات سنا سکتے تھے۔

۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد برطانوی حکومت نے جو انتقامی کارروائی کی تھی اس کی لرزہ پیدا کرنے والی داستانیں بھی خواجہ صاحب نے سنی تھیں اور اچھے اچھے عالی خاندان انسانوں کو معمولی محنت مزدوری کرتے یا بھیک اور امداد پر بسر کرتے بھی دیکھا تھا۔ زوال مغلیہ کا خواجہ صاحب کے دل و دماغ پر گہرا اثر تھا اور وہ زندگی بھر اُن کے قصے بیان کرتے رہے۔

خواجہ صاحب کو دلی کی تاریخ، تہذیب و تمدن، زبان و بیان اور طرز معاشرت سے نہ صرف گہری دلچسپی تھی بلکہ وہ خود "دہلویت" کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ جس نسل نے ۱۹۴۷ء کے بعد کی دِلی دیکھی ہے وہ یہ سمجھتی ہے کہ پھکّڑپن سے بات کرنا، آریا ہے جاریا ہے کہنا اور تیز مرچوں والی نہاری کھانا دِلی والا ہونے کی نشانی ہے۔ میں بھی شاید ایسا ہی سمجھ لیتا مگر خوش قسمتی سے میں نے خواجہ حسن نظامی اور آغا حیدر حسن دہلوی کو بھی دیکھا ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ دِلی والے جو دِلی کی تہذیب کا نمونہ تھے اب دِلی میں نہیں پائے جاتے ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

خواجہ صاحب نے دِلی کی تاریخی عمارتوں کے تحفظ میں بڑا کام کیا۔ لارڈ کرزن کے زمانے میں محکمہ آثارِ قدیمہ قائم ہوا تھا اور کرزن سے خواجہ صاحب کی یاد اللہ تھی۔ انھوں نے تاریخی عمارتوں کی نشان دہی کرنے اور اُن کی حفاظت کے اقدامات تجویز کرنے میں اس نومولود محکمہ کے ساتھ بہت تعاون کیا تھا۔ دلی کے خاندانوں سے بھی وہ خوب واقف تھے اور کم از کم ایک سو سال کی تاریخ انھوں نے چشم دید گواہوں سے سن رکھی تھی۔ خود اُن کا تاریخ کا مطالعہ اور ذوق بہت اچھا تھا۔ اسلامی ہند کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے تھے مگر اُن کے تخیل میں بڑی بلند پروازی تھی اور بنیادی طور پر وہ ایک انشا پرداز تھے۔ یہ دونوں باتیں اپنی جگہ بڑا بھاری وصف ہیں مگر تاریخ کے ساتھ مل کر موجب فساد بن جاتی ہیں۔ اس لیے خواجہ صاحب نے ۱۸۵۷ء کے واقعات پر یا اسلامی ہند کی تاریخ پر جو کچھ لکھا ہے وہ معلومات عامہ کے لیے بہت مفید اور مؤثر ہے مگر وہ خالص تاریخ (Hi) ہسٹری) نہیں ہے۔

انھوں نے اصلاح معاشرہ کے لیے بھی بہت سے عملی کام کیے اور چھوٹی بڑی درجنوں کتابیں لکھیں۔ تعلیم نسواں، تربیت اطفال، تعلیم بالغان، بین مذہبی اتحاد، اور رواداری، یہ سب وہ موضوعات تھے جن پر وہ ہمیشہ لکھتے رہے۔

ان کا روزنامچہ غالباً ۱۹۲۰ء سے منادی میں چھپنا شروع ہوا اور اسے وہ مقبولیت حاصل ہوئی جو کسی دوسرے روزنامچے کو نہ مل سکی۔ اسے بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب پڑھتے تھے اور سب کا اس میں ذکر ہوتا تھا۔ خواجہ صاحب پبلسٹی خوب کرتے تھے مگر ان میں خود بینی و خود نمائی نہیں تھی وہ کسی معمولی انسان کو بھی نظر انداز نہ کرتے تھے اور ہر ایک کی کھلے دل سے حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ انھیں ہر شخص کی خوبیاں بغیر تلاش کیے ایسے نظر آجاتی تھیں جیسے ہمیں دوسروں کے عیب نظر آتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ جہاں بھی رہے محبوب و محترم رہے۔ مخالفوں نے بہت کچھ کیا مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ ان کی معرکہ آرائیاں بھی مرزا حیرت دہلوی، دیوان سنگھ مفتوں اور مولانا محمد علی جوہر جیسی قد آور شخصیتوں سے رہیں مگر خواجہ صاحب نے دشمنی میں بھی وقار و تمکنت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

وہ بے مثل انشا پرداز تھے۔ اردو زبان اپنی ساری وسعت اور توانائی کے ساتھ ان کے قلم سے ظاہر ہوئی ہے موضوع پر سب لکھتے ہیں وہ بغیر موضوع کے لکھتے تھے اور جن چند اہل قلم کا نام انشائیہ یعنی ESSAY کے لیے ہم لے سکتے ہیں ان میں ایک خواجہ صاحب یقیناً ہیں۔

وہ بے تکان لکھتے تھے اور ان کی قوت مشاہدہ بہت تیز تھی۔ کہیں سے سرسری بھی گذر جائیں تو اپنے تاثرات ایسی جزئیات کے ساتھ بیان کرسکتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی حالانکہ وہ خود کہتے تھے کہ میرا حافظہ اچھا نہیں اور ان کا ذخیرۂ الفاظ VOCABULARY بھی زیادہ نہیں ہے۔ اردو کے سیدھے اور سرل لفظوں سے کلام چلاتے ہیں ابوالکلام کی طرح قاموسی اردو وہ شاید لکھ بھی نہ سکتے تھے۔ مگر ان کی قوت متخیلہ Imagery بہت قوی تھی۔ ذہانت کی چنگاری اس میں تب و تاب پیدا کرتی تھی اور جدت کا ولولہ نئی نئی باتیں سمجھاتا تھا۔

ان کی زندگی میں بھی رکھ رکھاؤ، سلیقہ اور نفاست تھی۔ تحریروں میں بھی چھوٹا پن نہیں ہے ان کے حلقۂ احباب میں وائسرے ہند، نظام حیدر آباد، والیان ریاست، وائسرائے کونسل کے ممبران اور حکومت کے اعلیٰ ترین عہدیدار بھی شامل تھے۔ تھے، لیکن انھوں نے عام اور معمولی آدمیوں سے خود کو جوڑے رکھا، اور یہ شاید تصوف کی برکت تھی، ورنہ اتنے بلند حلقے میں مقبول و متعارف ہونے کے بعد انسان اپنی اصلی شکل بھی بھول جاتا ہے دوسروں کو تو کیا پہچانے گا۔ خواجہ صاحب کی سیرۃ اور شخصیت کے دلنواز نقوش آج بھی ان کے روزنامچے میں دیکھے جا سکتے ہیں جس میں وہ زندہ و متحرک نظر آ رہے ہیں۔

☆

پروفیسر محمد حسن

خواجہ غلام السیدین

ہندوستان ابھی آزاد نہیں ہوا تھا ۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء کا زمانہ تھا فضا میں ابھی تک یونین جیک لہراتا تھا اور پورے ملک کے طول وعرض میں راجہ رجواڑے، مہاراجہ اور نوابوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں بکھری ہوئی تھیں کچھ ریاستیں خاصی ترقی یافتہ بھی تھیں ان ریاستوں میں چھوٹی سی ایک ریاست تھی رام پور جو اپنی بے مثل لائبریری، اپنے ہوشمند وزیراعظم کرنل بشیر حسین زیدی، اپنے حکمراں نواب رضا علی خاں کی موسیقی سے دلچسپی، رضا شوگر ملز اور ملک کے مشہور طلبہ نواز محمد جان تھرکوا اور موسیقار مشتاق علی خاں سے پہچانی جاتی تھی۔ نواب صاحب رام پور اور ان کے وزیراعظم کرنل زیدی کو ملک کے طول وعرض سے جوہر قابل جمع کرنے کا شوق تھا۔ یہ راز اب راز نہیں رہا کہ ریاست رام پور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پرانی مربی رہی ہے غالب کو ادبی دنیا میں متعارف کرنے کے کام میں بھی اس ریاست کا اور رضا لائبریری رام پور کے لائبریرین امتیاز علی عرشی صاحب کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ سیدین صاحب اسی ریاست میں مشیر تعلیمات تھے۔

وہ اس سے پہلے ہی تعلیم اور ادب دونوں شعبوں میں نمایاں ہو چکے تھے اور مجھ جیسے ادب کے طالب علم ان کی مشہور کتاب Educational Philosophy of Iqbal سے فیض یاب ہو چکے تھے مگر سب سے پہلے سیدین صاحب سے نیاز رام پور ہی میں حاصل ہوا۔

۱۹۴۶ء میں لکھنؤ یونی ورسٹی کے ایم۔ اے (اردو) کے طالب علم کی حیثیت سے مجھے جلال لکھنوی پر مقالہ لکھنا تھا اور ضامن علی جلال اور ان کے والد دونوں ریاست رامپور سے وابستہ تھے لہذا رضا لائبریری رام پور کے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا۔ وسائل محدود تھے اور جان پہچان بہت کم۔ صرف اتنا جانتا تھا کہ سیدین صاحب مشیر تعلیم ہیں اور ادیب ہیں تن بہ تقدیر ان کو خط لکھا اور ان سے مدد چاہی۔ اور توقع کے خلاف اُمید افزا جواب آیا۔

رامپور کی صاف ستھری سڑک کے کنارے ریلوے اسٹیشن سے کچھ ہی دور پر ایک ستھرا سا بنگلہ اور اس کا چھوٹا سا سبز لان آج تک یاد ہے اس شاداب لان پر چار مونڈھے پڑے ہوئے تھے یہیں پہلی بار سیدین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ دھان پان مگر خوش قامت۔ ہلکے فریم کا چشمہ سادہ مگر جسم پر سجتی ہوئی شیروانی آواز شائستہ نرم اور پتلی۔ لہجہ متوازن۔ جیسے دنیا میں ہر جگہ خیریت ہو اور زندگی کی حقیقتوں کا عرفان حاصل ہو چکا ہو۔ ایک معمولی اور اجنبی طالب علم کے سبھی مسئلے تو اس پندرہ منٹ کی ملاقات میں حل ہو گئے۔ چشمے کے چھوٹے چھوٹے شیشوں کے پیچھے چمکتی ہوئی آنکھوں میں ہمدردی محبت اور شائستگی کی یادگار روشنی تھی جو آج بھی یادوں میں جگمگاتی ہے۔

جتنے دن رامپور رہنے کا اتفاق ہوا تقریباً ہر روز شام کو سیدین صاحب سے ملنے کا موقع ملتا رہا اور ان مختصر ملاقاتوں میں ان کے کھرے ادبی ذوق۔ ان کی تعلیمی بصیرت اور ہمہ گیر اور ہمہ جہت علمیت کی جھلکیاں بار بار گفتگو کے دوران جگمگاتی تھیں زمانہ ایسا تھا جب مسلم لیگ اور کانگریس کے مناقشے اور قومی یک جہتی اور دو قوموں کے نظریے سے گونج رہا تھا اس موقع پر چند ہی ایسے لوگ تھے جن کی نظر اور ذہن دھندلے نہیں ہوئے۔ سیدین صاحب انہی چند لوگوں میں سے تھے جو مصلحت کی بنا پر نہیں علمی دیانت کی بنا پر متحدہ قومیت کے علمبردار تھے۔

تاریخ نے زمانے کا ورق الٹ دیا۔ ملک تقسیم ہو گیا۔ اُردو کا ملک میں کوئی مستقبل نہ تھا۔ فرسٹ کلاس فرسٹ ایم اے ہونے کے باوجود بے روزگاری میرا پیچھا کر رہی تھی۔ سیدین صاحب بمبئی جا چکے تھے وہاں مشیر تعلیم تھے۔ اس زمانے میں جب بھی سیدین صاحب کو خط لکھا اس کا جواب انھوں نے اسی دن لکھا مشورے دیے تعارفی خط لکھے اور ایک اجنبی طالب علم کی ہمت افزائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

پھر سیدین صاحب کشمیر چلے گئے اور کچھ ہی دنوں بعد حکومت ہند میں سکریٹری تعلیمات کے اہم عہدے پر دہلی آ گئے میں بھی لکھنؤ یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ملازمتوں سے گزرتا ہوا دہلی آگیا تھا اور اب ایک بار پھر سیدین صاحب سے نیاز حاصل ہوا۔

سیدین صاحب نے فکر انسانی کا ارتقا پر نظام اُردو خطبات دیئے تھے وہ ان کے مزاج اور اور شخصیت کے پورے طور پر آئینہ دار تھے اگر تعلیم سے مراد انسان کی شخصیت کی تربیت اور تکمیل ہے تو سیدین صاحب ایک مثالی معلم تھے وہ محض نظریہ ساز نہیں تھے ایک ایسی شائستہ شخصیت تھے جس کی تعمیر میں انسانی تہذیب کی ساری پونجی صرف ہوئی تھی۔

سیدین صاحب سے ملنے کا اتفاق مختلف جگہوں پر ہوا۔ رامپور کے بنگلے کے فرحت بخش لان پر، سری نگر میں سرکاری دفتر میں، اور پھر دہلی کی سنٹرل سکریٹریٹ کی وزارت تعلیم کے خوبصورت پتھروں کے تراشے ہوئے ستونوں کے کمرے میں ـــــ ہر جگہ سیدین صاحب کی شخصیت دفتر کرسی، عہدے اور ظاہری ٹیم ٹام پر حاوی تھی۔ وہی سادہ سی شیروانی، وہ بے تکلف سی مسکراہٹ، وہی سیدھی چال وہی شائستہ لہجہ، وہی نرم روی۔

سیدین صاحب اس اعتدال اور توازن کی مثال تھے جو بیسویں صدی میں کم یاب ہے۔ ان کے چہرے پر کوئی تناؤ، کوئی الجھن، کسی بیزاری، بے دلی یا ناکامی کے عکس سے پاک تھا اسی لئے نہ انھیں کسی سے مرعوب کرتے تھے نہ کسی سے مرعوب ہوتے تھے ان پر منصب کبھی غلبہ نہیں پا سکا اسی لئے ان کا حس مزاح ہمیشہ ایک خاص وقار کے ساتھ ان کے مزاج کا حصہ بنی رہی۔ وزارت تعلیمات کی فائلوں پر نوٹ لکھتے وقت بھی ان کے جملے لطف سے خالی نہ ہوتے تھے ایک بار ان کے عملے میں کوئی عجیب و غریب نوٹ لکھنے والے انڈر سکریٹری کا تقرر ہوا جب ان انوکھے رپورٹوں والے فائل سیدین صاحب کے پاس پہنچے تو ان کا ایک جملے کا تبصرہ پوری سکریٹریٹ میں مشہور ہو گیا۔

Who is this rising star on our secretarial horizon

سیدین صاحب سے مل کر ان کی شائستگی، میانہ روی اور معاملہ فہمی سے متاثر نہ ہونا ممکن نہ تھا۔ ان کی کتاب "آندھی میں چراغ" کو ساہتیہ اکادمی کا انعام ملا۔ حق یہ ہے کہ ان کی پوری شخصیت

اسی ایک عنوان کی تفسیر ہے۔

ہوا تھی گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا تھا
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے تھے انداز خسروانہ

زندگی کا آخری زمانہ تھا بستر مرگ پر تھے بنگلہ دیش کی لڑائی کے بادل برعظیم پر منڈلا رہے تھے سیدین صاحب نے بنگلہ دیش کی لڑائی میں حق خود ارادیت ۔ اور جمہوری اقدار کی جھلکیاں دیکھی تھیں اور اسے آزادی کی جدوجہد سمجھا تھا اس لیے بستر مرگ سے اس جدوجہد کی حمایت میں آواز بلند کی ۔ ان کے سیاسی نقطۂ نظر سے اختلاف ممکن ہے لیکن سوال یہ ہے کہ زندگی کی آخری سانسوں تک انسانی اقدار سے اپنی وابستگی کو نبھا ہنے کی ایسی ہمت اور جرأت کتنے لوگ کر سکتے ہیں ۔

آج سیدین صاحب کو یاد کرنا اپنی تہذیب کی ان نشانیوں کو یاد کرنا ہے جس سے زندگی جینے کے لائق معلوم ہونے لگتی ہے بقول سرور بارہ بنکوی :

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں

⁂

ناز انصاری

لالہ دیش بندھو گپتا

لالہ دیش بندھو گپتا کی حیات اور کارناموں کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو اُن کی زندگی کے کئی ایسے گوشے نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں جو اُن کے دوسرے ہم عصروں کی زندگی میں نہیں ملتے اگر کچھ مشابہت پائی جاتی ہے تو ان سب لوگوں میں سے جن کے خاکے یہاں پڑھے گئے یا پڑھے جائیں گے وہ مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔ دونوں جنگ آزادی کے مجاہد دونوں اخبار نویس دونوں سیاستداں دونوں پارلیمینٹرین اور دونوں ہی خطیب بھی تھے۔ دونوں کی زندگی میں کچھ پہلو ایسے بھی ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مثلاً مولانا سیاست میں آئے تو صحافت کو ترک کر دیا اور پھر اسی دشت کی سیاحی میں عمر گذر گئی۔ لالہ جی سیاست میں بھی رہے۔ پارلیمنٹ میں بھی پہنچے مگر آخری وقت تو وادی صحافت کی گلگشت میں بھی مصروف رہے۔ مولانا کو اپنے نظریات اور سیاسی عقائد کے لئے اپنی ملّت کا سب وشتم برداشت کرنا پڑا مگر لالہ جی خوش قسمت تھے کہ انھیں ایسے کسی سانحہ سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔

لالہ دیش بندھو گپتا ہندوستانی زندگی بالخصوص دِلّی کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کے

ایک ایسے ستون تھے جس کے ہٹانے یا الگ کرنے سے اِس کی عمارت قائم نہیں رہ سکتی وہ ایک عہد کی تاریخ تھے وہ روایتی گنگا جمنی تہذیب کے جو اب مٹتی جارہی ہے ایک ایسا پیکر تھے جس سے اُس تہذیب کی عظمت کا اندازہ بخوبی ہوسکتا ہے وہ دہلوی نہیں تھے بلکہ دِلّی پر یلغار کرنے والوں کے آخری پڑاؤ پانی پت کی سرزمین سے اُٹھے تھے مگر دِلّی آئے تو یہاں آنے والے دوسرے لوگوں کی طرح 'ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے' دِلّی کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے۔ اُن کی رگ و پے میں دہلویت رچ بس گئی انھوں نے پوری لگن۔ تن دہی اور جانفشانی سے گیسوئے دِلّی کو جو آج بھی منّت پذیر شانہ ہے سنوارا اور دِلّی نے بھی عزت و عظمت کے پھول نچھاور کئے۔ انھوں نے اپنے شب و روز میں دِلّی کو جس طرح حصہ دار بنایا دِلّی نے بھی کما حقہٗ بدلہ چکایا۔

لمبا قد شمشاد کا سا۔ کتابی چہرہ ایک عہد کی تاریخ پختہ رنگ عزم و ہمت کی پختگی کا عکاس لمبی اونچی ناک جس نے دِلّی کی ناک اونچی کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں دِلّی کی تہذیب و شرافت مہر و محبت وضع داری و رواداری کے چھلکتے ہوئے پیمانے۔ اُن پر گول سنہرے فریم کا چشمہ شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنتے تھے۔ رفتار میں وجاہت گفتار میں نقاہت تھی۔ وضعداری مروّت میل جول میں دلّی کی تہذیبی اور مِلی جُلی زندگی تمام روایات اُن کا اثاثہ تھیں۔

خطابت

آواز گرجدار۔ تقریر کا انداز دل پذیر ہوتا بغیر لاؤڈ اسپیکر کے بھی مجمع کنٹرول کرنے میں مہارت رکھتے تھے تقریر میں غالب کے اشعار اِس طرح سے چُست کرتے معلوم ہوتا کہ مرزا نے اسی موقع کے لئے کہے تھے۔ تقریر میں فصاحت و بلاغت قدرت کی دین تھی معلوم نہیں اُن پر آصف صاحب کا اثر تھا یا آصف صاحب اُن سے متاثر ہوئے تھے انگریزی کا ایک لفظ استعمال کرنے کی اجازت ہو تو میں کہوں گا کہ وہ بہت اچھے اوریٹر (ORATOR) تھے۔ لالہ جی عوامی مجمعوں ہی کے مقرر نہیں تھے بلکہ بہت اچھے پارلیمنٹرین بھی تھے۔ جہاں عوامی جلسوں کی تقاریر میں لطیفہ گوئی اور اشعار کی نگینہ سازی ہوتی وہاں پارلیمانی تقاریر میں قانونی موشگافیاں اور نکتہ سنجی و نکتہ رسی ہوتی تھی۔

صحافت

میں یہاں اُن کی تحریر کا کوئی نمونہ پیش کرنے سے توفی الوقت قاصر ہوں لیکن میرا مطالعہ یہ ہے کہ اُن کے اداریوں میں MARSHALING OF FACTS (حقائق و واقعات کی ترتیب) ہوتی تھی۔ دلائل سے قاری کو قائل کرتے تھے۔ ایک اخبار نویس کی حیثیت میں روزمرہ کے مسائل پر وطن پرورانہ جذبہ سے اظہارِ خیال کرتے تھے اپنے بہت سے ہم عصروں سے جن میں مولانا محمد علیؒ اور خواجہ حسن نظامی کے نام خصوصیت سے لئے جا سکتے ہیں اکثر صحافتی نوک جھونک ہی نہیں جھڑپیں بھی ہوئی ہیں لیکن اِن سب کے پس منظر میں لالہ جی کی وطن پرورانہ زندگی اور مزاج کارفرما نظر آتا ہے۔ لالہ جی نے تیج کے کرشن نمبر نکالنے کا سلسلہ شروع کیا تو انھوں نے اپنے دور کے مسلمان رہنماؤں، علما، شعرا، اور اُدبا کو سری کرشن جی کی زندگی پہ قلم اُٹھانے کی دعوت دی اور ایک نوٹ اخبار میں لکھا کہ میں ایسا اِس لئے کر رہا ہوں کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے نزدیک آئیں ایک دوسرے کے مذہب کے بارے میں انھیں واقفیت حاصل ہو۔ بدگمانیاں اور غلط فہمیاں دور ہوں۔ چنانچہ ہمیں تیج کے کرشن نمبروں میں حضرت مولانا احمد سعید۔ مولانا عارف ہسوی۔ خواجہ حسن نظامی۔ سید آصف علی بیرسٹر۔ سائل صاحب، سیماب صاحب اور بہت سے دوسرے نامور اور سرکردہ مسلمانوں کے نام ملتے ہیں۔ تیج ہندوستان میں پہلا اردو اخبار تھا جس نے اردو زبان اور اُس کے قارئین کے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے تیج کا ایک السٹریٹڈ ویکلی ایڈیشن شروع کیا، ریڈنگ میٹر کے اندرونی صفحات لیتھو میں ہوتے تھے مگر کتابت وطباعت نہایت عمدہ ہوتی تھی جو لالہ جی کی نفاست پسندی کا ثبوت کہی جا سکتی ہے۔ تیج ویکلی کے فائل پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوگا کہ اس کے لئے انھوں نے اُس وقت کے تمام اردو اہلِ قلم کا جن میں ادیب۔ شعرا اور افسانہ نگار سبھی شامل ہیں قلمی تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اور تیج کو ایک ایسا معیاری جریدہ بنا کر پیش کیا کہ اُس جیسا کوئی دوسرا ویکلی آج تک شائع نہیں ہوا اور اُس پر ہمیشہ اردو صحافت میں فخر کیا جائے گا۔

انھوں نے روزنامہ تیج 1923ء میں جاری کیا تھا اور 1930ء میں تین ماہ کے اُس وقفہ کے علاوہ جب برطانوی حکومت نے اُسے دِلی کے دوسرے دو جریدوں انگریزی کے ہندوستان ٹائمز اور ہندی کے ارجن کے ساتھ بند کیا تھا وہ آج تک پابندی سے شائع ہو رہا ہے اور مدت ہوئی اپنے ہم عصروں کی طرح آفسٹ پرنٹنگ کو اپنا چکا ہے۔

آبائی وطن اور پیدائش

لالہ دیش بندھو گپتا کی ولادت اس وقت کے پنجاب کے مشہور شہر اور بہت سی تاریخی جنگوں کے میدان پانی پت میں 14 جون 1900 کو ہوئی۔ آپ تین بھائی تھے اُن میں سے لالہ جیالال جی کا انتقال ہو چکا ہے اب ایک بھائی لالہ دھرم پال گپتا وفا ایڈیٹر تیج ویکلی حیات ہیں ابنالہ سے آپ نے میٹرک کیا اور اُس کے بعد دلی آکر سینٹ اسٹیفن کالج میں داخلہ لیا لیکن جلیانوالہ باغ کے حادثہ نے جو پورے ملک میں بیچینی پیدا کر چکا تھا۔ نوجوان دیش بندھو کے دماغ پر بھی اثر کیا اس کے بعد جب گاندھی جی نے ترک موالات کی تحریک شروع کی تو وہ بھی کالج سے باہر آگئے اس کے بعد جو تعلیم کا سلسلہ منقطع اور قید بند کا آغاز ہوا تو پھر وہ اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ اسی تحریک میں پہلی بار جیل گئے اور پھر 1942ء کی ہندستان چھوڑ دو تحریک تک نو بار جیل گئے اور تین ماہ سے لے کر دو سال تک مختلف اوقات اور مختلف تحریکوں میں سزائیں بھگتیں، اور ابنالہ، روہتک کرنال، منٹگمری ملتان لاہور گجرات اور دِلی کے جیلوں کو آباد کیا۔ نہ صرف سجن و زنداں کو لبیک کہا بلکہ ہر وقت دار و رسن کی آزمائش کے لئے بھی تیار رہے۔

عوامی نمائندگی کے میدان میں

لالہ جی اُن لوگوں میں سے ہیں جنہیں میونسپل کمیٹی سے لے کر پارلیمنٹ تک عوامی نمائندگی کا شرف حاصل ہوا وہ دلی میونسپل کمیٹی کے ممبر رہے پھر ۲۸ء میں پنجاب اسمبلی کے رُکن بنے۔ بعد ازاں آزادی کے بعد بہار سے دستور ساز اسمبلی کے ممبر بن کر آئے جب وہ پارلیمنٹ میں تبدیل ہوئی تو لالہ جی اُس کے رُکن بھی تھے۔ پنجاب اسمبلی اور

دستور سازی کے دوران پھر پارلیمنٹ میں اُن کی بعض تقریریں یادگار نوعیت کی رہی ہیں۔

پارلیمنٹ میں لالہ جی دلی کے مسائل سے خصوصی دلچسپی لیتے رہے وہ اور آصف علی صاحب دلی کو صوبہ بنانے کے علمبرداروں میں سے تھے اور یہ انہی دونوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا دِلی ایک سی کلاس اسٹیٹ بنی اور یہاں اسمبلی قائم کیے جانے کا اعلان ہوا 1952ء کے عام انتخابات کے بعد یہ اسمبلی وجود میں آئی 1951ء میں جب 1952ء کے پہلے عام انتخابات کے لئے ٹکٹوں کی تقسیم کا سلسلہ شروع ہوا تو اُس وقت عام طور پر یہ چرچا تھا کہ لالہ جی دِلی کے پہلے وزیرِ اعلیٰ ہوں گے۔

مگر ــ مالک قضا و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ لالہ جی اُس وقت آل انڈیا نیوز پیپرز کانفرنس کے صدر تھے۔ اُس کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لئے کلکتہ روانہ ہوئے تو ڈم ڈم کے ہوائی اڈہ پر جہاز کو حادثہ پیش آیا اور 22 نومبر 1951ء کو لالہ جی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے۔ اور اس طرح دِلی کی ایک قد آور۔ فعال اور ایسی ڈائنمک زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ جس نے دِلی کے لئے وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتا تھا اور جس سے دِلی والوں کو بہت سی اُمیدیں تھیں ؎

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

انور دہلوی
اڈیٹر، عوام، دہلی

سردار دیوان سنگھ مفتوں

صدر محترم، ممبرانِ اُردو اکیڈیمی اور حاضرینِ جلسہ

اُردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام منعقد کئے جانے والے اس سیمینار میں جس کا عنوان "دلی والے" ہے مجھے سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست پر خاکہ نگاری کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ اس پر مجھے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب غبار خاطر میں چھپی ہوئی چند سطور پیش کرنے کی اجازت دیجئے اس لیے بھی کہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ اُردو کی جس محفل میں ابوالکلام آزاد جیسے ساقیٔ اُردو کی عبارت نہ پڑھی جائے۔ جس نے اپنے میں اُردو کے میخانے سے ہمیں اور آپ کو پوری فراخ دلی سے جام پر جام عطا کئے ہوں اس محفل میں کمی سی ضرور محسوس ہوتی ہے۔ ۸۔ ۹ اگست کی درمیانی رات کو بمبئی میں جب مولانا آزاد کو انگریزو ہندوستان چھوڑو کی تحریک کی تجویز پاس ہونے پر گرفتار کر کے نظر بندی کے لیے احمد نگر لے جایا جارہا تھا اس کی منظر کشی مولانا کی زبان میں ملاحظہ ہو۔

"احمد نگر کے نام نے حافظے کے کتنے ہی بھولے ہوئے نقوش یکایک تازہ کر دیئے ریل تیزی کے ساتھ دوڑی جارہی تھی میدان کے بعد میدان گزرتے جاتے تھے ایک منظر پر نظر جمنے نہیں پاتی تھی کہ دوسرا منظر سامنے آجاتا اور ایسا ہی ماجرا میرے دماغ کے اندر بھی گزر رہا تھا احمد نگر اپنی چھ سو برس کی داستانِ کہن کے ورق پر ورق الٹتا جاتا ایک صفحے پر نظر جمنے نہ پاتی کہ دوسرا سامنے آجاتا۔

گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

مجھے خیال ہوا اگر ہمارے قید و بند کے لیے یہی جگہ چنی گئی ہے تو انتخاب کی موزونیت میں کلام نہیں ہم خراباتیوں کے لیے کوئی ایسا ہی خرابہ ہوتا تھا"

حضرات مولانا کی کتاب غبارِ خاطر کا یہ اقتباس میں جُوں کا تُوں اُردو اکیڈمی کے سکریٹری جناب سید شریف الحسن نقوی اس سیمنار کے ڈائرکٹر صلاح الدین صاحب اور اکادمی کے ان دوسرے ممبران کی نذر کرتا ہوں جنھوں نے انور دہلوی کو سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست پر خاکہ نگاری کے لیے چنا اور اب میں خاکہ پڑھنا شروع کرتا ہوں۔

تحصیل حافظ آباد ضلع گجرانوالہ کے ایک مشہور ڈاکٹر کے ہاں پیدا ہونے والا ایک ذہین اور ہونہار لڑکا کبھی ہندوستان کا عظیم صحافی بنے گا اور اپنے زورِ قلم سے بڑے بڑے راجوں مہاراجوں اور نوابوں کی چولیں ہلا کر علمی طور پر "قلم گوید کہ من شاہِ جہانم" ثابت کردے گا اس کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا پستہ قد بھاری بدن سُرخ آنکھیں رعب اور دبدبہ غضب کا معمولی لباس قمیض چھوٹی موری کی شلوار اور سر پر ململ کی چھوٹی سی پگڑی جسے ہر دس پندرہ منٹ کے بعد سردار صاحب کو سنبھالنا ضرور ہوتا تھا ہاتھ میں کڑا ضرور ہوتا تھا لیکن سردار صاحب خود بڑے مزاحیہ انداز میں فرماتے تھے کہ ۲/۱ ۱۲ فی صد سکھ ہوں اس لیے کہ پانچ ککوں میں میرے پاس کڑا اور ایک چھوٹا سا کنگھا ہی رہتا ہے باقی تین ککے کرپان اور کچھا تو بالکل نہیں ہیں البتہ کیس (بال) ہیں جو نہ ہونے کے برابر ہیں ایک مہینہ سے کچھ زیادہ ہی عمر ہوئی تھی کہ باپ کے سایہ سے محروم ہو گئے اعلیٰ تعلیم کا سوال تو پیدا ہی نہیں ہوتا تھا اس لیے اپنی خداداد ذہانت اور

اور قابلیت سے جو شُد بُد اُردو زبان میں حاصل کی اور بقول خود امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، حضرت علامہ سید سلیمان ندوی، حضرت مولانا عبدالماجد دریا آبادی جیسے بزرگوں کی تحریروں نے انھیں "ریاست" کا ایڈیٹر بننے میں ہمیشہ رہنما اصولوں سے روشناس کرایا سردار صاحب نے ملا واحدی اور خواجہ حسن نظامی کے ساتھ ۱۹۲۰ء میں اخبار "رعیت" میں کام کیا اور ۱۹۲۴ء میں "ریاست" شروع کیا۔

سردار دیوان سنگھ مفتون غالباً ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ تاریخ پیدائش انھیں خود بھی معلوم نہیں تھی البتہ ۲۶ جنوری ۱۹۷۵ء کو اُن کا انتقال ہوا تو انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۵ برس کی تھی۔ انتقال سے چند سال پہلے راجپورہ دہرہ دون میں جاکر سکونت پذیر ہو گئے تھے اور اکثر کہتے تھے کہ عمر کا آخری حصہ سکون سے گزر رہا ہے۔

سردار دیوان سنگھ مفتون اور "ریاست" گویا لازم و ملزوم ہیں۔ ایڈیٹر ریاست کی کہانی ایک شخص یا ایک ذات کی کہانی نہیں، متحدہ ہندوستان کے ایک پورے دور اور ایک ادارے کے عروج و زوال کی داستان ہے سردار صاحب اپنی ذات میں ایک انجمن تھے اور ریاست اخبار ایک مکمل ادارہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ بے شمار لوگوں کا جی ان کی صحبت میں لگتا تھا دفتر "ریاست" دہلی میں صبح سے شام تک آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا ان میں غریب، امیر، وزیر ریاستوں کے دیوان سرکاری ملازم سی آئی۔ ڈی کے لوگ پولیس والے کروڑ پتی تاجر اور معمولی دکاندار، یتیم بچے، بیوائیں، شرابی شاعر، ادیب سبھی شامل تھے سردار صاحب کے دروازے ہمیشہ سب کے لیے کھلے رہتے تھے۔ وہ ہر ایک سے ایک جیسے خلوص سے ملتے تھے وہ ہر ضرورت مند کی خدمت کے لیے دامے درمے، قدمے سخنے مدد کے لیے ہر پل تیار رہتے تھے لوگ ان سے ڈرتے بھی تھے اور پیار بھی کرتے تھے دیوان سنگھ یوں تو سکھ تھے لیکن سبھی مذہبوں کا دل سے احترام کرتے تھے ان کا دفتر اور گھر عام طور پر ایک ہی کمرہ ہوتا تھا دیوان سنگھ میں کوئی ہیر پھیر کوئی نمود و نمائش اور چھل فریب نہ تھا وہ پکے قوم پرست اور انھوں نے اپنی زندگی ایک نصب العین اور ایک مشن کے سپرد کر رکھی تھی۔ اعلائے کلمۃ الحق ہی ان کا مقصدِ زندگی تھا اور وہ جب تک اپنا اخبار نکالتے رہے دیکم جنوری ۶۲ء تک) اسی نصب العین اور مشن کیلئے سینہ سپر رہے اپنے کام اور فرض میں ایسا انہماک بہت کم لوگوں

میں پایا جاتا ہے یہ احساسِ فرض غالباً انھوں نے اپنے مرشد میر بشارت علی جالب دہلوی سے حاصل کیا تھا میر صاحب بھی سیدھے سادے جُل چتر سے پاک، سچی اور بے لاگ کہنے والے انسان تھے جنھوں نے صحافت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا۔ دیوان سنگھ نے یہ ساری خوبیاں اپنے میں جذب کر لیں۔

دیوان سنگھ کیوں کہ چھوٹی عمر میں یتیم ہو گئے اور جیسا کہ عام طور پر ان حالات میں ہوتا ہے والد کے انتقال کے بعد رشتہ داروں نے زمین اور جائیداد پر قبضہ کر لیا بارہ سال تک ان کی والدہ زیور اور گھر کا سامان بیچ بیچ کر بچوں کو پالتی رہیں ان کی کتاب "ناقابلِ فراموش" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایک بڑے بھائی اور تین بہنیں تھیں جن کی شادیاں ان کی والدہ نے ہی جیسے تیسے کیں۔ وہ چھٹی جماعت میں ہی تھے تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا اور مستقبل کا ایڈیٹر ریاست ایک دُکان پر خریداروں کے سامنے کپڑے کے تھان کھولنے اور رکھنے کے لیے پانچ روپیہ ماہوار کا ملازم ہو گیا۔ اتنی کم عمری میں ہی انھیں کام سے لگن اور اٹھارہ گھنٹے لگاتار کام کرنے کا سبق ملا جس پر وہ تمام عمر کاربند رہے تعلیم کا سلسلہ تو جاری نہ رہ سکا مگر مطالعہ کا بے حد شوق ہمیشہ رہا۔ جس وقت وہ فیروز پور کے سول ہسپتال میں ملازم تھے تو کئی ادبی رسائل کے خریدار تھے حالاں کہ تنخواہ صرف ۶ روپے ماہوار تھی اس کے علاوہ بھی جہاں کہیں سے بھی کوئی رسالہ یا کتاب مل جاتی اُسے چاٹ جاتے۔ ادب سے لگاؤ اور ادیب بننے کا چسکا اُنھیں سولہ سترہ سال کی عمر میں ہی پڑ گیا تھا چنانچہ دیوان سنگھ خود لکھتے ہیں کہ ایک بار میں نے سوچا اگر میں اُردو لٹریچر میں ہی کمال حاصل کرنا چاہتا ہوں تو ان رسائل کو پڑھنے کی کیا ضرورت ہے صرف ایک کتاب یعنی اُردو کی کوئی لغت حفظ کر لوں۔ چنانچہ کریم اللغات خریدی گئی اور جب حفظ نہ ہو سکی تو اپنی حماقت پر پچھتائے اور کریم اللغات کی ڈگری حاصل کرنے کا خیال ترک کر دیا۔

سردار جی فیروز پور اور موگا کے ہسپتالوں میں دس بارہ روپے ماہوار پر کمپاؤنڈری کرتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ مختلف اخبارات اور رسائل کے مطالعے سے اپنی ادبی پیاس بجھاتے رہے اسی زمانہ میں کسی اخبار کا ایڈیٹر بننے کی آرزو نے ان کے دل میں جنم لیا مگر اس کا اظہار وہ کسی سے نہ کر سکے بلکہ اپنی قابلیت بڑھانے کی کوششیں تیز تر کر دیں تین سال موگا میں کام کرنے کے بعد وہ مانسہ

(پٹیالہ) آگئے اور خود پریکٹس شروع کردی موگا میں وہ مشہور و معروف ماہر چشم ڈاکٹر متھرا داس کے ساتھ کام کرتے تھے اور بعد میں انھوں نے موتیابند کا آپریشن کرنا بھی سیکھ لیا تھا۔ سردار جی میں شدید محنت اور سیکھنے کی لگن آخر دم تک باقی رہی۔ مانسہ میں میڈیکل پریکٹس سے ان کی آمدنی چار سو پانچ سو روپے کے لگ بھگ ہوگئی جو اس زمانے میں بہت تھی۔ یہیں اُنھوں نے پہلی بار قلم اُٹھایا اور لاہور کے خالصہ اخبار میں ایشر سنگھ فیروز پوری کے فرضی نام سے پہلا مضمون بھیجا جو شائع ہوگیا اس کے بعد دو مضمون اور بھیجے اور ساتھ ہی ایڈیٹر خالصہ نے انھیں اپنا اخبار ایڈٹ کرنے کی دعوت دی اور ایک دوست کے مشورے سے اچھی خاصی میڈیکل پریکٹس چھوڑ کر لاہور آگئے اور صحافت کی وادی میں جرأت مندانہ حوصلے کے ساتھ پہلا قدم بڑھادیا۔

دیوان سنگھ کی جدوجہد کی داستان طویل ہے انھوں نے لاہور میں رہ کر یکے بعد دیگرے کئی اخبارات میں کام کیا اور جب خالصہ اخبار ان کے آتشیں قلم کا نشانہ بن کر چار ماہ بعد ہی موت کی آغوش میں سوگیا تو وہ لکھنؤ درسِ صحافت لینے میر جالب دہلوی کی خدمت میں پہونچ گئے جہاں بلا معاوضہ چند ماہ کام کرتے رہے بالآخر شدید محنت اور مناسب خوراک نہ ملنے کے باعث بیمار ہوکر واپس پنجاب چلے گئے انھیں میر جالب دہلوی سے ہمیشہ شکوہ رہا کہ انھوں نے صحیح رہنمائی اور نگرانی سے پہلوتہی نہ کی ہوتی تو میں لکھنؤ سے کبھی پنجاب کا رخ نہ کرتا کچھ عرصہ وہ ریاست نابھہ میں ملازم رہے اور پھر دہلی آکر ملا واحدی اور بھیا احسان الحق رئیس میرٹھی اور حضرت خواجہ حسن نظامی کے ساتھ "رعیت" میں کام کیا۔ مالی خسارے کے باعث رعیت بند کرنا پڑا یہ غالباً ۱۹۱۹ء ۱۹۲۰ء کی بات ہے اور پھر غالباً ۱۹۲۴ء میں "ریاست" نکلا اور کس شان سے نکلا کہ چند ہی دنوں میں ملک کے طول و عرض میں اس کا طوطی بولنے لگا "ریاست" اور اس کے اداریوں نے سارے ہندوستان میں ایک ہنگامہ سا برپا کردیا تھا ایک زمانے میں بڑے سائز کے گلابی آرٹ پیپر کا ٹائیٹل اندر ولائتی آرٹ پیپر پر تصاویر اور سفید سپر کلینڈر پر ریاست چھپتا تھا اور قیمت صرف ایک آنہ اور بعد میں دو آنہ ہوگئی تھی۔

سردار صاحب کے بارے میں جوش صاحب نے یادوں کی بارات میں جو کچھ لکھا ہے اس میں ایسے چند نقش ہیں جو ہمارے سامنے دیوان سنگھ کو مجسم لاکر کھڑا کردیتی ہیں "سیر چشم" "کوتاہ قامت" "بلند

حوصلہ" "مہمان نواز" "شیر دل" "دوست پرور" "دشمنِ قاتل" "سلطان شکار" "گدا نواز" "بدترین دشمن اور بہترین دوست...... جب وہ ریاست نکالتے تھے ہز میجسٹی اور ہز ہائی نسوں کے ایوانوں میں زلزلہ آجاتا تھا۔

سردار دیوان سنگھ مفتون کو قدرت نے جی کھول کر نوازا تھا۔ انھیں فنونِ لطیفہ خاص طور پر موسیقی اور وہ بھی کلاسیکی موسیقی سے حد درجہ کا عشق تھا ان کے پسندیدہ فنکاروں میں اُستاد فیاض خاں، بڑے غلام علی خاں اسد علی خاں دیپالی ناگ جوتھیکا رائے کو خاص امتیاز حاصل تھا وہ علی الصبح بیدار ہو جایا کرتے تھے اور فارغ ہو کر قلم سنبھال کر کرسی ادارت پر رونق افروز ہو جاتے "ریاست" کے اوقات کار صبح سات بجے سے شام سات بجے تک ہوا کرتے تھے اس وقت تک سردار جی مضامین لکھ کر تیار کر لیتے تھے ریاست کے بیشتر مضامین وہ خود لکھتے تھے ناقابلِ فراموش جذبات مشرق اداریہ تو کسی دوسرے سے لکھوانے کا سوال ہی نہ تھا ان تینوں کی کاپیاں اور پروف بھی خود دیکھتے تھے صحتِ زبان کا خاص خیال رہتا تھا سردار جی کا حافظہ بلا کا تھا انھیں عبدالرحیم خاں خاناں، کبیر اور تلسی کے بے شمار دوہے حفظ تھے جن کا ترجمہ وہ جذبات مشرق کے عنوان کے تحت ہر ہفتے تحریر کرتے تھے "جذبات مشرق" کتابی صورت میں اُردو میں اور ترویٹی "کے نام سے ہندی میں بھی شائع ہو چکی ہے۔

"ریاست" نے والیانِ ریاست کی نیندیں حرام کر دی تھیں ان کی قلم کی کاری ضرب سے فرماں روا کانپتے تھے ریاست سے دیوان سنگھ نے بہت کمایا لیکن اپنے پاس کبھی کچھ نہیں رکھا کھایا، پیا اور کھلایا پلایا ختم کیا اس لیے ان پر تونگری اور مفلسی کے دورے پڑتے تھے لیکن مفلسی میں بھی جب کوئی ان کے گھر آتا اور یہ روزانہ کا معمول تھا کہ دو چار احباب ان کے ہاں ہر شام جمع ہوتے تھے اور سردار جی کے چپراسی ان کو دیکھتے ہی سردار صاحب کے دوستوں اور پڑوسیوں سے پیسے اُدھار لینے روانہ ہو جاتے تھے جو دوسرے ہی دن دوپہر کے ایک ڈیڑھ بجے ادا ہو جاتے تھے کیونکہ اسی وقت ڈاکیہ منی آرڈر یا وی پی پی کی رقم لایا کرتا تھا شام تک اُن کے پاس باقی کچھ نہ رہتا تھا۔

سردار جی کو اونچے سے اونچے آدمی کے گریباں پر ہاتھ ڈالنے میں مزا آتا تھا اور یہ واقعات وہ نہایت چٹخارے اور زور دار قہقہوں کے درمیان دہرایا کرتے تھے برسوں ان کی مقدمہ بازی

نواب بھوپال اور مہاراجہ پٹیالہ جیسے والیان ریاست سے جاری رہی مگر سردارجی ایک دن کے لیے بھی ہراساں نہ ہوئے۔ان پر لاتعداد مقدمے قائم کیے گئے جن میں سے اکثر میں انہیں باعزت بری کیا گیا۔

سردارجی نے زندگی بھر کوئی جایئداد نہیں بنائی اُن کا نیک نام ہی اُن کی جایئداد تھا ان کی زندگی کے بے شمار واقعات ناقابلِ فراموش کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں جن سے ان کے کیرکٹر کی بلندی اور عظمت کے نشان ملتے ہیں ۱۹۴۶ء ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد جو نفرت اور دشمنی کا ماحول پیدا کیا گیا اور انسان انسان کے خون کا پیاسا بن گیا اس وقت بھی سردار دیوان سنگھ قومی یک جہتی اتحاد اور قوم پرستی اور وطن سے محبت کے نشے میں سرشار ہے اور ان کا قدم اِس راستہ پر چلتے ہوئے ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں ڈگمگایا چنانچہ اُسی نازک دور میں اپنے اخبار ریاست کے شائع ہونے والے مختلف شماروں میں ۱۹۴۷ء کے واقعات کا وہ اپنی فطری بے باکی کے ساتھ اس طرح ذکر کرتے ہیں یہ اور دوسرے مضامین بعد میں کتاب ناقابلِ فراموش کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"فسادات کا کیریکٹر پر اثر"

فسادات کے دنوں کے کچھ حالات ایڈیٹر "ریاست" نے لکھے ہیں جو اس کے چشم دید تھے ذیل میں کچھ مزید حالات لکھے جاتے تھے ہیں جو دلچسپ ہیں اور جن کا ایڈیٹر "ریاست" کو ذاتی علم ہے (انور صاحب ایڈیٹر رسالہ بانو جن کے مکان میں میں رہتا تھا خیالات کے اعتبار سے کانگریسی ہیں اور کانگریسی بھی بہت سخت قسم کے یہ کانگریس کی تحریکوں میں حصہ بھی لیتے رہے تھے اور کانگریس کے ورکر ان سے واقف تھے ان کو یہ یقین تھا کہ فسادات چاہے کتنا زور پکڑ جائیں ان کے کانگریسی ہونے کے باعث ان کو کوئی کچھ نہ کہے گا چنانچہ یہ فسادات کے دنوں میں ہر جگہ چلے جاتے ایک روز یہ چاندنی چوک سے نئی سڑک آ رہے تھے تو راستہ میں ہندوؤں کا ایک گروہ جو اُس زمانہ میں مسلمانوں پر حملے کرنے کے لیے جمع ہو رہا تھا ان پر ٹوٹ پڑا اور اس نے ان کو پیٹنا شروع کر دیا انور صاحب نیم بے ہوشی کی حالت میں تھے اور ابھی ان پر کسی مہلک ہتھیار سے حملہ نہ ہوا تھا کہ اس گروہ میں سے ایک کانگریسی نے ان کو پہچان لیا۔ اور اپنے ہمراہیوں کو پکار کر کہا کہ یہ تو کانگریسی ہے اور مسلم لیگ کا مخالف ہے اس کو چھوڑ دو چنانچہ حملہ کرنے والوں نے جب یہ سنا تو انھوں نے انور صاحب کو چھوڑ دیا اور دِتیں

کانگریسی ان کو سہارا دے کر ان کے گھر پہنچا گئے انور صاحب جب گھر پہونچے تو نیم بیہوشی کی حالت میں تھے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور ان کو اپنے پوشیدہ مقامات کو کپڑے سے چھپانے کا بھی احساس نہ تھا ان کے پہونچنے پر ان کے گھر میں کہرام مچ گیا کچھ دیر کے بعد ان کے حواس درست ہوئے تو ان کی حالت کو دیکھ کر ایک صاحب نے کہا یہ کانگریسی ہونے کے باعث پٹے۔ چونکہ بے خوف ہو کر شہر میں پھرتے تھے میں نے کہا یہ تو ٹھیک ہے مگر کانگریسی ہونے کے باعث ہی یہ بچ بھی گئے اگر کانگریسی نہ ہوتے اور ان کو مجمع میں کانگریسی پہچان نہ لیتے تو یہ اسی وقت ختم کر دیئے جاتے۔

۲۔ فسادات ابھی ختم نہ ہوئے تھے مگر ان کی شدت میں کمی آچکی تھی کہ ایک روز چند ہندو کانگریسیوں کے ساتھ انور صاحب اپنے نئے مکان سے (جہاں وہ فسادات کے باعث چلے گئے تھے) ایڈیٹر "ریاست" سے ملنے کے لیے "ریاست" میں آئے یہ مل کر واپس جا رہے تھے تو ان کو جاتے ہوئے راستہ میں ایک کانگریسی نے دیکھا جو سپیشل مجسٹریٹ بھی مقرر ہو چکا تھا۔ چنانچہ اگلے روز ان سپیشل مجسٹریٹ نے (جو فسادات میں امن قائم کرنے کے لیے بنائے گئے تھے) ان کانگریسیوں سے جو انور صاحب کو ملانے کے لیے دفتر "ریاست" میں لائے اور واپس لے گئے تھے کہا۔

تم کہاں کے ہندو ہو جو ایک مسلمان کو نہ صرف ختم کیا بلکہ اس کو حفاظت میں لے گئے اس پر ان کانگریسیوں نے کہا کہ وہ تو کانگریسی تھا اس کے جواب میں اس اسپیشل مجسٹریٹ نے فرمایا چاہے کانگریسی تھا مگر تھا تو مسلمان: فسادات ختم ہو گئے تو اس کا علم ایڈیٹر "ریاست" کو ہو گیا چنانچہ آپ دفتر ریاست میں تشریف لائے اور اپنی کرتوت پر اظہار ندامت کیا اور معافی چاہی۔ ایڈیٹر ریاست ان سے کیا کہتا اپنے دل میں ہی کہا جب دنیا نے ہی قتل اور لوٹ مار کرنا پاپ اور گناہ نہ سمجھا اسے ثواب سمجھ لیا گیا تو اس بچارے کانگریسی سپیشل مجسٹریٹ کا کیا قصور ہے"

یہ اتفاق کی بات ہے کہ سردار جی کی ازدواجی زندگی ناکام ثابت ہوئی انھیں اپنی والدہ سے بے انتہا محبت تھی اور یہی اندھی محبت ساس بہو کے جھگڑے کی بنیاد بنی اس اندھی محبت نے ماں کا ساتھ دیا اور عین جوانی میں دیوان سنگھ اپنے بچوں کی ماں سے ایسے خفا ہوئے کہ مرتے دم تک اس کی شکل نہ دیکھی اور یہ زمانہ کم از کم چالیس سال پر احاطہ کرتا ہے۔

سردار دیوان سنگھ مفتون نہایت کامیاب صحافی اور کامیاب انسان تھے. مگر پھر بھی وہ اپنی اِس تمنا کو پورا نہ کر سکے ان کا قول تھا کہ کامیاب انسان وہ ہے کہ جب وہ مرے تو چند لاکھ روپیہ نقد چھوڑے اور اس کے جنازے کے ساتھ چند ہزار آدمی موجود ہوں ۔

۲۶ جنوری ۱۹۷۵ء کو علی الصبح جب انھوں نے آخری سانس لیا تو چند لاکھ تو کیا چند روپے بھی ان کی جیب میں یا بنک میں نہ تھے اور محض گنتی کے آدمی ان کی جدائی پر آنسو بہانے والے موجود تھے دوستوں میں میر مشتاق احمد اور شاگردوں میں ممتاز مرزا کے علاوہ دوسرا کوئی نہ تھا ۔

ڈاکٹر اسلم پرویز

استاد رسا دہلوی

ہماری اسی زمین پر انسانی بستیوں سے بہت دور ایسے مقامات بھی ہیں جہاں اب تک کوئی بھولا بسرا شخص بھی نہیں پہنچ پایا ہے۔ ان نامعلوم مقامات میں بہت سی خوب صورت وادیاں، آبشار، جھیلیں، چشمے، پھل پھول اور پودے ایسے ہوں گے جو فطرت کی صناعی کا بہترین نمونہ ہوں گے یہ حسین اور خوشنما منظر قرنوں کی دھوپ چھاؤں میں مٹتے اور بنتے رہتے ہوں گے۔ نہ جانے ایسے کتنے ہی منظر بن بن کر مٹ چکے ہوں گے لیکن ہمیں ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم اس لیے کہ یہ منظر اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے باوجود اس بات سے محروم رہے کہ کوئی ان کی تاریخ مرتب کر کے انہیں ہمیشہ کے لیے اس کے اوراق میں محفوظ کر دیتا۔ ہم لوگ جس چیز کو دلّی کی تہذیب کہتے ہیں اور جس پر بجا طور پر فخر بھی کرتے ہیں اس کی مثال بھی اُن نامعلوم حسین منظروں کی سی ہے جو بنتے اور مٹتے جا رہے ہیں اور بس۔ جب یہ منظر نہیں رہتے تو ہم یہ تک بھول جاتے ہیں کہ یہ منظر کبھی تھے بھی یا نہیں۔ اُستاد رسا دہلوی بھی ایسا ہی ایک منظر تھے جنھیں آج محض چند لوگ جانتے ہیں اور کل وہ بھی نہیں ہوں گے۔ جو لوگ استاد رسا کے بارے میں کچھ جانتے بھی ہیں ان کی مثال بھی کسی جان فزا منظر پر سے گزرنے والی اس ہوا کی سی ہے جو منظر کی خوشبو میں تو ضرور بسی ہوئی ہوتی ہے لیکن منظر کے عکس و آثار کا پتا نہیں دیتی۔ اُستاد رسا کے بارے میں ہماری معلومات بھی اس خوشبو

جیسی ہی ہیں۔ چھریرا بدن نکلتا ہوا قد، سانولا رنگ، سر پر پوری طرح منڈھی ہوئی ململ کی ٹوپی۔ پیشانی پر عین وسط میں ٹوپی کے کنارے کو چھوتا ہوا دکی ہوئی رات جیسا نماز کا گٹا، ستواں ناک، ہر وقت پان کھاتے رہنے کی وجہ سے لب اور دہن گلنار، سامنے کے دانت پان کی زیادتی سے قدرے سیاہی مائل، باشرع مسلمانوں کی طرح ترشی ہوئی لبیں، کھچڑی ڈاڑھی مگر ایسی کھچڑی جس میں چاول کی مقدار کچھ زیادہ ہو۔ ڈاڑھی کے بیچوں بیچ پان کی پیک کی سرخ لکیر، چہرہ، لمبوترا جو سوا مٹھی ڈاڑھی سے کچھ اور لمبوترا دکھائی دیتا تھا، کالی واسکٹ اس کے نیچے معمولی سے سوتی کپڑے کی قمیض، گردن میں لٹکا ہوا بڑا سا رومال یا چادر جس کے دونوں سرے سامنے کی جانب دائیں اور بائیں طرف لٹکے ہوئے، ذرا چوڑی موری کا گاڑھے یا گزی کا اٹنگا پاجامہ ایک بغل میں کاغذوں کا پلندہ اور دوسرے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چھڑی یہ تھے، اُستاد رسا دہلوی ــــ

اُستاد رسا کے والد کون تھے اور کیا کرتے تھے یہ بات آج کوئی نہیں جانتا ان کے والد کا نام کیا تھا یہ بھی کسی کو نہیں معلوم لیکن یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ اُستاد رسا کے والد سیّد تھے اور والدہ بھی سیدانی تھیں۔ یہ بات ہم پورے وثوق سے اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ خود اُستاد رسا کی زبانی ان کی زندگی کے جو چند حقائق ہم تک پہنچے ہیں ان میں ایک ان کا سیّد ہونا بھی تھا۔ وہ اپنے سید ہونے پر بڑا فخر کرتے تھے اور گفت گو کے دوران ان کے منہ سے نکلنے والا ہر پانچواں فقرہ کسی نہ کسی اعتبار سے ان کے سید ہونے سے متعلق ہوتا تھا۔ وہ حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کے عقیدت مند تھے۔ اس لیے ایک طرف ان کے زندگی گزارنے کے انداز میں اگر سیدوں کی سی آن بان تھی تو دوسری طرف ان کے مزاج میں ایک صوفیانہ استغنا بھی تھا۔ چنانچہ سید رفیق احمد رسا دہلوی کو بعض لوگ صوفی سید رفیق احمد رسا دہلوی بھی کہتے تھے۔

دلّی والوں میں دلّی اور اس کی ہر شے سے محبّت تعصب اور دیوانگی کی حد تک پائی جاتی ہے ۱۹۴۷ء میں جب دِلّی ایک بار پھر اجڑی تو بچے کھچے دلّی والوں میں دہلویت کا یہ جذبہ اور شدت اختیار کر گیا۔ اُستاد رسا ان لوگوں میں تھے جن کے نزدیک دلّی صرف شاہجہاں آباد کا نام تھا شاہجہاں آباد آج کی ٹاؤن پلاننگ کی اصطلاح میں Walled City کہلاتا ہے۔

استاد رسا صرف اندرون فصیل کے رہنے والوں کو دلّی والا مانتے تھے اور انھی کی زبان کو مستند

سمجھتے تھے۔ باڑہ ہندوراؤ صدر بازار قرول باغ، پہاڑ گنج اور شاہدرہ کو وہ Foreign Country کہا کرتے تھے شعر و سخن کے میدان میں، ۱۹۴۷ء سے پہلے دلی میں داغ اسکول کا طوطی بولتا تھا۔ اُستاد رسا جانشین داغ سید وحید الدین بیخود دہلوی کے شاگرد تھے۔ سائل دہلوی اور علامہ زار دہلوی کے مقابلے میں استاد رسا نے شاید بیخود دہلوی کی شاگردی اسی لیے قبول کی کہ بیخود صاحب اُستاد رسا کی طرح سیّد تھے۔ ویسے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بیخود صاحب کے ساتھ استاد رسا کی دور پرے کی رشتے داری بھی تھی۔

استاد رسا کا مکان دلی میں حوض سوئیوالان میں تھا لیکن وہ سب سے کم محلہ سوئیوالان میں ہی دکھائی دیتے تھے۔ رات گئے گھر لوٹنا اور صبح سویرے پھر نکل کھڑے ہونا اُستاد نے لڑکپن میں اردو فارسی اور اس کے ساتھ کچھ دینیات اور کچھ طب کی تعلیم بھی حاصل کی تھی انہیں فٹ بال کھیلنے کا شوق تھا اور وہ دلی کی مغل کلب میں کھیلتے تھے حاجی ہوٹل کے مالک حافظ ظہور الدین صاحب کے چھوٹے بھائی امین الدین ان کے بچپن کے دوستوں اور فٹ بال کے ساتھیوں میں تھے۔ اُستاد نے اس زمانے میں فٹ بال کھیلی ہے جبکہ ہندوستانی ننگے پیر اور ان کے مقابلے میں گورے بوٹ پہن کر فٹ بال کھیلتے تھے۔ انھوں نے کچھ دن امپیریل تمباکو کمپنی میں اسٹور کیپر کی حیثیت سے کام کیا تھا لیکن مزاج میں ٹھہراؤ نہیں تھا اس لیے جلد ہی نوکری چھوڑ چھاڑ الگ ہوئے اور پھر بقیہ زندگی آزادہ روی کے ساتھ گزاری۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اُستاد رسا نے شادی نہیں کی اور کچھ کا کہنا ہے کہ انھوں نے شادی کی تھی لیکن جلد ہی ان کی بیوی کا انتقال ہوگیا اور پھر انھوں نے دوسری شادی نہیں کی تمام زندگی اپنی والدہ اور دوسرے عزیزوں کی خدمت میں گزار دی استاد رسا کی والدہ خود استاد کی وفات سے چار پانچ سال پہلے تک حیات رہیں آخر میں استاد کی زندگی کا واحد مقصد والدہ کی خدمت کرنا تھا یہاں تک کہ آخری دنوں میں جب وہ بے انتہا ضعیف ہوگئی تھیں تو اُستاد ان کی نجاست تک اٹھایا کرتے تھے۔ اس معاملے میں انھوں نے اپنی والدہ کی اتنی دعائیں لی ہیں کہ ان دعاؤں کا شمار صرف کراماً کاتبین کے پاس ہی ہوسکتا ہے۔ اُستاد کے ایک بھائی کا انتقال بھی بہت شروع میں ہوگیا تھا بھائی کی بیوی اور بچوں کی دیکھ بھال بھی انھوں

نے ہی کی۔ استاد رسا کی اپنی ضروریات انتہائی محدود تھیں اور ان کے وسائل اس سے بھی زیادہ محدود لیکن ان کا دل بہت بڑا تھا وہ کبھی کسی کو مصیبت اور پریشانی میں نہیں دیکھ سکتے تھے جو بھی ان سے بن پڑتا اس کے لیے کرتے تھے۔

۱۹۴۷ء کے بعد جب ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں نے کاس موپولٹین انداز اختیار کرنا شروع کیا تو دلی بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکی۔ دلی میں روزگار کی تلاش کے سلسلے میں چاروں طرف سے یلغار شروع ہوگئی۔ شاہجہاں آباد کا علاقہ جسے پرانی دلی بھی کہتے ہیں ایک غریب پرور علاقہ تھا اس لیے اس علاقے میں آکر بسنے والے لوگ زیادہ تر وہ تھے جو عام طور پر ناخواندہ تھے اور چھوٹے موٹے روزگار کی تلاش میں دلی میں آکر بس رہے تھے اور اس کی بھیڑ میں اضافہ کر رہے تھے۔ چتلی قبر اور مٹیا محل کے بازار میں اب چلتے ہوئے کھوے سے کھوا چھلنے لگا تھا۔ سائیکل رکشا کا اگلا پہیا کبھی آگے سے اور کبھی پیچھے سے ان راہ گیروں کی ٹانگوں کے بیچ میں الجھنا شروع ہوگیا تھا جو ان بازاروں کو اب تک اپنے گھر کی انگنائی سمجھتے تھے۔ جامع مسجد کے آس پاس کے ہوٹلوں میں گھنٹوں فرصت سے بیٹھنے کا سلسلہ تو اب بھی جاری تھا لیکن بھانت بھانت کے گاہکوں کی یورش نے ہوٹلوں میں مستقل ڈیرہ جمائے رکھنے والوں کی صحبتوں کو مکدر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس سے ہوٹلوں کے مالکوں کے اخلاق پر بھی برا اثر پڑنا شروع ہوا اور وہ سخن فہموں سے زیادہ گاہکوں کی پروا کرنے لگے اور جنھوں نے ایسا نہیں کیا انہیں تبن کی طرح اپنا ہوٹل بیچ باچ بھاگنا پڑگیا۔ اس صورت حال میں استاد رسا کو پہلی بار اندازہ ہوا کہ انگریزوں نے جمنا کا پل بنوا کر کتنی بڑی غلطی کی تھی وہ کہتے تھے کہ اگر یہی حالت رہی تو ایک دن جمنا کا پل تڑوانا پڑے گا اس لیے کہ جسے دیکھو لنگڑا لولا ٹیڑھا ٹپا جمنا پار سے چلا آرہا ہے۔

استاد رسا کی چال اور مزاج دونوں میں بلا کا بانکپن تھا۔ وہ کڑی کمان کے تیر کی طرح چلتے تھے۔ وہ بلا کے شدت پسند تھے۔ ان کے ہاں دوستی اور دشمنی کے درمیان بیچ کا راستہ کوئی نہیں تھا۔ ان کے طرز زندگی پر ان کے اس اسلامی عقیدے کا پرتو تھا جہاں کفر اور ایمان کے درمیان کسی شرک کسی بدعت کی گنجائش نہیں ہوتی۔ مخالفوں کا شجرہ نسب انہیں زبانی یاد رہتا تھا چنانچہ ایک مرتبہ استاد رسا کے ساتھ کچھ چھیڑ چھاڑ کرنے کی اسکیم بن رہی تھی کسی صاحب نے کہا خلیق انجم صاحب

یہ کام آپ کریں لیکن خلیق انجم صاحب نے ہنستے ہوئے یہ کہہ کر معذرت چاہ لی کہ حضرات میرے شجرۂ نسب میں پہلے ہی خرابی ہے میں اسے الم نشرح نہیں کرانا چاہتا۔ آج سے لگ بھگ بیس برس پہلے جب استاد رسا پر ڈاکٹر خلیق انجم کا خاکہ رسالہ ساقی میں چھپ کر منظر عام پر آیا تو یار لوگوں نے استاد کے کان بھرنے شروع کیے کہ استاد خلیق انجم نے پرخچے اڑا کر رکھ دیے۔ لیکن جیسے جیسے اس خاکے کی شہرت ہوتی گئی استاد کی خوشی میں اضافہ ہوتا گیا اب تک خلیق انجم کے ساتھ ان کا سلوک مشفقانہ تھا اس دن کے بعد سے تو وہ ان کے مرید ہو گئے۔ وہ جس سے محبت کرتے تھے پھر ٹوٹ کر ملتے تھے۔

اُستاد میں ریا کاری نام کو بھی نہیں تھی وہ اس مذہبی ریا کاری کے بھی سخت مخالف تھے جس کا ذکر فارسی اور اردو کے شعرائے شیخ اور زاہد کے حوالے سے کیا ہے۔ اُستاد رسا روزے نماز کے پابند تھے لیکن اس طرح کہ انھوں نے اپنی عبادت کو کبھی کسی پر مسلط نہیں کیا۔ وہ محبت، مروت خدمت اور دل جوئی ان تمام چیزوں کو بھی عبادت کا درجہ دیتے تھے۔ چنانچہ عمر کے آخری دنوں میں بعض معذوریوں کی وجہ سے جب وہ روزہ نماز ترک کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے تو اس کی کمی وہ اپنی ان نیکیوں سے ہی پوری کرتے تھے۔ اردو بازار میں رشید آرٹسٹ صاحب کی دوکان پر ان کی مستقل نشست رہا کرتی تھی۔ اس دوکان کی برسوں سے ایک روایت یہ بھی چلی آرہی ہے کہ رمضان کے دنوں میں چھ سات احباب یہاں ایک ساتھ روزہ کھولا کرتے ہیں ان میں استاد رسا بھی شامل ہوتے تھے۔ آخری دنوں میں بیماری کے سبب جب روزے رکھنے سے معذور ہو گئے تو انھوں نے یہ دستور بنا لیا کہ روزے سے کچھ پہلے رشید آرٹسٹ صاحب کی دوکان پر امرود پپیتا یا کوئی اور پھل لے کر پہنچ جاتے۔ رشید آرٹسٹ نے ان سے کئی بار کہا کہ اُستاد آپ یہ کیا تکلف کرتے ہیں۔ خدا کے فضل سے یہاں سب انتظام رہتا ہے لیکن اُستاد نہ مانے آخر ایک دن جب اس بات پر بہت بحث ہوئی تو انھوں نے کہا بھئی اگر میں روزے رکھنے سے محروم ہو گیا ہوں تو کم از کم مجھے روزہ داروں کی خدمت کے ثواب سے تو نہ محروم کرو۔

اُردو بازار میں ایک زمانے میں جگت ٹاکیز سے لے کر جو اب جگت سینما ہو گیا ہے بازار مٹیا محل کے نکڑ تک افضل پشاوری مرحوم کے ہوٹلوں کا ایک پورا سلسلہ تھا۔ اسی سلسلے کا ایک ہوٹل

تھا جو جامع مسجد کے جنوبی دروازے کے سامنے شاندار بیٹری کمپنی کے نیچے واقع تھا ہیں نئے اور خلیق انجم نے بہت سی ادبی شخصیتوں کو پہلی بار اسی ہوٹل میں دیکھا ہے۔ یہیں پر استاد رسا دہلوی کو بھی ہم نے پہلی بار دیکھا۔ ان کے میز پر Face فیس کریم کی دو شیشیاں رکھی تھیں۔ استاد رسا فیس کریم بنا کر بیچا کرتے تھے اسی پر ان کی بسر اوقات تھی۔ یہ فیس کریم کون لوگ خریدتے تھے اور کب خریدتے تھے یہ کوئی نہیں جانتا۔ جب ہم نے استاد رسا کو پہلی بار دیکھا تو وہ کسی صاحب کے ساتھ محو گفتگو تھے اور اپنے مخصوص انداز میں گل افشانی فرما رہے تھے یعنی ان کی گفتگو میں گالیوں کی مقدار نمک میں آٹے کے برابر تھی جوان کی ڈاڑھی کے ساتھ بڑا عجیب لگ رہا تھا لیکن پھر رفتہ رفتہ ہم اس کے عادی ہو گئے یہاں تک کہ بعد میں تو ان کے اس انداز میں ہمیں نہ صرف یہ کہ لطف آنے لگا تھا بلکہ گالیوں پر ان کی مہارت کو دیکھ کر کبھی کبھی ان پر رشک بھی آتا تھا۔ چنانچہ یونیورسٹی کے حلقے میں جب ہم نے اپنے بعض دوستوں سے استاد رسا کا ذکر کیا تو انھوں نے استاد سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ اس سلسلے میں ہم نے ایک دو حضرات کو لا کر انہیں استاد کی گالیاں یعنی گالی آمیز گفتگو سنوائی بھی ہے۔

جامع مسجد کا نقشہ ڈی۔ ڈی۔ اے کے بل ڈوزروں کی یلغار سے پہلے کچھ اس طرح کا تھا کہ مسجد کے چاروں طرف دوکانیں تھیں جنوبی دروازے اور شاہی دروازے کے درمیان کپڑے کی مارکیٹ تھی جسے چوک کہتے تھے اسی چوک کے بیرونی حصے میں فرینڈز ہوٹل نام کا ایک چائے خانہ تھا جو عرف عام میں بھائی ظہیر کا ہوٹل کہلاتا تھا اور ادیب اور شاعر اسے چنڈو خانہ کہتے تھے۔ استاد رسا کو گیس کا مرض تھا اس لیے وہ چھت کے نیچے کم بیٹھتے تھے۔ چنڈو خانے کے باہر آسمان کے نیچے ایک بنچ پر استاد کی نشست رہتی تھی۔ اسی بنچ پر استادی شاگردی کا سلسلہ چلتا تھا جب کوئی شاگرد آتا تو آتے ہی پہلے استاد کو سلام کر کے استاد پر تھوڑی سی لاگت لگاتا۔ یہ لاگت بہت معمولی ہوتی تھی یعنی ایک روپے کا بسکٹ آدھ پاؤ دودھ کی چائے۔ ایک روز استاد چنڈو خانے میں بیٹھے کسی بات پر رام پور والوں پر ناراض ہو رہے تھے اور خاصی بری بھلی سنا رہے تھے ایک صاحب سامنے بیٹھے انتہائی خاموشی سے استاد کی گفتگو سن رہے تھے اچانک استاد کو کچھ خیال آیا اور انھوں نے بیچ میں رک کر ان صاحب سے پوچھا میاں آپ کہاں کے ہیں انھوں نے جواب دیا جی رام پور کا۔ استاد صرف ایک پل کے لیے سکتے میں آئے اور پھر فوراً ہی حاضر جوابی سے کام لیتے ہوئے کہنے لگے میاں

رام پور کا تو نواب حرامی ہے۔ عوام تو وہاں کے بہت شریف ہیں بالکل ہمارے جیسے۔ ایک صاحب جو کسی چھوٹی موٹی درگاہ کے مجاور تھے اپنے استاد کو لے کر چنڈو خانے آئے ان پر لاگت لگائی ایک دو شعر بغرض اصلاح پیش کیے اور کچھ دیر بعد اٹھ کھڑے ہوئے چلتے ہوئے استاد رسا نے انہیں آواز دیکر واپس بلایا اوران کے استاد محترم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ابے یہ لوگ تو ریاستوں کی ریاستیں چٹ کر گئے تیرا باپ تو دو ٹوٹی پھوٹی قبریں چھوڑ کر مرا ہے تو کن چکروں میں پڑا۔ استاد کے پاس اکثر ایسے شاگرد بھی پھنس جایا کرتے تھے جنہیں استاد کو پورے پورے شعر کہہ کر دینے پڑتے تھے۔ اُستاد کے ایسے ہی ایک شاگرد ایک مشاعرے میں کاغذ ہاتھ میں لیے اپنی غزل پڑھ رہے تھے استاد شاگرد کی پشت پر پناہی کے لیے موجود تھے۔ شاگرد نے ایک مصرع یوں اُٹھایا اللہ رے تیری چتوں اُستاد نے بیچ میں ہی ٹوکا اور کہا دیکھ کر پڑھو بیٹا۔ شاگرد نے کاغذ کو دیکھ بھال کے پھر مصرع شروع کیا اور پھر وہی اللہ رے تیری چتوں استاد نے اور زیادہ پیار سے اور حوصلہ بڑھاتے ہوئے وہی بات کہی بیٹا دیکھ کے پڑھو۔ شاگرد کچھ دیر کے لیے رکا پہلے اس نے پورا شعر زیر لب دہرایا اور پھر ایک بار وہی اللہ رے تیری چتوں۔ اب کے اُستاد رسا نے شاگرد کی کمر پر زور سے ایک دھپ جمایا اور ماں کی گالی دیتے ہوئے کہا چتوں نہیں پڑھ سکتا۔ اُستاد رسا کے شاگردوں کو اکثر دوسرے لوگ لے اڑا کرتے تھے جس سے وہ برگشتہ ہو جاتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اُستاد جس رنگ کے شعر کہتے تھے وہ ان پر تو کھپ جاتے تھے لیکن ان کے شاگردوں کا کام ایسے شعروں سے نہیں چلتا تھا۔ مشاعروں کی منڈی میں جس طرح کے نئے مال کی مانگ تھی وہ اُستاد کے پاس نہیں تھا۔

اُستاد رسا پکے نیشنلسٹ تھے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے بھی مسلم لیگیوں سے ان کی بڑی نوک جھونک ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی زبوں حالی کے باوجود ہندوستان کیا دلی چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ ان کے بھتیجا بھتیجی جنہیں انھوں نے پال پوس کر بڑا کیا تھا پاکستان میں خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے انھوں نے لاکھ چاہا کہ اُستاد اپنے آخری دن پاکستان آکر آرام سے گزاریں لیکن دلی کو خیر باد کہنا انہیں ایک آن پسند نہ تھا۔

اُستاد رسا دہلوی کو اپنے استادِ محترم بیخود دہلوی سے بے پناہ عقیدت اور محبت تھی۔

تھی۔ چنانچہ ان کی زندگی کا ایک واحد مشغلہ بیخود دہلوی کی یاد میں ایک سالانہ مشاعرہ کرنا تھا اس مشاعرے کے لیے انھوں نے ایک بے خود اکیڈمی قائم کی تھی جو ان کی ذات اور اس کاغذ کے پلندے تک محدود تھی جو ہر وقت ان کی بغل میں رہتا تھا۔ استاد رسا۔ یوم بیخود کا مشاعرہ ابتدا میں بہت چھوٹے پیمانے پر کیا تھا لیکن اپنی لگاتار کوششوں سے انھوں نے اس مشاعرے کو عروج پر پہنچا دیا وہ تن تنہا سال بھر اس مشاعرے کی تیاریوں میں لگے رہتے تھے مشاعرے سے تین چار مہینے پہلے اس کے پوسٹر آنے شروع ہو جاتے تھے پھر جامع مسجد کے چوک پر جھنڈیاں لگتیں رنگ برنگے قمقمے جلتے کلام پڑھنے والے شعرا کے لیے انعام میں دینے کو میڈل اور کپ بھی ہوتے تھے۔ یہ مشاعرہ خالص عوامی مشاعرہ تھا اس لیے کہ اس کے لیے استاد بڑے آدمیوں کے پاس نہیں جاتے تھے بلکہ عام لوگوں سے گھر گھر جا کر دس پانچ پانچ روپے جمع کرتے اور اس سے یہ مشاعرہ بڑے شاندار طریقے سے منعقد ہوتا تھا۔ افسوس کہ بعض نوجوانوں کی بے جا شوخیوں نے اس مشاعرے کو رفتہ رفتہ ناکام کر کے ختم ہی کر دیا اور اسی کا صدمہ خود استاد رسا کو بھی کھا گیا۔ سچ پوچھیے تو اس کے بعد سے دلی میں عوامی مشاعروں کی روایت ہی ختم ہو گئی۔

استاد رسا شعر گوئی کے معاملے میں داغ اور بیخود کی روایات کے امین تھے۔ وہ پورے در و بست کے ساتھ شعر کہا کرتے تھے ان کے اشعار کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ انھوں نے کافی مشق کی ہے لیکن اس کے حساب سے ان کا دستیاب شدہ کلام نہ ہونے کے برابر ہے۔ استاد مشاعرے میں اکڑوں بیٹھ کر شعر پڑھتے تھے اور مصرعے کے ساتھ خود بھی گھٹنوں کے بل اٹھتے جاتے تھے شعر کے نقطۂ عروج پر پہنچتے پہنچتے وہ کافی جوش میں آجاتے تھے اور ٹانگوں کو ہاتھوں سے پیٹ پیٹ کر شعر سناتے تھے۔ داغ کی زبان اور محاورے کا چٹخارہ ان کے اشعار میں خوب ہوتا تھا۔ انھوں نے نہ اپنے کلام کو محفوظ رکھا اور نہ کہیں شائع کرایا۔ آج صرف ان کی ایک دو غزلیں اور چار چھ قطعات ہی ہمارے سامنے ہیں اور وہ بھی کہیں تحریری شکل میں نہیں ہیں بلکہ ان کے قدر دانوں کو زبانی یاد ہیں۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ کرتے چلیے:

کیوں ہوئے خانہ نشیں یہ کیا کیا تم نے غضب
گھر سے نکلو گرمیٔ بازار آدھی رہ گئی

طور پہ موسیٰ نے دیکھی ایک جھلک تو کیا ہوا
آدھی نکلی حسرت دیدار آدھی رہ گئی

وار کیا مجھ پہ کیا دو ہو گئے تلوار کے
دست قاتل میں رسا تلوار آدھی رہ گئی

ہاتھ ٹوٹیں میں نے جو چھیڑی ہوں زلفیں آپ کی
آپ کے سر کی قسم دست صبا تھا میں نہ تھا

عمر کے آخری دنوں میں اُستاد رسا دن کو حاجی ہوٹل میں رہتے تھے اور رات شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کے مزار پر بسر ہوتی۔ آخری دنوں میں انہیں کینسر جیسے موذی مرض نے گھیر لیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ صبر اور قناعت کے ساتھ زندگی کے دن کاٹتے رہے ان کی خودداری نے یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ کسی سے کسی طرح کی امداد لیں۔ صرف ایک درخواست دینے کی دیر تھی انہیں حکومت سے بھی امداد مل سکتی تھی لیکن انھوں نے یہ بھی گوارا نہیں کیا۔ میر مشتاق صاحب نے ہسپتال میں ان کے داخلے کا انتظام کرا دیا تھا لیکن وہ صرف اس لیے ہسپتال میں داخل نہیں ہوئے کہ وہاں طہارت اور پاکیزگی کا کوئی تصور نہیں ہے وہ اپنے مرض پر اپنے علم طب کی ہی آزمائش کرتے رہے۔ ان حالات میں دوسروں کے دکھ درد کو پوری طرح سمجھتے تھے حاجی میاں نے انہیں ایک کمبل دیا تھا تو اسے ایک روز شیخ کلیم اللہ کے مزار پر ایک عورت کو جا کے اوڑھا دیا جو اپنے اپنے بچوں کے ساتھ سردی میں سکڑی پڑی تھی۔ انتقال سے چند روز پہلے آواز بند ہو گئی تھی چل پھر بھی نہیں سکتے تھے بیٹھ بیٹھ کر چلتے تھے اس عالم میں حاجی میاں سے ان کی آخری بات چیت کاغذ پر لکھ کر ہوئی ان کی یہ آخری تحریر حاجی میاں کے پاس موجود ہے۔ حاجی میاں نے کہا کہ موسم کا تقاضا ہے کہ آج آپ رات ہوٹل پر ہی بسر کر لیں۔ انھوں نے فرمایا میں اپنی وضع ترک نہ کروں گا۔ استاد رسا نے حاجی میاں کو یہ بھی لکھ دیا کہ اب یہ مجھ سے گوارا نہیں ہوتا کہ میں آپ کے پانچ روپے کی چارپائی کا نقصان کروں یہ تجارت ہے۔ غرض اسی عالم میں آٹھ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو

بعد نماز جمعہ ان کا انتقال ہوگیا مغرب کی نماز کے بعد حاجی ہوٹل سے ان کا جنازہ اٹھا جامع مسجد کے پارک میں مولانا یوسف صاحب نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور دہلی گیٹ کے باہر نئے قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ان کا جنازہ قبرستان پہنچا تو قبرستان کے باہر ایک ایسی میت رکھی تھی جس کی نمازِ جنازہ پڑھانے والا کوئی نہیں تھا۔ چنانچہ جو لوگ اُستاد رسا دہلوی مرحوم کے جنازے کے ساتھ قبرستان گئے تھے انھوں نے ہی اس میت کی نماز جنازہ بھی ادا کی۔

استاد رسا کے انتقال کے بعد ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے عقیل ناروی صاحب نے سالانہ مشاعروں کا سلسلہ شروع کیا استاد رسا کی یاد میں ہونے والا پہلا مشاعرہ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو منعقد ہوا جس کی صدارت اس وقت کے وزیر تعمیرات جناب سکندر ربخت نے فرمائی دوسرا مشاعرہ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں ہوا جس کی صدارت خلیق انجم صاحب نے فرمائی۔ ۱۹۷۸ء کے بعد سے اب سات سال بعد پھر آج یہاں استاد رسا دہلوی کا ذکر خیر ہوا ہے

ڈاکٹر شمیم نکہت

رضیہ سجاد ظہیر

اس شام میں نے اپنے کو بے حد ملامت کی تھی۔ جب نور کے ڈانس کا ایک شو دیکھنے کے لیے ہم لوگ ٹاؤن ہال گئے تھے ـــــ اور سیڑھیوں پر رضیہ آپا کو چڑھتے دیکھا تھا ـــــ
ہال کے اندر معلوم ہوا تھا کہ نور اور رضیہ آپا ابھی تک نہیں آئی ہیں۔ اور یہ سنتے ہی ہم باہر آکر سیڑھیوں پر ہی انتظار کرنے لگے تھے..... یا اللہ........ یہ ہماری رضیہ آپا تھیں ـــــ درد کی ایک لہر سینہ میں رینگ گئی تھی ـــــ اور تب یہ احساس ہوا تھا کہ کافی عرصے کے بعد ہم نے ان کو دیکھا تھا ـــــ
وہ بہت آہستہ آہستہ سیڑھی پر سنبھل کر قدم رکھ رہی تھیں۔ اور کوئی صاحب ان کو سہارا دے رہے تھے۔ میں نے بڑھ کر ان کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا تھا۔ اور ان کے ہونٹوں سے وہی تازہ پھول بکھر گئے تھے ـــــ تم نے اچھا کیا آگئیں۔ شارب بھی آئے ہیں ـــ؟ ان کے لہجہ میں کوئی شکوہ نہیں تھا ـــــ کوئی طنز نہیں تھا ـــــ اور میرے آنسو چھلک آئے تھے۔ میں نے ان کے دونوں ہاتھ بے خودی میں چوم لیے تھے اور انھوں نے مجھے گلے سے لگا لیا بالکل پہلے کی طرح ـــــ
بنے بھائی کو بہت سے لوگ جب سفید چادر میں لپیٹ کر لئے جا رہے تھے۔ تو انھوں نے

ہاتھ بڑھا کر انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بڑے تحمل سے کہا تھا ـــــ " مجھے بھی جلدی اپنے پاس بلا لینا۔"

اور پھر قدم قدم اُس طرف بڑھنا شروع کر دیا تھا۔ شاید وہ بہت تنہا رہ گئیں تھیں ـــــ شو والی شام۔ اسی خوف سے ہی آنسو نکل آئے تھے۔ اور اپنے کو ملامتیں بھی کی تھیں ـــــ وہ اعتماد کا جیتا جاگتا پیکر۔ زندگی سے بھرپور۔ کالج کی روحِ رواں ـــــ اونچی آواز میں قہقہے لگانے والی سگرٹ کا دھواں اڑاتی ہوئی کالج والی رضیہ آپا ـــــ جن کی قربت غموں کا گلا گھونٹ دیتی ـــــ اور ہر کوئی ـــــ چاہے امیر ہو۔ چاہے غریب ہو۔ جوان ہو یا بوڑھا۔ ان کی محبت بھری آواز کا مسحور ہو جاتا ـــــ

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہائی اسکول میں غزلوں کے ہر شعر کا مطلب خدا کے تعلق سے سمجھ سمجھ کر بیزار ہو چکنے کے بعد جب انٹر فرسٹ ایر میں رضیہ آپا نے شعر کے حقیقی اور مجازی معنی بتاتے ہوئے اِس شعر کا مطلب سمجھایا ـــــ

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر سے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہو کہ ہاں کیوں ہو

تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ گئی کہ طالبات میں وہ اس قدر مقبول کیوں ہیں ـــــ اِس طرح شعر سمجھائے جانے پر ہم سب کو لطف آ گیا ـــــ

حالانکہ وہ خود ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ جہاں اشعار کے مطلب بتانے کا غالباً وہی طریقہ رہا ہوگا ـــــ جس کے تحت بعض اُستاد ہر شعر کو حقیقی جامہ پہنانا ضروری سمجھتے ہیں وہ بھی اشعار جب لڑکیوں کو سمجھائے جا رہے ہوں۔

رضیہ آپا کے والد خان بہادر سید رضا حسین صاحب اجمیر اسلامیہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے ـــــ یہ عہدہ اُس زمانے میں بے حد اہمیت رکھتا تھا ـــــ نانہال بھی کٹر قسم کے پیڈں کا تھا جس کا ذکر ان کی کئی کہانیوں میں بھی ملتا ہے۔ مثلاً

"اللہ دے بندہ لے"۔ "سچ صرف سچ اور سچ کے سوا کچھ نہیں"۔ وغیرہ میں ـــــ ایسے نجیب الطرفین خاندان میں وہ ۱۵ فروری ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئیں۔ اور رضیہ دلشاد کے نام سے

بی۔ اے تک کی تعلیم پرائیوٹ ہی حاصل کی ـــــ جس میں ہمیشہ فرسٹ آئیں۔

وہ گھڑی جس کو عام طور سے لوگ شادی کہتے ہیں۔ رضیہ آپا کے دوبارہ جنم کی گھڑی تھی یعنی ۱۰ ر دسمبر ۱۹۳۸ء ـــــ جب رضیہ دلشاد۔ رضیہ سجاد ظہیر بن گئیں ـــــ اور پھر انھوں نے ایک ایسے سرپھرے انقلابی کے ساتھ کاندھے سے کاندھا جوڑ کر قدم آگے بڑھائے کہ ان کے قدم وقت اور حالات کے سینوں کو روندتے ہوئے سدا آگے بڑھتے رہے ـــــ وقت جو کبھی کبھی بڑا ظالم بھی ثابت ہوا۔ کھسیا کھسیا کر پیچھے بھاگتا رہا اور احساس تک نہ ہوا کہ وہ کب تنہا رہ گئیں۔ اور کب بنّے بھائی (سجاد ظہیر) ہمت و استقلال کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ـــــ محبت کا جیتا جاگتا جسم ـــــ فرشتوں جیسے مسکراہٹ کے ساتھ ـــــ الماآتا میں رہ گیا ـــــ اور اپنے خاموش جسم کو دہلی بھیج دیا ـــــ رضیہ آپا کی ہمت و صبر کا ـــــ آخری بار امتحان لینے کو ـــــ اور امتحان ہو گیا ـــــ رضیہ آپا نے آنسو نہیں بہائے بین نہیں کیے ـــــ وہ سارے غم کے زہر کو خاموشی سے نگل گئیں ـــــ اور پھر وہ زہر آہستہ آہستہ اثر کرتا رہا۔

وہ جو جو کم ہوتی گئیں ـــــ لیکن ان کا قلم کبھی نہیں رکا ـــــ نور ـــــ (ان کی سب سے چھوٹی بیٹی) نے کتنا سچ لکھا ہے۔

اپنے لکھنے سے انھیں عشق تھا ـــــ وہ ان کی زندگی تھی اور یہی وجہ ہے کہ اور چیزوں کے بارے میں وہ لاپرواہ تھیں۔ مثلاً ان کے چشمہ کا نمبر کبھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ ان کی کرسی کی بیت ہمیشہ ٹوٹی رہتی تھی۔ جوتے ہمیشہ پرانے اور مرمت کیے ہوئے ہوتے تھے۔ لیکن اپنے لکھنے کے کام میں کبھی وہ ڈھیل نہیں دیتی تھیں ـــــ کبھی کسی خیال کو لکھ ڈالنے میں سستی نہیں کرتی تھیں یہ کوئی ذمہ داری اٹھا کر نہیں رکھتی تھیں۔ اور ایک خاص وقت پر تختی لے کر بیٹھ جاتی تھیں۔ چاہے ایک سطر لکھتیں یا ایک صفحہ یا ایک افسانہ ـــــ یا ایک ناول۔

انھوں نے بنّے بھائی کی رفاقت میں جو پایا تھا ـــــ اس کا احترام وہ آخری سانس تک کرتی رہیں۔ بلکہ بنّے بھائی کے تمام اعتقادات کو انھوں نے اس طرح اپنایا تھا کہ وہ سب کچھ ان کی اپنی ذات سے جڑ گیا تھا۔

بنّے بھائی کے انتقال کے بعد ایک مضمون میں انھوں نے لکھا ہے۔ جو غالباً انتقال کے فوراً بعد

ہی لکھا گیا ہے۔

"مجھے ان کے خوابوں کی تعبیر کا انتظار ہے۔ اور آخر وقت تک رہے گا ___ پوری اُمید، پورے یقین اور مکمل اعتماد کے ساتھ ___ کہ وہی ہوگا جو انھوں نے خود تصور کئے تھے"

پھر آگے لکھتی ہیں:

"انجمن ترقی پسند مصنفین اب تک ہندوستان میں جو رول ادا کرتی رہی۔ وہ اب اس کو زیادہ شدت ___ زیادہ ذمہ داری اور زیادہ لگن کے ساتھ ادا کرنا ہے تاکہ سب پر ثابت ہو سکے کہ افراد مرتے ہیں ___ ادارے اور زندگیاں قائم رہتی ہیں ___

زندگی قائم رہنے کا یہی ایمان ان کی تابناک شخصیت کی بنیاد تھا ___ کرامت حسین مسلم گرلز کالج لکھنؤ کی وہ کہنے کو تو اُردو کی استاد تھیں ___ لیکن انھوں نے صرف پڑھایا ہی نہیں ___ بلکہ کئی نسلوں کی ذہنی تربیت بھی کی ___

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انھوں نے کبھی پڑھانے اور مطلب سمجھانے کے سلیقے میں کوئی جملہ ایسا استعمال نہیں کیا ___ کہ میں غور کرنے کے باوجود کبھی اس کے یہ معنی نکال سکتی ___ کہ انھوں نے اپنے خیالات اور عقیدے کو سمجھانے یا لادنے کی کوشش کی ہو۔

ان کی زندگی تو خود ایک کتاب تھی ___ کھلی ہوئی کتاب۔ جس کی ہر سطر اچھائی ___ نیکی ___ ہمدردی اور محبت کے چمکیلے حروف سے سجی تھی ___ لیکن ان حروف پر اگر کبھی کسی نے کوئی ضرب لگادی ___ تو اونچے چمکیلے ماتھے پر فوراً بل پڑ جاتے ___ چہرہ سرخ ہو جاتا ___ ہونٹوں کے دونوں گوشے سکڑ جاتے ___ لیکن یہ حالت زیادہ دیر نہ رہتی ___ کبھی کبھی یہ ناگواری الفاظ کا جامہ بھی پہن لیتی ___ لیکن بس وقتی ___ ہاں ان کا اعتماد اگر ایک بار کسی پر سے اُٹھ جاتا ___ تو غالباً وہ جگہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خالی ہو جاتی ___ میں نے خود کئی حضرات کو دیکھا ہے۔ جن سے رضیہ آپا کو سخت تکلیف پہنچی تھی ___ لیکن ___ وہ اتنی وضعدار تھیں ___ اتنی مہذب تھیں ___ کہ ایسے لوگ بھی جب کبھی گھر آجاتے ___ تو بڑے تحمل سے ان کی باتیں سنتیں ___ اور کبھی ناگواری کا اظہار نہ کرتیں ___ سوائے اس کے کہ ان کے چلے جانے کے بعد بڑی اکتاہٹ سے کہتیں ___ لاؤ بونا ایک

سگریٹ اور اٹھا دو ــــ بڑے بور ہو گئے ــــ شائد یہ ان کی سب سے بڑا سزا تھی جو وہ دے سکتی تھیں ــــ

متوسط قد ــــ کھلتا ہوا ہلکہ گورا رنگ ــــ بڑی بڑی کچھ کہتی ہوئی آنکھیں ــــ ستواں ناک ــــ اونچا ماتھا ــــ جس کے بیچوں بیچ دودھ کی نہر جیسی سفید مانگ ــــ دونوں طرف قدرے پھولے ہوئے بال ــــ پونی ٹیل کے انداز میں کسی شوخ رنگ کے ربن سے بندھے ہوئے بال ــــ جو محرم کے علاوہ زیادہ تر سرخ ہی ہوتا تھا۔ ہمیشہ لپ سٹک لگے ہوئے پتلے پتلے نازک ہونٹ ــــ کانوں میں کوئی نہ کوئی زیور ضرور ہوتا ــــ گرمیوں میں اکثر بیلے یا موگرے کے پھول ہوتے ــــ سڈول سا کچھ فربہ بدن جس پر کسی خوب صورت رنگ کی ساری بڑی لاپرواہی سے بندھی ہوئی ــــ ہاتھ میں پرس پیروں میں اگر جاڑے ہوئے تو جوتے اگر گرمی ہوتی تو سینڈل خوشبو دار پھولوں اور ہندوستانی خوشبوؤں کی عاشق پان کھانے کی شوقین ــــ لیکن سگریٹ عادت کے تحت پیتیں ــــ اور کبھی اپنی اس عادت کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتیں ــــ ہاں کلاس میں کبھی سگریٹ نہیں پی ــــ کلاس میں آنے سے پہلے ایک لمبا کش لے کر سگریٹ کو دور پھینک دیتیں۔

صوفیہ فریدہ۔ نیر چشتی۔ فہمیدہ۔ جوہر۔ شمیم ظفر۔ عشرت ظفر۔ زہرہ حسن۔ ہم سب لڑکیاں کھل اٹھتے ــــ اس آس پر کہ رضیہ آپا کلاس آکر مسکراتے ہوئے چاروں طرف نظر دوڑائیں گی ــــ پھر مسکراہٹ ذرا گہری ہوجائے گی اور کل کا وعدہ پورا کرتے ہوئے کہیں گی۔ میں کہانی لائی ہوں۔ پھر اپنے پرس سے مڑے ہوئے کاغذوں کی گڈی نکالیں گی ــــ اور بالکل ایسا ہی ہوتا ــــ وہ کاغذ کی گڈی نکال کر میز پر سنبھالتیں ــــ دونوں کہنیاں میز پر ٹکالیتیں اور اپنے مخصوص انداز میں کہانی پڑھنا شروع کر دیتیں۔ مجھے دوسروں کے بارے میں تو نہیں معلوم ــــ لیکن میں ان کے کرداروں کے ساتھ ساتھ ــــ تمام نشیب و فراز طے کر لیتی ــــ اور نظریں ان کے چہرے سے نہ ہٹتیں ــــ اس طرح آہستہ آہستہ میں ان سے قریب آتی گئی ــــ

ہمارے کالج میں ایک ادبی انجمن تھی "کہکشاں" جس کی بنیاد رضیہ آپا نے ڈالی تھی۔ ہر دوسرے جمعہ کو اس انجمن کا جلسہ کالج کی پہلی منزل کے ایک کمرے میں ہوتا ــــ جس کے

برابر میں ایک طرف ہاسٹل کے کمرے تھے ۔ اور دوسری طرف نماز کا کمرہ ۔۔۔۔ اس جلسہ میں اساتذہ اور طلبا دونوں شریک ہوتے تھے ۔۔۔۔ اساتذہ میں رضیہ آپا کے علاوہ شمیم باجی اور مسز تر پاٹھی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ جلسے میں کبھی کسی کا مضمون پڑھا جاتا ۔۔۔ کبھی کسی کی نظم اور کبھی کوئی کہانی پڑھی جاتی ۔ جلسے کے لیے مصالحہ جمع کرنا بے حد مشکل ہو جاتا ۔۔۔ یہ ذمہ داری سکریٹری کی ہوتی تھی ۔ ہم لوگوں سے زبردستی لکھایا جاتا ۔۔۔ جلسہ کے اختتام پر رضیہ آپا ہمیشہ یہ کہتی ہوئی اٹھتیں ۔۔۔ کچھ اور لڑکیوں کو بھی لکھنا چاہئے ۔۔۔ میں نے بھی اپنے سکریٹری ہونے کے زمانے میں ۔۔۔ پہلے تو مضمون ہی لکھے ۔۔۔ کہ مضمون لکھنا آسان معلوم ہوتا تھا ۔۔۔ کتابیں پڑھیں اور لکھ ڈالا ۔ لیکن رضیہ آپا نے ہمارے اندر سے افسانہ نگار ڈھونڈ نکالا ۔۔۔۔ انھوں نے بار بار کہا ۔۔۔ شمیم تم کہانی لکھ سکتی ہو ۔۔۔ مضمون فلاں لڑکی لکھے گی ۔۔۔ تم کہانی لکھو ۔۔۔ اس طرح کئی لڑکیوں نے قلم پکڑ لیے تھے ۔

وہ ۱۵ فروری تھی ۔۔۔ جب ہمیں کالج میں معلوم ہوا کہ آج رضیہ آپا نہیں آئی ہیں ۔ وہ بیمار ہیں ۔۔۔ یہ ان کی سالگرہ کا دن تھا ۔۔۔ اور میں ان کے لیے گہرے ہرے رنگ کا پار کرے کرائی تھی ۔۔۔ مجھے یہ خبر سن کر دھکہ سا لگا اور کالج کے بعد ہمارا رکشہ فیض آباد روڈ کے بجائے وزیر حسن روڈ کی طرف چل پڑا تھا ۔ گھر سے اجازت نہیں لی تھی ۔ اس لیے دل دھڑک رہا تھا ۔۔۔ لیکن رکشہ والا گھر کا نوکر تھا اور دونوں چھوٹی بہنیں مشرف اور انیس ہمارے ساتھ تھیں دوپہر کا وقت تھا ۔۔۔ وزیر منزل کے بڑے گیٹ سے رکشہ داخل ہوا ۔۔۔ اور پوری عمارت کا چکر کاٹ کر پوچھتے پوچھتے وزیر منزل کے آؤٹ ہاؤس کے پاس تک پہنچ ہی گئے ۔۔۔ صدر دروازے پر دستک دی ۔۔۔ تقی بھائی نے دروازہ کھولا ۔۔۔ کالی عینک لگائے ہوئے تقی بھائی ہم لوگوں کو دیکھتے ہی مڑ گئے ۔۔۔ امی ۔ یہ کچھ لڑکیاں آئی ہیں ۔۔۔ ہم لوگ ان کے پیچھے پیچھے برآمدے میں سے ہوتے ہوئے ۔۔۔ رضیہ آپا کے کمرے میں پہنچ گئے ۔ وہ بہت خوش ہوئیں بڑے پیار سے باتیں کرنے لگیں جیسے منتظر ہی تھیں ۔۔۔ پھر نجمہ سے کہا ۔ ارے یہ لوگ اسکول سے آئی ہیں ۔ کھانا وانا کھلاؤ ان لوگوں کو ۔۔۔ یہ تمہاری شمیم باجی ہیں

اور پھر یہ رشتہ صدا کے لئے قائم ہوگیا ـــــ نہ صرف شمیم باجی سے بلکہ دونوں خاندانوں سے ـــ رضیہ آپا سے ملنے کے بعد ابا اور امی دونوں نے ہی ہم لوگوں کو وہاں آنے جانے کی اجازت دیدی تھی ـــ رضیہ آپا بھی اکثر امی کے پاس آجاتیں ـــ اور سارا دن ہم لوگوں کے ساتھ معہ بچیوں کے گذارتیں اُس زمانے میں وہ ناول "سرشام" لکھ رہی تھیں۔ اکثر اس کے باب بھی سناتی تھیں۔
رضیہ آپا کا گھر محبت کرنے والوں کے لیے محبتوں کا گھوارہ تھا ـ ہر طرح کے لوگ وہاں آتے تھے۔ ہندی اُردو کے شاعر۔ ادیب یونیورسٹی کے طلبا۔ بے روزگار نوجوان ـــ یونیورسٹی کے اساتذہ ـــ اور اخبار نویس وغیرہ ـــ کسی کے کچھ مسائل ہوتے ـــ کوئی محض ملنے آتا ـــ کوئی شعر سناتا ـــ کوئی افسانہ ـــ کوئی ناول کے باب کے باب سنانے آجاتا ـــ رضیہ آپا بڑے اطمینان سے سب کو سہ لیتیں ـــ اور سب ہی تقریباً خوش خوش واپس جاتے
میں یہاں ایک بات بتانا ضروری سمجھتی ہوں ـ کہ ہم لوگ یعنی ہماری چھوٹی بہنیں جو نجمہ اور نسیم کی ہم عمر تھیں اور نجمہ وغیرہ کو بھی اِن آنے جانے والوں سے کوئی مطلب نہیں ہوتا تھا شمو اور بلقیس بہت چھوٹی تھیں ـ رضیہ آپا نے کبھی بھول کر بھی ایسا نہیں کیا کہ ان کے یہاں کوئی اس طرح کے مہمان آئے ہوں ـ اور ہم لوگ ان کے سامنے آئیں یا بات چیت میں حصہ لیں۔
آنگن کے دوسرے سرے پر بنے دوہرے دالان والے ہال میں چکوں کے اندر ہم لوگ گپیں کرتے ـــ اور آنے والوں کے فرضی نام رکھتے ـــ جیسے جلیبی وغیرہ ـــ ان آنے والوں میں منظر سلیم ہوتے عابد سہیل ہوتے ـ شارب ردولوی ـــ احمد جمال پاشا ـــ عالیہ عسکری اور عارف نقوی ہوتے ـــ یہ سارے طلبا یونیورسٹی سے متعلق تھے ـ جن کو رضیہ آپا کی بے پناہ محبت ملتی تھی ـ کھانے کا وقت ہو تو رضیہ آپا کا دسترخوان وسیع ہو جاتا ـ رضیہ آپا نے کل کے بارے میں تو سوچا ہی نہیں ـــ
یہ وہ زمانہ تھا جب ننے بھائی پاکستان کی جیل میں تھے اور رضیہ آپا سخت جدوجہد کرتے ہوئے بڑے بہادری سے حالات کا مقابلہ کر رہی تھیں ـــ نجمہ، نسیم اور نادرہ تینوں کی تعلیم جاری تھی ـــ وہ ماں اور باپ دونوں کی ذمہ داریاں نبھا رہی تھیں ـــ لیکن کسی رشتہ دار کی

مرہون منت ہونا کسر شان تھا — یہی نہیں کہ نجمہ اور نسیم کی پڑھائی کی ذمہ داری ادا کر رہی تھیں بلکہ گیراج میں رہنے والی زمرد کی بچیوں کے رہن سہن اور تعلیم پر بھی نظر تھی نجو اور نیوٹی وغیرہ سارے گھر میں گھر کے بچوں کی طرح اچھلتی رہتیں کام بھی کرتی رہتیں — لیکن اگر وہ نہ چاہیں تو کوئی زبردستی نہیں تھی۔ زمرد بھی کبھی گھر کے کاموں میں شامل ہو جاتی۔ کبھی پوری ذمہ داری سنبھال لیتی — اور کبھی صرف خانساماں کی مدد کرتی (غالباً اپنی حسب ضرورت) یہ اس کے موڈ پر تھا — لیکن رضیہ آپا ہمیشہ ان کے کپڑوں ان کے کھانے اور صاف رہنے کی فکر میں رہتیں — اور بے حد مدد کرتیں — نجمہ وغیرہ زمرد سے بالکل دوستوں جیسا برتاؤ کرتیں۔ فرق صرف اتنا ہوتا کہ نجمہ ان کو زمرد کہتی اور زمرد ان کو نجمہ بی بی — یہ دوستی میرے لیے بڑی عجیب تھی — لیکن مجھے اچھا لگتا رہا اور پھر ایسے لوگوں سے قریب جانے — ان کے ماحول میں جھانکنے اور ان کے درد کو محسوس کرنے کا سبق ان جانے ہی میں نے سیکھ لیا۔

اس خاندان کے ساتھ جو کچھ رضیہ آپا نے کیا تھا — اس کا بدلہ اس نے اچھا نہیں دیا — جس کا رضیہ آپا کو افسوس تھا —

اُس زمانے میں نجمہ — نسیم ۔ رکیہ ۔ مشرف ۔ انیس ۔ ثریا نقوی جادو (جاوید اختر) کلیم فہیم اور تقی وغیرہ نے مل کر بچوں کا ایک کلب بنایا تھا جس کا نام "ننھے تارے" تھا۔ ان بچوں کی عمریں ۱۵سے سولہ سال تک کی رہی ہوں گی — یہ لوگ دوہرے برآمدے والے بڑے حال کے فرش پر ہی طرح طرح کے پروگرام کرتے۔ نسیم اُس زمانے میں بھارت ناٹیم سیکھ رہی تھی اپنے سیکھے نقش کے ساتھ چھوٹا سا شو پیش کرتی — کبھی کوئی موسیقی کا پروگرام ہوتا اور کبھی ڈرامے کی تیاریاں شروع ہو جاتیں — یہ کلب تھوڑے ہی دن قائم رہا۔ جس میں رضیہ آپا کا انہماک بھی شامل تھا وہ ان سے ایسا برتاؤ کرتیں جیسے یہ لوگ کوئی بڑے آرٹسٹ ہوں۔ سب بچے بے چین رہتے کہ وہ اپنا کارنامہ رضیہ آپا کو ضرور بتائیں — اور وہ "شاباش" کہتی ہوئی ہنس پڑیں —

ویسے دیکھنے میں تو یہ معمولی سی باتیں لگتی ہیں — لیکن ان ننھے بچوں کے کچے ذہنوں میں ادب اور آرٹ سے دلچسپی کا جو بیج وہاں بویا گیا تھا — وہ ان کی شخصیت میں کبھی فنا نہیں

ہو سکتا ـــــ آج بھی ڈاکٹر نجمہ ظہیر علی باقر اور ڈاکٹر فہیم بڑے سائنسدان ہو کر بھی کہانیاں پڑھتے
ہیں۔ اور آرٹ و ادب کا ذوق رکھتے ہیں۔ جاوید فلمی دنیا سے وابستہ ہیں اور دو بڑے نام ان سے
جڑے ہوئے ہیں۔ جاں نثار اختر ـــــ اور مجاز ـــــ
دیکھنے میں رضیہ آپا ضرور تنہا تھیں ـــــ بنّے بھائی سے دور تھیں ـــــ لیکن ان کے
اندر کے اعتماد نے انھیں بہادری سے جینا سکھا دیا تھا ـــــ بنّے بھائی کی رفاقت کا احساس
ان کی سب سے بڑی طاقت تھی ـــــ محنت اور قناعت پر ان کا ایمان تھا ـــــ
انھوں نے اپنی ایک کہانی "بادشاہ" میں لکھا ہے۔
"جس کے دل میں قناعت کا نور ہو ـــــ سر میں ہنر اور محنت کا غرور، ـ پھر وہ چاہے
چیتھڑے میں لپٹا ہو ـــــ وہ بادشاہ نہیں تو پھر کون بادشاہ ـــــ ؟"
وہ اپنے ہاتھوں کو محنت کشوں کے ہاتھ کہتی تھیں ـــــ کبھی کوئی کام کرنے میں عار نہیں تھا
کیونکہ محنت اور سچائی پر ان کا ایمان تھا ـــــ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کی پرواہ نہیں کرتی تھیں
ـــــ پرس پھٹا ہے۔ چپل پرانی ہے۔ کہیں چلیں تو بکس کو رسی سے بندھوا دیا کہ کہیں راستہ
میں کھل نہ جائے۔
جو بات ہوتی بڑی ایمانداری سے صاف کہہ دیتیں ـــــ اپنی ایک کہانی "سچ صرف
سچ کے سوا کچھ نہیں" میں لکھتی ہیں۔
"بھولا بھالا ممدو حیرت سے بالسٹر صاحب کا منہ تاکتے ہوئے کہتا ہے
اجی بالسٹر صاحب ـــــ تو تم۔ گے۔ اتنی سی بات مجھے پہلے ہی بتا دیتے
کہ گھر کا ایمان اور ہوئے ہے اور عدالت کا ایمان اور ہوئے ہے ـــــ
ـــــ میں تو اب تک گے ہی سمجھا کروں تھا ـــــ کہ ایمان ـــــ آدمی کا ہوئے ہے۔
چاہے گھر بیٹھا ہو ـــــ چاہے تو وہ عدالت میں کھڑا ہوئے۔"
چاہے وہ بھیکی پینی تھیں ـــــ لیکن برفی سے پرہیز بڑا مشکل تھا۔ ان کا پرہیز
نجمہ کی زبردستی چلتا۔ بلکہ کبھی کبھی تو نجمہ ناراض تک ہو جاتی ـــــ زندگی کی تلخیاں جھیلتے جھیلتے انھیں
شوگر کی بیماری ہو گئی تھی۔

بنّے بھائی کی پاکستان سے واپسی پر تو جیسے جی اُٹھی تھیں۔ ہم لوگوں نے گھر میں جشن منایا تھا —— پھر نور پیدا ہوئی ہم لوگ سمجھے چوتھی بیٹی کی پیدائش پر وہ اداس ہوں گی —— لیکن رضیہ آپا اُسی طرح خوش تھیں بلکہ گھر کا ماحول ہی بدل گیا تھا ——

بنّے بھائی کے آنے کے بعد ترقی پسند مصنفین کا ایک بڑا اجتماع لکھنؤ میں ہوا —— تمام بڑے شعراء اور افسانہ نگاروں نے اس میں شرکت کی —— ان میں سے کیفی اعظمی۔ سردار جعفری۔ ساحر لدھیانوی وامق جونپوری۔ غلام ربانی تاباں وغیرہ سب کو پہلی بار ان کے ہی گھر پر دیکھا تھا —— افسانہ نگاروں میں کرشن چندر عصمت چغتائی۔ خواجہ احمد عباس، پرکاش پنڈت سے بھی پہلی مرتبہ رضیہ آپا کے گھر پر ہی ملنے کا اتفاق ہوا۔ رضیہ آپا نے تعارف کرایا —— وہ ہم لوگوں کی تعریف بڑھ چڑھ کر رہی تھیں اور ہم لوگ پھولے نہیں سما رہے تھے —— رضیہ آپا اس محفل میں بے حد خوش تھیں بالوں میں سُرخ گلاب لگائے ایک طرف مہمانوں کی خاطر میں اور دوسری طرف پروگرام کے کامیاب ہونے کے پلان دونوں میں شامل تھیں۔

وہ کیمونسٹ تھیں —— لیکن موقعہ پڑنے پر حضرت علیؓ سے ضرور مدد مانگتیں۔ "خدا حافظ" کبھی فراموش نہ کرسکیں۔ محرم میں چوڑیاں توڑنا اور سوگ کے کپڑے پہننا کبھی نہ بھولیں نویں کو لال کپڑے ہمیشہ پہنتیں اور بھر بھر ہاتھ چوڑیاں بھی ——

مذہب کو باقاعدگی سے نہ ماننے کے باوجود وہ اس کی بہت سی اچھی باتوں کی قائل تھیں دراصل ان کا مذہب انسانیت تھا —— وہ نہ سیاست میں نعرے بازی کی قائل تھیں —— اور نہ مذہب میں کٹھ ملّائیت کی وہ سب سے محبت کرتیں اور محبت کرنا سکھاتیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی بیٹیوں نے جہاں بھی شادی کرنا چاہی انھوں نے بڑے دھوم دھام سے شادی کردی۔

دہلی آنے کے بعد انھوں نے سوویت انفارمیشن سنٹر میں بحیثیت مترجم ملازمت کرلی تھی

انھیں اپنی چاروں بیٹیاں نجمہ ۔ نسیم ۔ نادرہ اور نور اور داماد یکساں طور پر عزیز رہے اور ان سب نے بھی ہر طرح ان کے آرام اور جذبات کا خیال رکھا ۔

بنے بھائی کے انتقال کے بعد ان کی بڑی بیٹی نجمہ اور ان کے شوہر علی باقر جب لندن سے واپس آگئے تو ان دونوں نے رضیہ آپا کو کسی طرح بھی اپنے سے الگ نہیں رہنے دیا ـــ اور وہ حوض خاص سے نجمہ کے گھر منتقل ہو گئیں ۔

ان کے کوئی بیٹا نہیں تھا ـــ اور انھوں نے کبھی اس کی کمی بھی نہیں محسوس کی ـــ شاید ۔ اس لئے بھی کہ جب کمی محسوس کرنے کا زمانہ آیا تو علی باقر نے وہ جگہ بڑی خوبی سے پُر کردی ۔ اور ان کے آخری وقت تک ایک بیٹے کے تمام فرائض اُسی محبت کے ساتھ ادا کرتے رہے ـــ اور ان کے ہی یہاں ۱۰ دسمبر ۱۹۷۹ء کو وہ بنے بھائی کے پاس چلی گئیں ۔

وہ محبت کی بہتی ہوئی شفاف ندی تھیں ـــ جو محبتوں کے اتھاہ سمندر میں مل گئیں ـــ

ڈ

ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائلؔ دہلوی

تاجِ ارشد جام غالب ماہِ داغ سائل اندر کاسہ دارد سہ چراغ

اُردو اکاڈمی دہلی کا یہ اقدام واقعی قابل مبارکباد ہے جس کے تحت دلی کی چند برگزیدہ ہستیوں کی یاد تازہ کی جارہی ہے۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جو اپنے وقت میں آسمانِ ادب پر مہرِ درخشاں بن کر چمکیں اور خواص وعوام سے دادِ تحسین وصول کرتی رہیں۔

اُردو زبان کی ادبی حیثیت آج تک وہی ہے جو جہاں استاد، بلبلِ ہندوستان، فصیح الملک نواب مرزا داغؔ دہلوی نے قائم کی تھی۔ اس لحاظ سے زبان کے اس آخری دور کا مورث اعلیٰ صرف فصیح الملک داغؔ کو کہا جا سکتا ہے۔ داغؔ اور ان کے تلامذہ دورِ حاضر کی عالمگیر اور صالح زبان کے معمار ہیں۔ بڑی بدنصیبی ہوگی اگر ہندوستانی قوم ان حضرات کے حالات سے ناواقف رہے جنھوں نے اُردو ادب کو نکھار کر ایک بین الاقوامی زبان بننے کے قابل بنایا۔

داغؔ صاحب کے دہلی کے شاگردوں میں سے چار دلی والے مشہور ہیں۔ ایک نواب سائلؔ دوسرے حضرت بیخودؔ، تیسرے جناب آغا شاعر قزلباش اور چوتھے راقم الحروف کے والدِ ماجد پنڈت تربھون ناتھ زتشی زارؔ دہلوی۔ آج کے اس مضمون میں زیرِ بحث اِس ناچیز کے اُستاد اور چچا نواب سائلؔ دہلوی ہیں۔

ابو المعظم نواب مرزا سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی خاندان لوہارو کے ایک ممتاز فرد اور دہلی کی قدیم تہذیب کے ایک مکمل نمونہ تھے۔ آیئے ان کی علمی اور ادبی شخصیت کا جائزہ لینے سے پہلے ان کے خاندانی پس منظر پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے۔

مغل بادشاہ عزیز الدین عالمگیر ثانی کے عہد (سترھویں صدی عیسوی) میں تین تورانی بھائی سمرقند سے ہندوستان میں وارد ہوئے: قاسم جان، عارف جان، عالم جان (عارف جان سائل صاحب کے دادا کے دادا تھے) قاسم جان کو نواب معین الملک ناظم پنجاب (عرف میر منّو خلف نواب قمر الدین خاں وزیر محمد شاہ بادشاہ) نے سندھ کی جاگیر دی اور نظیر بیگ خاں (ہزارہ) کی صاحبزادی سے شادی کر دی۔ عارف جان کی شادی اٹک کے ناظم مرزا محمد بیگ کی صاحبزادی سے ہوئی۔ میر منّو کی رفاقت میں تینوں بھائی سکھوں کے مقابلے میں اپنی شجاعت اور سپہ سالاری کے جوہر دکھاتے رہے نواب معین الملک کے انتقال کے بعد قاسم جان پانچ سو تورانی سوار لے کر بہار پہنچے اور شہزادۂ عالی گہر (شاہ عالم ثانی) کے ساتھ میرن بن میر جعفر کو شکست دی۔ شہزادے نے اُن کو شرف الدولہ سہراب جنگ کا خطاب اور ہفت ہزاری منصب دے کر اپنے رفقا میں داخل کر لیا۔ جب شہزادہ وہاں سے واپس ہوا تو یہ تینوں بھائی دہلی آگئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ دہلی میں گلی قاسم جان انہیں کے نام سے مشہور ہے اس محلہ میں قاسم جان نے حویلی بنوائی تھی جو اب احاطہ کالے صاحب کہلاتی ہے۔

ان کے بھتیجے احمد بخش خاں خلف عارف جان نے لارڈ لیک کے ساتھ مہاراجہ الور کی جانب سے مہمات میں شرکت کی۔ فتح کے صلہ میں انگریز حکومت سے جاگیر میں فیروز پور جھرکا پوہانہ پچھور اور نگینہ پایا۔ نواب فخر الدولہ رستم جنگ دلاور ملک خطاب ان کو ملا۔ مہاراجہ الور نے پرگنہ لوہارو اپنی جانب سے دے کر جاگیر میں اضافہ کر دیا۔ قاسم جان دہلی میں سکونت اختیار کرنے کے بعد معاملات سلطنت میں دخیل رہے۔ عالم گیر ثانی کے قتل اور عالی گہر (شاہ عالم) کی تخت نشینی وغیرہ امور مملکت میں نواب ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے دست و بازو رہے اور شاہ عالم کے نائب وزیر کا عہدہ ملا۔ نواب عارف جان دیہات جاگیر وغیرہ کا انتظام کرتے تھے۔

نواب عارف جان کے چار بیٹے تھے۔ الٰہی بخش خاں معروف، احمد بخش خاں، نبی بخش خاں،

محمد علی خاں ۔ اور ایک لڑکی تھی جو مرزا غالب کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ کو منسوب تھی۔

نواب احمد بخش والئ لوہارو (وغیرہم) نے دو نکاح کیے۔ ایک نکاح تو خاندان میں ہی ہوا اور دوسرا ایک میواتی خاتون سے جو بہو بیگم کے نام سے موسوم ہیں۔ میواتی بیگم سے دو لڑکے نواب شمس الدین احمد خاں، ابراہیم علی خاں اور خاندانی بیگم سے نواب امین الدین احمد خاں، نواب ضیاء الدین احمد خاں پیدا ہوئے۔ نواب احمد بخش خاں نے خاندانی بیگم کے دونوں لڑکوں کے نام لوہارو کی جاگیر لکھ دی اور نواب شمس الدین احمد خاں کو اپنی زندگی میں ہی فیروزپور جھرکا کا حکمراں بنا دیا۔ نگینہ ابراہیم علی خاں کو دیا۔ نواب شمس الدین احمد خاں (والد مرزا داغ) کو کمشنر دلی فریزر صاحب کے قتل کے الزام میں پھانسی ملی۔ فیروزپور جھرکا اور اس کے ساتھ کے علاقے ضبط کر لیے گئے۔ صرف لوہارو باقی رہ گیا۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں اپنے والد کی وفات کے وقت چھ برس کے تھے۔ لوہارو کا پرگنہ ان دونوں بھائیوں کی جاگیر میں تھا لیکن چونکہ ضیاء الدین احمد خاں نابالغ تھے لہذا نظم و نسق بڑے بھائی امین الدین احمد خاں کے ہاتھ میں رہا۔ بالغ ہونے پر نواب ضیاء الدین احمد خاں نے مطالبہ کیا کہ مجھے بھی ریاست میں برابر کا شریک سمجھا جائے۔ ورنہ اس کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ حکومت انگریزی نے یہ دونوں تجویزیں نامنظور کیں اور ۱۸۴۸ء میں فیصلہ کیا کہ نواب بڑے بھائی امین الدین احمد خاں رئیس اور ضیاء الدین احمد خاں کو اٹھارہ ہزار روپے سالانہ وظیفہ ملتا رہے۔ اس پر نواب ضیاء الدین احمد خاں لوہارو سے مستقل دہلی آ گئے اور مرتے دم تک یہیں رہے۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں کی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی۔ علم تفسیر و حدیث مولانا عبد القادر کے شاگرد رشید مولوی کریم اللہ سے۔ ادب و فقہ جناب مفتی صدر الدین آزردہ سے۔ فلسفہ و منطق مولانا فضل حق خیرآبادی سے حاصل کیے۔ فارسی میں مرزا غالب سے استفادہ کیا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ عربی و ترکی بھی اچھی جانتے تھے۔ نواب موصوف نجوم و ہیئت میں بھی اعلیٰ واقفیت رکھتے تھے۔ تاریخ پر الفک کو پورا عبور حاصل تھا۔ کتب بینی سے ان کو بہت شغف تھا۔ ان کے کتب خانہ میں ہر طرح کے علوم کی نادر کتابیں موجود تھیں۔ افسوس کہ یہ سارا سرمایہ ۱۸۵۷ء میں نذر آشوب ہو گیا۔ نواب صاحب مرزا غالب سے تلمذ رکھتے تھے اور ان کے خلیفۂ اوّل تھے۔ حضرت مفتی صدر الدین آزردہ، مولانا فضل حق خیرآبادی اور مرزا غالب

اگرچہ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کے اساتذہ میں تھے مگر اُن سے دوستانہ اور ہم جلیسی کے مراسم بھی تھے۔ مرزا غالب سے ان کا خاص تعلق تھا۔ ان کی چچازاد بہن اُمراؤ بیگم مرزا غالب سے منسوب تھیں۔ مرزا نے ایک قصیدہ نہایت بلیغ و لطیف نواب صاحب کی شان میں لکھا ہے جس میں ان کا استاد ہونے پر فخر کیا ہے۔ افسوس کہ نواب صاحب کا مجموعۂ کلام ہنگامۂ ۱۸۵۷ء میں ضائع ہوگیا۔ امن ہونے کے بعد کچھ پُرانے پرچوں اور منسخ شدہ مسودات سے اور کچھ حافظہ پر زور دے کر قلم بند کیا گیا جس کو "صحیفۂ زریں" کے نام سے اُن کے چھوٹے صاحبزادے نواب احمد سعید خاں نے ۱۹۱۶ء میں شائع کیا۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں نے ۱۳۰۲ھ میں رحلت فرمائی۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کی اولاد میں دو لڑکے اور ایک لڑکی تھے۔ بڑے صاحبزادے نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب اور چھوٹے نواب سعید الدین احمد خاں طالب معروف بہ نواب احمد سعید خاں دہلوی اور صاحبزادی معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم تھیں جو مرزا باقر علی خاں کامل ابن عارف سے منسوب ہوئیں۔

نواب شہاب الدین احمد خاں ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ چھوٹی سی عمر میں اپنے ذاتی علم و فضل اور خوش اخلاقی کی وجہ سے کافی شہرت حاصل کرلی تھی اور آنریری مجسٹریٹ کے عہدے پر بھی فائز تھے۔ ثاقب اپنی ذہانت کی بدولت مرزا غالب کے محبوب شاگرد تھے۔ وہ اس جوان صالح کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ شہاب کی مناسبت سے ثاقب تخلص مرزا نے ہی ان کو عطا کیا تھا۔ افسوس کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی اور ۲۹ سال کی عمر میں ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔

نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب کے ہاں پانچ اولادیں تھیں، چار لڑکے اور ایک لڑکی نواب شجاع احمد خاں تاباں، نواب بہاء الدین احمد خاں طلب، نواب سراج الدین احمد خاں سائل نواب ممتاز الدین احمد خاں مائل اور اختر سلطان بیگم۔

ابو المعظم نواب مرزا سراج الدین احمد خاں سائل کی ولادت مورخہ ۲۰ شوال ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۷ء کو دلّی میں ہوئی۔ یہی وہ ہونہار تھا جو نشو و نما پا کر سائل بنا اور دہلی کی شرافت و تہذیب اور شعر و سخن کی دولت تقسیم کی۔ ابھی کوئی پانچ سال کی عمر تھی کہ والد محترم کا انتقال ہوگیا۔

اور جب ۲۲ سال کی عمر ہوئی تو شفیق دادا نے بھی منہ موڑ لیا۔

سائل صاحب کی تعلیم و تربیت نواب ضیاء الدین احمد خاں کی نگرانی میں شروع ہوئی۔ فارسی کی درسیات دادا جان سے سبقاً سبقاً پڑھیں۔ مولوی قاسم علی اتالیق مقرر ہوئے۔ ان سے بھی درسیات پڑھیں۔ فنی کتب، علم عروض اور گریمر وغیرہ مرزا عبدالغنی ارشد گورگانی سے پڑھیں اور کلام کی اصلاح لی۔ حکیم عبدالمجید خاں (حکیم اجمل خاں کے بڑے بھائی) سے طب کی کچھ ابتدائی کتابیں بھی پڑھیں۔ مولانا نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر حدیث کی سماعت بھی کی۔ خوش نویسی کی مشق نواب مولوی رضی الدین احمد خاں دہلوی شاگرد میر پنجہ کش کی زیر نگرانی کی اور ایسا کمال حاصل کیا کہ باید و شاید۔ انگریزی بھی اتنی پڑھی تھی کہ بلا تکلف باتیں کر سکتے تھے۔

تخلص کے بارے میں روایت ہے کہ نواب احمد سعید خاں طالب (عم محترم حضرت سائل) اور دیگر حاضرین مجلس ایک روز سرگرم فکر تھے۔ اس اثناء میں ایک شریف اور سوالی صورت انسان نے آکر سلام کیا۔ تشریف آوری کا سبب پوچھنے پر آنے والے صاحب نے عرض کیا کہ "سائل" ہوں۔ چنانچہ اسی لفظ سائل کی طرف توجہ منعطف ہوئی۔ قرعہ ڈالا گیا اور حسب مراد حاصل ہوا۔

سائل صاحب اپنے دونوں بڑے بھائیوں سے زیادہ ذہین اور رسا طبع رکھتے تھے۔ اس لیے یہ دادا کے بہت لاڈلے تھے۔ نواب نیر رخشاں کے دیوان خانے بیت الفیار" (گلی قاسم جان) میں روزانہ مشاہیر علم و ادب جمع ہوتے۔ تاریخ، ادب، فلسفہ، شعر و سخن غرضیکہ ہر علمی و ادبی موضوع پر گفتگو ہوتی۔ سائل ہمیشہ اس بزم ادب میں موجود رہتے تھے۔ اس لیے کمسنی میں ہی ان کی معلومات میں کافی اضافہ ہو گیا اور علمی فضا نے ان کے ذہن پر جلا کر دی۔

سائل صاحب کے زمانۂ حیات میں یہ بات عام طور سے مشہور تھی کہ جو مرزا نوشہ کے دیدار سے محروم رہا ہو وہ آپ کو دیکھ لے۔ مغلئی خد و خال، میدہ اور شہاب رنگ۔ لانبا قد مگر موزوں، سڈول بدن، کشتی ہاتھ پاؤں، سر بڑا، پیشانی بلند، چہرہ قدرے لمبوترہ، سینہ چوڑا۔ سر پر مخمل کی لیس لگی چوگوشیہ دتاج نما، ٹوپی۔ ململ، چکن یا نین سکھ کا سفید براق انگرکھا۔ آڑا پائجامہ۔ پاؤں

میں کا مدار سلیم شاہی جوتی۔ حد درجہ وجیہہ و شکیل۔ اطوار میں شرافت اور گفتار میں شرینی۔ اسی سج دھج کے ساتھ دِلی کی آب کوثر میں ڈھلی ہوئی زبان میں سائل صاحب جب دل نشین انداز اور مترنم آواز سے اپنا کلام سناتے تو ان اشعار کو حاصل مشاعرہ سمجھا جاتا۔ سننے والے بیساختہ داد پر داد دیتے۔ فضا پر نشہ سا چھا جاتا۔ در و دیوار وجد کرنے لگتے تھے نوعمری میں ہی سائل صاحب کی شاعری کا ڈنکا پورے ہندوستان میں بج گیا۔ جہاں کہیں بھی کوئی بڑا مشاعرہ ہوتا منتظمین مشاعرہ بہت اصرار سے سائل صاحب کو بلاتے تھے کیونکہ اس دور کا کامیاب مشاعرہ وہی سمجھا جاتا تھا جہاں سائل جائیں۔ ان کا یہ عالم تھا کہ جہاں بھی پہنچے مشاعرہ انھوں نے لوٹ لیا خوش رو، خوش خو، خوش گلو جوان رعنا سائل بھی دنیائے شعر و ادب کی تخلیق معلوم ہوتے تھے۔ عمر کی اکیس منزلیں طے کرنے سے پہلے ہی اس بلبل خوش الحان کی نوانجیوں پر پورا ملک جھوم اٹھا۔

میں نے اپنے والد کی زبانی سنا ہے کہ جوانی کے زمانے میں جب نواب صاحب فارغ البال بھی تھے اِس ٹھسّے سے مقامی مشاعروں میں شرکت فرماتے تھے کہ ایک ملازم بیاض سنبھالے ہے دوسرا خاصدان، اور تیسرا پیچوان شاگردوں اور مداحوں کا ہجوم گھیرے ہوئے ہے اور سائل صاحب نپے تلے قدم رکھتے ہوئے بادبہاری کی طرح اٹکھیلیاں کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ اس زمانے کے سائل ہیں جس زمانے کا یہ شعر ہے ؎

بے سائل خود اذ اہل بذل و کرامت خدا نے اسے دی ہے دنیا کی دولت
جو مسکین بے کر کم و بیش حاجت جب آیا اُسے مٹھیوں زر دیا ہے

افسوس کہ انقلاب زمانہ نے اُسی سائل کو آگے چل کر یہ شعر کہنے پر مجبور کر دیا ؎

رکھا ہے مجبور سائل تخلص ہوئی اتنی جب احتیاجوں کی مشکل
ملے دانہ کھانے کو جب دانا مانگو میسر ہو پینے کو پانی کہو تو

نواب صاحب قبلہ شاعر سے زیادہ ایک انسان تھے۔ وہ دہلی کی تہذیب و تمدن کا آخری نمونہ تھے۔ شغل شعر و ادب کے علاوہ اور بہت سی خوبیاں ان میں تھیں۔ بے مثل خطاط اور خوشنویس تھے۔ کشیدہ کاری میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ میں نے انہیں فرصت کے اوقات میں اکثر اپنے

رومال اور ٹوپیاں کاڑھتے دیکھا ہے۔ اکثر اپنے انگرکھے وغیرہ خود کاٹ کر درزی کو سینے کے لیے دیتے تھے۔ پتنگ بازی بھی کی ہے۔ بے مثل تکل بناتے تھے اور ڈور سوتتے تھے۔ سیر و شکار، بلیرڈ، تاش اور گھوڑسواری کے بھی شوقین تھے۔ ریس میں اپنے گھوڑے پر خود سوار ہو کر دوڑاتے تھے۔ اچھا کھانا کھاتے اور خوب پکاتے تھے اور کھلا کر خوش ہوتے تھے۔ غرضیکہ ان میں وہ سب کمالات تھے جو اس دور کے رؤسا کے طرۂ امتیاز تھے۔ وہ نہایت خلیق، ملنسار، مہمان نواز، منکسر المزاج اور وسیع المشرب تھے۔ گیتا اور سری کرشن سے ان کو خاص عقیدت تھی۔ کرشن جنم اشٹمی کے موقع پر مقامی اردو اخباروں خصوصاً "تیج" میں ان کی نظمیں ہمیشہ چھپتی تھیں۔

فن کار فطری طور پر حساس اور جذباتی ہوتے ہیں۔ سائل صاحب کو تو قدرت نے حسن صورت بھی دیا تھا اور حسن طبیعت بھی۔ اور پھر روپے پیسے کی بھی کمی نہ تھی۔ دادا کی آنکھ بند ہوتے ہی طرحدار رنگین مزاج سائل کھل کھیلے۔ شاعری کی شہرت کے ساتھ ان کی رنگ رلیوں کا چرچا بھی ہونے لگا۔ سمجھ دار اور عاقبت اندیش ماں نے یہی بہتر سمجھا کہ بیٹے کو شادی کی سنہری زنجیروں میں باندھ دیا جائے۔ نواب ممتاز علی خاں والئ پاٹودی سے سائل صاحب کی چھوٹی خالہ منسوب تھیں۔ ان کی چھوٹی صاحبزادی سے شادی ہو گئی۔ اس بیوی سے سائل صاحب کی زیادہ نہ نبھ سکی۔ ان کے بطن سے ایک لڑکا ہوا مگر وہ پانچ برس کا ہو کر تین دن میں چٹ پٹ ہو گیا۔ وہ اس کی موت کا باعث بیوی کی لاپرواہی کو ٹھہراتے تھے۔ آخر رنجش اتنی بڑھی کہ بیوی میکے جا بیٹھیں اور سائل صاحب نے بھی پھر ان کو نہیں بلایا۔ بالکل قطع تعلق کر لیا۔ بچے کا تاریخی نام معظم الدین احمد خاں سائل صاحب نے رکھا تھا اس لیے ہمیشہ اپنے نام کے ساتھ "ابو المعظم" لکھتے رہے۔ اور اس نونہال کے غم کو بھولنے کے لیے انھوں نے پھر اپنے کو راگ رنگ میں کھو دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نصف جائداد اس عیش و عشرت کی بدولت دو سال کے اندر ہاتھ سے نکل گئی۔

چھوٹے بھائی ممتاز الدین احمد خاں مائل کی صحت بھری جوانی میں شراب کی لت نے بالکل تباہ کر دی تھی اور وہ چند ماہ کی علالت کے بعد راہئ ملک بقا ہوئے تو حساس طبع سائل کی دل پر جواں مرگ بھائی کی موت نے ایسی چوٹ پہنچائی کہ رنگ رلیاں بالکل چھوڑ دیں۔ اب ان کا زیادہ وقت نوعمر بیوہ بھاوج اور یتیم بھتیجے کی ناز برداری میں گزرتا تھا۔ اسی زمانہ ۱۹۰۰ء کے اوائل میں

سائل صاحب حیدر آباد تشریف لے گئے اور فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی کے شاگرد ہو گئے اور ان کی شادی بھی داغ صاحب نے اپنی بیوہ بیٹی اور سائل صاحب کی چھوٹی بھاوج لاڈلی بیگم سے ۱۹۰۱ء میں کردی۔ لاڈلی بیگم صاحبہ کو داغ کی بیٹی ہونے کی حیثیت سے تین سو روپیہ ماہانہ حیدر آباد سے منصب ملتا تھا۔ سائل صاحب کا منصب بھی حضرت داغ نے دو سو روپیہ ماہانہ حیدر آباد سے کرادیا۔ حیدر آباد میں سائل مع اپنے اہل و عیال کے ساتھ اسی کوٹھی میں رہتے تھے۔ جہاں استاد داغ قیام پذیر تھے۔ یہ کوٹھی ترپ بازار میں واقع تھی اس زمانہ میں سائل صاحب ان کی بیگم اور مرزا ناصر الدین (جو سائل صاحب کے بھتیجے اور سوتیلے بیٹے تھے) کے وظائف کی آمدنی دس گیارہ سو روپے ماہوار ہو جاتی تھی جو بلا مبالغہ آج کل کے دس ہزار روپے کے برابر تھے۔ یہ خاندان نہایت عزت و وقار کے ساتھ حیدر آباد میں رہا۔

سائل صاحب کی اس شاگردی سے ان کے خاندان کے بعض افراد ناخوش تھے۔ سائل نواب ضیاء الدین نیر رخشاں کے پوتے تھے جو مرزا غالب کے خلیفہ اول تھے۔ ان کی شاعری کا رنگ غالب سے ملتا جلتا تھا۔ یعنی تخیل کی بلندی معنی آفرینی، اختراع تراکیب اور دیگر خصوصیات غالب ان میں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔ اور افراد خاندان یعنی چچا احمد سعید خاں طالب اور بڑے بھائی نواب شجاع الدین تاباں وغیرہم کا بھی یہی رنگ تھا۔ سائل صاحب کے پہلے استاد مرزا ارشد گورگانی کے ہاں بھی تقریباً یہی رنگ تھا ــــ مگر داغ کے ہاں محاکات و محاورات اور زبان تھی یہاں رنگ ہی کچھ اور تھا۔ اِس شاگردی کے بعد سائل صاحب کے رنگ میں تغیر واقع ہوا۔ مگر باوجود اس کے سائل کی فکر رسا نے اپنے خاندانی رنگ اور داغ کے رنگ کو سمو کر ایک ایسا رنگ تغزل ایجاد کیا جو مومن کے قریب تھا۔ ان کے کلام میں شوخی بھی ہے تصوف بھی، معنوی بلند پروازی بھی ہے اور شوکتِ الفاظ بھی، محاورہ بھی ہے اور زبان بھی۔

حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں سائل صاحب نے دربار اور خواص و عوام میں شہرت حاصل کی اور خوب خوب داد تحسین وصول کی۔ داغ صاحب کا انتقال ۱۹۰۵ء میں ہو گیا اور سائل صاحب اس کے تین سال بعد تک حیدر آباد میں مقیم رہ کر ۱۹۰۸ء میں واپس دلی آ گئے۔

نواب سائل پہلے اپنے آبائی مکان واقع گلی قاسم جان میں رہتے تھے۔ حیدر آباد سے واپسی کے

نگینہ محل۔ فراشخانہ میں کرایہ کا مکان لے کر قیام کیا بعد ازاں ۱۹۱۰ء میں لال دروازہ (لال کنواں) کے اندر آخر میں جو محل سرا ہے اس میں منتقل ہوگئے۔ یہ نواب صاحب کی والدہ کی طرف سے حصّہ میں آئی تھی۔ ۱۹۳۴ء میں یہ مکان فروخت کیا گیا کیونکہ اس میں ان کے بھتیجے مرزا ناصرالدین کا بھی حصّہ تھا جو تقسیم کیا گیا۔ سائل صاحب پھر فراشخانہ میں کرایہ پر مکان لے کر رہنے لگے اور لال دروازے ہی میں ایک کٹڑا جوان کی ملکیت تھا اس کو خالی کرا کر مکان بنانا شروع کیا۔ یہ مکان ۱۹۳۶ء میں بن کر تیار ہوگیا اور نواب صاحب اس میں منتقل ہوگئے اور اسی مکان میں انتقال ہوا۔ افسوس ۱۹۴۷ء میں یہ مکان صاحبزادے محمد میاں نے فروخت کر کے دلی کو خیرباد کہا اور اپنی سسرال لاہور چلے گئے۔ اواخر ۱۹۴۷ء میں چچی بھی دلی سے رخصت ہوگئیں۔ اُن کی یادگار دلی میں ایک منھ بولی صاحبزادی مقبول جہاں بیگم عرف چُنی تھی۔ جو ۱۹۷۶ء میں اللہ کو پیاری ہوگئی۔ چُنی بی کے والد محمد یوسف صاحب کا مکان لال دروازے میں نواب صاحب کے پڑوس میں دیوار بہ دیوار تھا۔ چچی نے چُنی کو خود پالا پروسا تھا اور وہ گھر میں بالکل اپنی لڑکی کی طرح رہتی تھی اور چچی کا داہنا بازو تھی۔ اس کی شادی بھی نواب صاحب کے گھر سے ہی ہوئی تھی۔ اس کے شوہر برادرم منشی عبدالقدوس بفضل خدا حیات ہیں اور پنڈت کے کوچہ میں رہتے ہیں۔ چُنی جب تک حیات تھی مجھے بڑے بھائی کے رشتہ سے راکھی باندھتی رہی۔ اب اس کی بیٹیاں ماں کے اس فرض کو نبھاتی رہتی ہیں۔ چنی کے شوہر اور بچوں سے بدستور میرے گھر کے تعلقات چلے آتے ہیں اور ملنا جلنا بدستور قائم ہے۔ اس کے میکے والوں سے بھی وہی اپنائیت کا رشتہ چلا آتا ہے۔ اُسی کے بھتیجے عزیزی فیروز میاں نے میرے مجموعۂ کلام "خلش" کی طباعت اور اشاعت کا سارا بوجھ اپنے کاندھوں پر لیا تھا۔

نواب سائل کی پانچ اولادیں تھیں۔ پہلی بیوی سے مرزا معظم الدین احمد خاں جو پانچ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ دوسری بیوی لاڈلی بیگم کے بطن سے تین لڑکے اور ایک لڑکی ہوئی۔ ان میں بڑی صاحبزادی تھیں جن کا نام قدسیہ بیگم تھا۔ وہ ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئیں اور مرزا عبدالرب سشن جج سے بیاہی گئیں۔ ان کا انتقال ۱۹۴۲ء میں ہوگیا اور اس صدمہ سے نواب صاحب قبلہ کی صحت روز بروز گرتی چلی گئی۔ بڑے صاحبزادے مرزا غلام قطب الدین عرف محمد میاں سنہ ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ وہ "فصیح" تخلص کرتے تھے اور استاد بیخود دہلوی کے شاگرد تھے۔ ۱۹۷۵ء

ہیں ان کا بھی انتقال پاکستان میں ہوگیا۔ ان کی شادی مرزا عبدالرب کی پہلی بیوی کی لڑکی عذرا بیگم سے ہوئی تھی۔ دوسرے صاحبزادے مرزا غلام نظام الدین عرف محبوب میاں (جن کو بُوبن بھی کہتے تھے) ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ وہ پہلے انگریزی فوج میں اور پھر حیدرآباد کی فوج میں میجر کے عہدے پر ملازم ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ایران بھیجے گئے اور وہیں ۱۹۴۳ء میں انتقال ہوگیا۔ اس ہونہار نوجوان کی موت نواب صاحب کی کمر بالکل توڑ دی۔ سب سے چھوٹے صاحبزادے مرزا غلام فریدالدین تھے جو ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے اور سال بھر کی عمر میں ہی فوت ہوگئے۔

راقم الحروف کے خاندان کے پرانے مراسم نواب صاحب کے خاندان سے چلے آتے تھے نیز والد مرحوم بھی جہاں اُستاد فصیح الملک نواب مرزا داغ کے تلمذ تھے اور اس رشتے سے نواب سائل کے خواجہ تاش جنہیں وہ ہمیشہ نواب بھائی کہتے تھے۔ یہ ناچیز لڑکپن سے ہی چچا نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا۔ شعر و سخن سے چھٹپن ہی سے لگاؤ تھا اور کوئی سولہ سترہ برس کی عمر سے مشاعروں میں شریک ہونے لگا تھا۔ ایک دن میں چچا جان کے ہاں سلام کو حاضر ہوا۔ انھوں نے کچھ سنانے کو کہا۔ میں نے ایک غزل سنائی۔ حکم ہوا کچھ اور پڑھو اس طرح تین، چار غزلیں پے در پے سنیں اور حوصلہ افزائی فرمائی۔ پھر سوال کیا کہ تو غزل کس کو دکھاتا ہے اپنے باوا کو۔ میں نے عرض کیا کہ جی ہاں انھیں سے مشورۂ سخن کرتا ہوں۔ فرمایا کہ تیری اور ان کی طبیعت غیر ہے۔ تو غزل مجھ کو دکھایا کر۔ گھر آکر میں نے والد سے یہ ماجرا بیان کیا اور پوچھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے والد صاحب اور اُلٹا مجھ پر ناراض ہوئے اور فرمایا کہ مجھ سے کیوں پوچھتے ہو۔ جو تمہارے چچا نے کہا ہے اس کی تعمیل کرو۔ بس اس دن سے چچا سائل سے رشتۂ اُستادی، شاگردی کا بھی قائم ہوگیا

۱۹۲۷ء میں قبلہ نواب صاحب اپنے چھوٹے صاحبزادے مرزا غلام نظام الدین کی سفارش کے لیے حیدرآباد تشریف لے گئے۔ صاحبزادے انگریزی فوج میں ملازم تھے۔ سائل صاحب چاہتے تھے کہ حیدرآباد کی فوج میں تبادلہ کرادیں۔ چنانچہ حیدرآباد کی فوج میں ان کو میجر کا عہدہ ملا۔ حیدرآباد میں سائل صاحب نے نواب منظور یار جنگ بہادر کی کوٹھی میں قیام کیا۔ ایک روز شب میں آرام کرسی پر مصروف مطالعہ تھے۔ رات کے بارہ بجے کے قریب فارغ ہوکر استراحت

کے ارادے سے پلنگ کی طرف جانا چاہتے تھے۔ پیر کے انگوٹھے میں تہمد کا کونہ الجھ گیا اور گر پڑے۔
ایک کولھے کا جوڑ اتر گیا اور ہڈی چٹخ گئی۔ گیارہ ہفتے تک ہسپتال میں رہے اور ۱۹۲۸ء میں
دہلی واپس آگئے۔ جب سے تادم آخر ٹانگیں اور نیچے کا دھڑ بالکل بیکار رہا۔

حیدر آباد سے واپسی پر میں بغرض سلام و مزاج پرسی نواب صاحب کی خدمت میں
حاضر ہوا۔ دوران گفتگو فرمایا کہ بیٹا میں معذور ہو گیا ہوں۔ کچھ اور ضروری کام نہ ہو تو شام کو
دفتر کے بعد میرے پاس آجایا کرو۔ اس روز سے میرا یہ معمول ہو گیا کہ آندھی آئے یا طوفان کچھ بھی ہو
شام کی حاضری کا ناغہ نہ ہونے دیتا تھا۔ اگر کسی روز نہ پہنچ پاؤں تو ملازم بلانے آجاتا۔ اگر یہ کہہ دیا
کہ آج طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ حاضر نہ ہوں گا تو تھوڑی دیر بعد رکشا میں سوار ہو کر خود غریب
خانے پر تشریف لے آتے تھے اور یہ کہنے پر کہ حضور کو زحمت کرنے کی کیا ضرورت تھی، فرماتے
کہ بیٹا جی نہیں مانا۔ میں نے سوچا دیکھ آؤں۔ غرضیکہ ان کی محبت اور شفقت اس ہیچمداں پر دن
دونی اور رات چوگنی بڑھتی گئی۔ بلا مبالغہ مہینے میں کم از کم بیس دن تو میں رات کا کھانا بھی وہیں کھاتا
تھا۔ ہوتا یہ کہ میں چلنے لگتا تو چچی جان کہتیں کہ بیٹا کھانا کھاتا جا اور میں چچا کے پاس اٹھ کر
اندر چچی کے پاس جا بیٹھتا۔

ان حاضر باشی کے اوقات میں خوش گپیاں، تاش کی بازی، شعر و سخن اور علم و ادب کے
نکات پر گفتگو سبھی کچھ ہوتا تھا۔ نواب صاحب قبلہ جو تازہ غزل کہتے وہ پہلے مجھے سناتے اور
مجھے چھوٹ دی ہوئی تھی کہ اگر کوئی بات کھٹکے تو بلا تکلف ٹوک دوں، چچا اور استاد ہونے کا
لحاظ کیے بغیر۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ کوئی شعر اگر مجھے پسند نہ آیا تو میں کہہ دیتا تھا کہ حضور شعر اپنی
جگہ خوب ہے مگر سائل کی شان کے شایاں نہیں۔ اس پر بلا تامل وہ شعر پر قلم پھیر دیتے تھے۔
اکثر غزل پر اصلاح کے دوران بحث مباحثہ بھی ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھی بڑے میاں ضد پکڑ جاتے
اور بغیر سند بہم پہنچائے گاڑی آگے نہ چلتی۔ ایک مرتبہ سند طلب کرنے پر میں نے کہا کہ میں اگر اساتذہ
متقدمین کا کوئی شعر پڑھ دوں تو آپ مان جائیں گے۔ زبان اور محاورہ ان کا ہی اجارہ نہیں۔
میں بھی دلی والا ہوں۔ اردو میری زبان ہے میں نے لکھا ہے یہی سند ہے۔ استاد مسکرائے اور بولے
کہ اچھا بھئی خفا کیوں ہوتا ہے، مان لیا۔ ظاہر ہے کہ ان کا اعتراض محض میری خود اعتمادی کا امتحان

لینے کی غرض سے تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ استادعنے کوئی اپنی تازہ غزل سنائی، زمین پسند آنے پر اگلے روز میں بھی اسی زمین میں غزل کہہ کرلے گیا اور سنائی تو بہت خوش ہوئے اور تعریف سے میرا دل بڑھاتے۔

اب ایک اور واقعہ سنیئے۔ اینگلو عربک سکول اجمیری دروازہ میں یوم دردؔ کا مشاعرہ ہونا قرار پایا۔ طرح کا مصرع بھی خواجہ میر دردؔ کا ہی تھا۔ دو چار روز میں ایک مقفا و مسجا غزل کہہ کر استاد کو بغرض اصلاح سنائی۔ انھوں نے غزل کی بے حد تعریف کی یہی نہیں بلکہ اپنے برابر والوں میں مثلاً ساحر صاحب علامہ کیفی اور والدہ وغیرہ، جس سے بھی ملے فرمایا کہ خارؔ نے بہت عمدہ غزل کہی ہے۔ ان حضرات نے شدہ شدہ مجھ سے ذکر کیا کہ تمہارے اُستاد تمہاری غزل کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ ایک دن جب میں شام کو اُستاد کے ہاں حاضر ہوا تو میں نے یونہیں چھیڑ سے کہہ دیا کہ آپ ہر ایک سے میری غزل کی تعریف کر کے کیوں مجھے بنا رہے ہیں۔ یہ کہنا تھا کہ ایک دم سنجیدہ ہو گئے اور فرمایا کہ میں تجھ سے غزل بدلنے کو تیار ہوں۔ اللہ اللہ کیا ظرف اور فراخ دلی اور کیسی شفقت تھی۔ اس سے بڑھ کر اور مجھے کیا داد مل سکتی تھی میں نے جھک کر سلام کیا اور معافی چاہی۔

میں نواب صاحب کا چہیتا شاگرد اور بھتیجا ہونے کی حیثیت سے بہت سر چڑھا بھی تھا۔ ع کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ۔ جو منہ میں آتا کہہ دیتا تھا اور وہ سن کر مسکراتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ چچی جان آپا قدسیہ کے پاس لاہور گئی ہوئی تھیں۔ جب میں شام کو چچا کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمایا کہ بیٹا اپنی چچی کو خط لکھ دے۔ میں نے میز پر سے پیڈ اٹھایا اور جیب سے قلم نکال کر کہا کہ جی ہاں فرمائیے۔ چچا لگے خط کا مضمون بولنے۔ میں نے کاغذ قلم ہاتھ سے رکھ دیا۔ چچا تعجب سے دیکھ کر بولے کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ جناب خط لکھوانے کی طرح لکھوائیے تو لکھوں۔ کہا "مطلب" میں نے کہا کہ صاحب یہ خط لکھوانے کی کیا ترکیب ہے کہ نہ القاب نہ آداب اور لگے آپ خط کا مضمون بولنے۔ کہا کہ کیوں بوڑھے آدمی سے چہل کرتا ہے۔ میں نے کہا جانے دیجئے، کسی اور سے لکھوا لیجئے گا، مجھ سے تو ایسا خط نہ لکھا جائے گا۔ دم بھر توقف کے بعد فرمایا کہ اچھا لکھو "رفیقہ دیرینہ" میں نے جھک کر سلام کیا اور خط لکھنا شروع کر دیا۔ اکثر و بیشتر ایسے چونچلے ہوتے رہتے تھے اور میرے علم میں اضافہ بھی۔

شفقت اور محبت کی بات چلی ہے تو سنئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران جنوری ۱۹۴۲ء

میں میرا تبادلہ کلکتہ ہوگیا۔ وہاں کی حالت ان دنوں ناگفتہ بہ تھی۔ جب نواب صاحب اور چچی کو بتایا تو بہت اداس ہوئے۔ روانگی سے ایک روز قبل جب میں ملنے گیا تو دونوں آبدیدہ ہو گئے۔ چچی نے امام ضامن بازو پر باندھا اور دونوں نے ہزاروں دعائیں دیں۔ وہاں سے رخصت ہوکر ابھی گھر پہنچا ہی تھا کہ پیچھے پیچھے ملازم ایک مخمل کا بٹوا جس میں کچھ روپے تھے اور ایک پرچہ لے کر آیا۔ پرچہ میں چچی نے لکھا تھا کہ یہ بٹوا اور روپے تمہارے ناشتے کے لیے بھیج رہی ہوں یہ شفقت مادرانہ اب کہاں نصیب۔ ایسے بیسیوں واقعات ہیں کہاں تک بیان کروں۔

جب میری شادی ہوئی تو برأت کی دلی واپسی پر چچا نے دہلی جنکشن پر استقبال کا پورا انتظام کروایا۔ بڑے صاحبزادے مرزا قطب الدین فصیح مع دیگر احباب کے بینڈ اور سواری وغیرہ کے معقول انتظام کے ساتھ موجود تھے۔ اگلے دن قبلہ چچا جان خود گھر پر تشریف لائے اور بہو کو ایک تہرہ طلائی چھلا عطا فرمایا۔ دو چار روز بعد چچی بھی نئی دلہن کو دیکھنے آئیں۔ میرا کمرہ ڈیوڑھی میں گھستے ہی دائیں جانب کو تھا۔ وہیں رک گئیں۔ اب لطف کی بات سنیئے۔ میری بیوی نے کھڑکی سے جو صحن میں کھلتی تھی اپنی خوشدامن یعنی والدہ کو آواز دے کر کہا کہ اماں، بیگم صاحب آئی ہیں۔ یہ سنتے ہی چچی تلملا اُٹھیں اور نئی بہو کے وہ لتّے لیے کہ رہے نام سائیں کا۔ فرمایا "چچی" کہتے زبان دکھتی ہے "بیگم صاحب" آئی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

چچی جان کا بھی کیا کہنا۔ تھیں آخر مرزا داغ کی بیٹی۔ یہ اُستاد کی وفات سے کوئی تین، چار سال پہلے کی بات ہے ایک دن میں جب شام کو حسب معمول لال دروازے پہنچا تو قبلہ نے فرمایا کہ ایک تازہ غزل ہوئی ہے۔ میں نے کہا مرحمت فرمایئے اور نواب صاحب نے غزل پڑھنی شروع کی۔ ہم لوگ صحن کے دائیں جانب جو چچا کا کمرہ تھا اس میں بیٹھے تھے اور چچی اندر دالان میں تخت پوش پر بیٹھی امور خانہ داری میں مصروف تھیں مگر کان ان کے بھی اِدھر ہی لگے ہوئے تھے۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ غزل کچھ پھس پھسی تھی۔ مگر ہم تو اُستاد کی خاطر سے واہ واہ کر رہے تھے۔ مگر بڑی بی کو کہاں تاب۔ دو چار شعر تک خاموش رہیں اور پھر بھنّا کر اپنی جگہ سے اُٹھ کر آدھمکیں۔ دفعتاً میری کرسی کے پیچھے سے آواز آئی "خار" میں نے پلٹ کر دیکھا تو چچی کھڑی ہیں بھویں تنی ہیں۔ اور تیور بگڑے ہوئے۔ میں نے دست بستہ عرض کیا کہ حضور کیا حکم ہے۔ بولیں۔

"میاں" یہ تمہارے "چچا" اسی سے اوپر عمر ہوگئی، لنگڑے ہوگئے۔ لُولے ہوگئے، آنکھوں سے سجھائی نہیں دیتا، معشوق سامنے آئے تو "گدھی" معلوم ہو، یہ شعر کیا کہتے ہیں یہ سن کر میرا تو ہنسی کے مارے بُرا حال ہوگیا۔ پیٹ میں بل پڑ گئے "لوٹن کبوتر" ہوگیا۔ اور چچی ہیں کہ ڈٹی کھڑی ہیں۔ کچھ وقفہ کے بعد میں نے اپنے کو قابو میں کیا اور نواب صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ "حضور چچی جان کیا کہہ رہی ہیں۔ غزل بیٹنگ پھسی پھسی سہی مگر تھے تو چچا بھی سلجھے ہوئے فرمایا کہ بھئی یہ "استاد زادی" ہے اسے اختیار ہے، جو چاہے کہے۔ اور چچی زیرِ لب مسکراتی ہوئی واپس دالان میں جا بیٹھیں۔

ایک مرتبہ میں چچی کے پاس بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ کہنے لگیں "خار" تو کیا پنڈت ہے تجھے ہمارے ہاں کھانے پینے میں کوئی پرہیز نہیں۔ میں نے جواب دیا کہ میں کوئی کچا پنڈت نہیں کہ کہیں کھانے پینے سے میرا دھرم بھرشٹ ہو جائے۔ نیز چھیڑ سے یہ بھی کہا کہ اگر ہیرا مٹی میں گر جائے تو ہیرا ہی رہیگا، کنکر تو نہیں ہو جائے گا۔ مسکرائیں اور بولیں کہ "اچھا حرام زادے" "تو تو ہیرا ہے اور ہم مٹی" میں نے عرض کیا کہ آپ نے یہ مذکور نکالا۔ میں نے تو مثال کے طور پر ایک بات کہی۔ غرضیکہ ہنسی کی بات کی تھی ہنسی میں ٹل گئی۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ آیئے اب موضوع کی طرف واپس آئیں۔ یہاں یہ بیان کرنا بھی لطف سے خالی نہ ہوگا کہ نواب سائل اور ان کے دہلوی برادرانِ خواجہ تاش میں ادبی چشمکیں اور اُستاد داغ کی جانشینی کے سلسلے میں نوک جھونک بھی چلتی رہتی تھی۔ سائل کہتے ہیں ؎

ہمیں ہیں جانشینِ داغ ہم کو ماننا ہوگا　　جنابِ داغ کے داماد ہیں ہم دلی والے ہیں

اُدھر حضرت بیخود اور آغا شاعر قزلباش بھی جانشینی کا دعویٰ کرتے رہے۔ اکثر ان حضرات کے تلامذہ میں بھڑنت ہو جاتی تھی۔ تاہم اِن بزرگوں کے نجی تعلقات کافی خوشگوار رہے۔ حالانکہ بیخود صاحب نواب سائل کے پیٹھ پیچھے گالیاں دیتے تھے اور برائی بھلائی کرتے تھے مگر نواب صاحب کی زبان پر کبھی کوئی نازیبا کلمہ نہیں آیا وہ ہمیشہ بیخود صاحب کی تعریف ہی کرتے تھے۔ سبحان اللہ کیا اخلاق تھا اور تہذیب کہ کبھی کسی مردِ بشر کی برائی ان کے منہ سے سنی ہی نہیں۔

قبلہ سائل صاحب کی ادبی حیثیت اُن کے برادران خواجہ تاش میں بالخصوص اور دیگر حلقوں میں بالعموم کیا تھی وہ ذیل کے اقتباس سے ظاہر ہے جو رسالہ "شاعر" کے اکتوبر ۱۹۳۶ء کے شمارے سے

ماخوذ ہے۔ علامہ سیماب اکبرآبادی رقم طراز ہیں " محترم نواب سائل دہلوی کئی حیثیات سے آج ہندوستان کے ممتاز شاعر مانے جاتے ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ دہلی کے موجودہ شعرا میں سب سے زیادہ معمّر ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ نواب فصیح الملک حضرت داغ کے خویش ہیں تیسرے یہ کہ اُس خاندان کے ہیں جس کی زبان بالاتفاق جمہور مستند مانی گئی ہے۔ چوتھے یہ کہ وہ ہندوستان کے اکثر مشاہیر شعرا کے ہم نشین رہے ہیں اور اُردو زبان انھیں کے خاندان یا گھر کی کنیز ہے۔

ایک ایسے جامع کمالات بزرگ کے کلام پر تبصرہ کیا جسے عمر اور طوالت مشق نے خود ایک بے عدیل مبصر بنا دیا ہے۔

برادرم مکرم حضرت سائل دہلوی شعرائے سلف کا ایک اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اُن پر شاعری پھبتی ہے اور انھیں دیکھ کر اسلاف کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

حضرت سائل کی زبان وہی ٹکسالی ہے جس کا سکّہ آج تمام ملک میں جاری ہے۔ سلاست اور روزمرہ ان کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے محاورات کا انضباط مرزا داغ مرحوم کی طرح ان کے یہاں بھی ہے لیکن حضرت سائل خیال کی بلندی اسلوب کی شگفتگی اور زبان کی سلاست میں اپنے تمام برادرن خواجہ تاش میں ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ موسیقی ان کے یہاں لفظ سے پیدا ہے۔ روانی کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ اور مضمون آفرینی تو شمہ بمقدار علم کے مطابق سائل صاحب کا حصہ ہے اس پیرانہ سالی میں بھی تحقیق الفاظ و محاورات کی عادت باقی ہے اور آپ اس وقت دنیائے ادب میں ایک معتبر اور مستند مفتی ادب" کا درجہ رکھتے ہیں۔ میری دانست میں تو آپ کا یہ درجہ آپ کی شاعری سے بھی بلند ہے۔ فصیح الملک مرحوم کے بعد ان کے کام اور نام کو زندہ رکھنے کا سہرا ابو المعظم حضرت سائل دہلوی کے سر سب سے پہلے ہے اور اس کے بعد دوسروں کے۔ خدا اس پیر میکدۂ سخن کو میکدۂ سخن کے قیام تک باقی رکھے۔"

حضرت نوح ناروی اپنی تعزیتی نظم میں فرماتے ہیں:

قولِ فیصل حسب موقع یاد کیا کیا آئے گا۔ جو پڑے گی بحث اُسے کیونکر کوئی سلجھائیگا
کس کی تحقیقات پر فکر رسا اِترائے گی کس کی بولی مستند عالم میں مانی جائے گی

نواب صاحب کی تصانیف میں محض ایک پمفلٹ "پارہ گلکول" نامی بہ ہزار دقت دستیاب

ہوتا ہے جس میں صرف دو نعتیں اور آٹھ نو غزلیں ہیں۔ جب کہ آپ کا سرمایۂ شعری ایک لاکھ اشعار سے بھی زائد ہوگا۔ آپ کے کلام میں غزل، مثنوی، قصیدہ اور قومی و ملی نظمیں سب ہی کچھ ہیں۔ آپ نے چھ قلمی دیوان اور ایک ناتمام طویل مثنوی جو خاندانِ مغلیہ کی تاریخ اور بالخصوص جہانگیر اور نور جہاں کے حالاتِ عشق پر مبنی ہے، یادگار چھوڑی۔ لیکن یہ سب کلام زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر شائقین تک نہ پہونچ سکا۔

سائل صاحب کا حلقۂ تلمذ نہایت وسیع تھا۔ جن میں چند نام یہ ہیں:

نہال سیوہاروی، اختر دہلوی، غافل امروہوی، محشر امروہوی، صابر دہلوی، شاکر دہلوی، مولانا وفا دہلوی، حافظ دہلوی، نعیم دہلوی، مولانا واصف دہلوی، حکیم نادر دہلوی، نادر دہلوی، شیر سنگھ ناز دہلوی، غمگین دہلوی، کیف دہلوی، مولانا امداد صابری، کامل نظامی، نادر سہارنپوری اور یہ خادم خار دہلوی۔

یہ داستان کچھ زیادہ ہی طولانی ہوگئی مگر حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ اُستادِ محترم کے بارے میں وضاحت سے لکھنے کے لیے دفتر کے دفتر درکار ہیں۔ انقلاب زمانہ ہر انسان کو بدل دیتا ہے جس دلی نے جوانِ رعنا سائل کا بانکپن دیکھا اُس دلی نے یہ بھی چشم عبرت سے دیکھا کہ کولھے کی ہڈی ٹوٹ جانے کے بعد بوڑھے اور معذور سائل رکشا پر بیٹھ کر روزانہ ایک چکر اُردو بازار کا لگاتے۔ ملنے والوں والوں سے اس طرح مل لیتے۔ اپنی حالت پر خود روتے اور دوسروں کو رُلاتے۔ لیکن اس عالم میں جب انھوں نے آخری مرتبہ ہارڈنگ لائبریری کے مشاعرے میں غزل سنائی تو باوجود ضعف و نقاہت کے ان کی آواز کی دلکشی جوں کی توں تھی۔ غزل کا مقطع سائل صاحب نے حسب حال کہا تھا۔ اُن کی سوز بھری، رسیلی اور مترنم آواز ابھی تک کانوں میں گونج رہی ہے ؎

پکڑ لائے سائل کو بزم سخن میں
بنی اُس کے دم پر یہاں آتے آتے

آخر ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء مطابق ۸ شوال ۱۳۶۴ھ کو کاشانۂ نیر کی یہ ٹمٹماتی شمع بھی گل ہوگئی۔ جہاں آباد کا وہ آخری شاعر بھی اُٹھ گیا۔ جس کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا تھا کہ ہاں ابھی ایک شاعر دلی میں ایسا ہے جو میر و غالب کی بساطِ ادب کا ہی مہرہ معلوم ہوتا ہے۔ سائل کے ساتھ وہ اقدار ختم ہوگئیں جن کی بدولت دِلی دِلی تھی۔ جنازہ مہرولی لے جایا گیا اور درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین کاکی میں اندرونِ صندل خانہ

اپنے چچا اور دادا کے قریب اس علم وادب کے آفتاب عالمتاب کو خاک میں چھپا دیا گیا۔ یہ بدنصیب بھی وہاں اپنی نظروں سے وہ پُرہول منظر دیکھتا رہا اور بجز دھاڑیں مار کر رونے کے کچھ نہ کرسکا۔ اُستاد کی وفات کا میرے دل پر اتنا صدمہ ہوا کہ میں اُس کے بعد مہینوں بیمار رہا۔ صحت یاب ہونے پر بھی مشاعروں میں شرکت بہت کم کردی۔ رہی سہی کسر ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں نے پوری کردی جس نے اس ناچیز کو گوشہ گیری پر مجبور کردیا۔

اس مضمون کو میں اپنے اُس قطعہ پر ختم کرتا ہوں جو میں نے محترم چچا جان کی وفات پر کہا تھا:

قطعہ

سائلؔ جادو بیاں، شیریں زباں، رنگین سخن
جس کے دم سے تھیں تروتازہ روایاتِ کہن

جس پہ دلّی ناز کرتی تھی وہ ہستی مِٹ گئی
خارؔ کے دل سے کوئی پوچھے یہ بستی مٹ گئی

ٔٔ

عبدالعزیز
شعبۂ اردو۔ ذاکر حسین کالج۔ دہلی

قاری سرفراز حسین عزمی دہلوی

پیدائش۔ ۱۸۶۷ء ——————— وفات ۲۰ر جون ۱۹۳۴ء

کمرے میں پھوپھی اماں اور جملہ افراد خانہ گھریلو کام میں مصروف ہیں۔ دالان میں اشرف حسین اشرف کورگانی، راشد اظہری اور سرفراز حسین بیٹھے ہیں نت نئی شرارتیں کر رہے ہیں۔ آتے جاتے افرادخانہ کو کنکھیوں سے دیکھتے ہیں اور پھر کوئی پھبتی دھیمی آواز میں سنائی دیتی ہے۔ پھوپھی اماں بطور خاص ان بچوں پر نظر رکھے ہیں، کہ سرفراز ان میں بڑا شیطان ہے۔ ڈپٹی[۱] صاحب اپنے کمرے میں آرام فرما رہے ہیں اور بشیر[۲] بھائی باہر تخت پر بیٹھے ہیں انھیں سرفراز سے بہت محبت ہے۔ اور سرفراز بھی بے باک تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ دھوبن آئی،

لاؤ جی، کپڑے دیدو، اور یہ اٹھاؤ اپنی گھڑی، گن لو، اور اچھی طرح دیکھ لو،

پھوپھی اماں نے، دھلے ہوئے کپڑوں کی گٹھری کھولی اور شمار کرنا شروع کیا۔ ایک لڑکی، کپڑوں کی تفصیل بتاتی جاتی ہے، پھوپھی اماں نے اسی دوران آواز لگائی، بی بی، دھوبن آئی ہے، ڈپٹی صاحب کے کمرے سے ان کے کپڑے لے آؤ، گھر کے سب میلے کپڑے گن دو، دوسری سے کہا، اس کو

---

[۱] ڈپٹی نذیر احمد [۲] بشیر احمد دہلوی [۳] مرزا محمد اشرف گورکانی

کچھ کھانے کو دیدو، من بھر کی گٹھری اتنی دور سے لائی ہے، جان نکل گئی ہوگی۔ دھوبن کے لئے میلے کپڑوں کی گٹھری باندھ کر، بی بی نے دالان میں ڈال دی۔ سرفراز نے نظر بچتے ہی، بڑی سِل اٹھا کر گٹھری میں باندھ دی، اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ معصومیت سے بیٹھ گیا، دھوبن نے کھا پی کر، گٹھری اٹھائی تو اٹھائے نہ اُٹھی، بے چاری زور لگا لگا کر اُٹھاتے اُٹھاتے، ہلکان ہوگئی، اشرف گورگانی سے ضبط نہ ہوسکا، ہنسی چھوٹ گئی، اور بھانڈا پھوٹ گیا۔ اب کیا تھا! دھوبن نے وہ فیل مچایا، ایسی بکھری کہ قابو میں نہ آئی، بات بڑھی کہ ڈپٹی صاحب تک پہنچی، چاروں کی طلبی ہوئی، مگر شیطان اپنا کام کر کے کسی دوسرے شکار کے لیے روانہ ہوچکے تھے سرفراز کا پورا نام قاری سرفراز حسین تھا، غدر کے دس سال بعد دلی کے ممتاز عالم دین، اور شاہ ظفر کے مقرب خاص محمد برکت اللہ کے گھر میں پیدا ہوئے۔ والدہ شاہ ظفر کے رسالدار عبدالخالق کی بیٹی تھیں۔ رسالدار صاحب بھی شاہ ظفر کے قریبی حلقے سے تعلق رکھتے تھے۔ شاہ ظفر کی سلطنت ختم ہوچکی تھی۔ ہندا سلامی تہذیب کی آخری شمع بجھ چکی تھی۔ وطن عزیز میں اجنبی حاکم کا سکہ چلتا تھا قلعہ پر یونین جیک لہرا رہا تھا۔ سرسید احمد خاں علی گڑھ میں جدید ہندستان کی شخصیت کی تعمیر میں معروف تھے دلی کالج برباد ہوچکا تھا۔ اینگلو عربک اسکول میں حالؔی مدرسی کر رہے تھے۔ اسی دور میں سرفراز نے مڈل کلاس یہاں سے پاس کی اور حالؔی کا دل موہ لیا۔ ذہانت ظرافت شرارت، متانت۔ ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی، مڈل کلاس کے بعد گورنمنٹ اسکول سے انٹرنس پاس کیا، ہر سال دو کلاسیں پاس کیں۔ شخصیت کی تعمیر میں معاصر معاشرتی تہذیبی رجحانات کا عمل بہت کارگر ہوتا ہے۔ اس کے اثرات تاحیات رہتے ہیں۔ گھر کے علاوہ سرفراز نے محلے کی استانی اور ان کی بیٹی سے قرآن شریف پڑھا اور اس قدر عورتوں میں گھل مل گئے کہ کنبہ اور خاندان میں بھی عورتوں سے زیادہ اور مردوں سے کم مانوس تھے۔ دادا دادی اور نانا کا انتقال ہوچکا تھا۔ استانی کے علاوہ والدہ اور نانی کی تربیت نے ان کی شخصیت پر خوشگوار اثر ڈالا۔ اور مشرقی علوم واخلاقیات کی مثالی اقدار اس نٹ کھٹ کی شخصیت میں جڑ پکڑ گئیں۔ اسی زمانے میں شاعری کا لپکا ہوا۔ اور خاموشی سے طبع آزمائی کرتے رہے۔ رضیؔ[1] کا خط ملا تو منظوم جواب دیا، یہی نقش اوّل بھی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

---

[1] شفاء الملک حکیم محمد رضی الدین احمد خاں صاحب

ہم کو پہونچا رنمی تمہارا خط — گوہروں سے بھرا تھا سارا خط

دیکھ پیغام وصل، اس نے — کردیا سارا پارا پارا خط

اس بہانے سے دیکھوائے قاصد — پڑھتے جانا میاں، ہمارا خط

بعدازاں سیف الحق ادیب سے تلمذ کیا۔ اور عزتی تخلص کیا۔ تشنگیٔ علم سے شکست کھاکر، ملازمت پر ٹھوکر ماری اور سرسید کے علی گڑھ کالج میں داخلہ لیا۔ سرسید کی آنکھیں دیکھیں تھیوڈو مارسین۔ مسٹر بک۔ ڈاکٹر آرنلڈ، مولانا شبلی سے تعلیم پائی۔ اپنی ذہانت شرارت اور پارہ صفتی کے سبب استادوں کی آنکھوں کا تارا اور یاروں کے دلوں کی دھڑکن بن گئے۔ چنانچہ مارسین کو اُردو پڑھائی۔ انہی کے مشورے سے گورنمنٹ کے مقابلۂ امتحان میں شرکت کی اور پالا مارا۔ استادوں کے حکم سے علی گڑھ کالج چھوڑ، ملازمت اختیار کی۔ مولانا شوکت علی جو قادری سرفراز حسین کے رفیق کالج تھے لکھتے ہیں۔

"آپ سے ملاقات نہیں ہے۔ مگر میں ان کی لفظی تصویر کھینچ دوں اگر آپ پس پردہ بیٹھے ہوں اور مسٹر سرفراز حسین اور ہم باہر اور ہم ہیں سے۔ کوئی پرانے علی گڑھ کا ذکر چھیڑ دے تو تھوڑی ہی دیر میں بلبل چہکنے لگے گا، یا یوں کہیے کہ گراموفون میں ایک سے ایک نیا ریکارڈ نکلے گا۔ کبھی ہنسی اور مذاق تھا کبھی پھکڑ کبھی شاعری، کہیں پرانی شرارتوں کی حکایات، کبھی گانا اور گاکر پورے بھاؤ بتانا، غرض عجیب سماں ہوگا اگر پس پردہ میں آپ سے پوچھوں کہ کہیے حضرت کیا رائے ہے؟ آپ ضرور فرمائیں گے رائے، آدمی مزیدار ہے، مگر دلی کا چھٹا ہوا شہدا۔ بالکل سچ ہے۔ سرفراز حسین واقعی ایسا ہے صوفی منش آدمی ہیں دل میں عشق مجازی اور عشق حقیقی کوٹ کوٹ کر بھرا ہے علی گڑھ کی اصطلاح میں "فیشن نژاد" دل پھینک ہے۔ مگر رائے جلد قائم نہ کیجئے۔ ذرا ٹھہریئے۔ یا تو یہ ہنسی غل غپاڑہ ہنسی دل لگی تھی۔ یکایک ہمارے دوست کا چہرہ بدلا آنکھوں میں شعلیں روشن ہوگئیں۔ مقناطیسی قوت کا اثر، ہم کھلنڈروں پر پڑا اور سب غل غپاڑہ غائب ..... ہمارا دوست ہم سے اسلامی اخلاق پر گفتگو کررہا ہے۔ خدا نے زبان میں وہ تاثیر دی ہے کہ سبحان اللہ"[1]

---

[1] علی گڑھ کے کھلنڈرے۔ مولانا شوکت علی۔ منقول از تذکرۂ قادری صفحہ

سرفراز اب قاری سرفراز حسین کے نام سے معروف ہیں ملازمت کے سلسلہ میں میرٹھ گئے۔
وہیں تصنیف وتالیف اور تصوف کے تقابلی مطالعہ کا شوق ہوا۔ ۹۷-۱۸۹۶ء میں تین اصلاحی ناول
سعید، سعادت، شاہد رعنا لکھے۔ ان ناولوں کے موضوع طوائف اور طوائف پرستوں کی اصلاح ہے۔
اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ رسوائے امراؤ جان کا کردار شاہد رعنا کی ننھی جان سے لیا ہے۔ شاہد احمد دہلوی
نے شاہد رعنا کو امراؤ جان ادا پر اولیت دی ہے۔ میرٹھ کے قیام کے دوران چشتیہ نظامیہ سلسلے کے
بزرگ مولانا احمد حسینؒ صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ساتھ ہی تصوف کے تقابلی مطالعے پر توجہ
کی۔ ایک سادھو سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ گیرو الباس پہننے لگے بغیر غسل کئے، کھانا نہ کھاتے تھے
اطوار بھی سنیاسی بنالئے، اور کھانا بھی وہ کھاتے تھے، جسے برہمن ست گنی بھوجن کہتے ہیں۔ بیوی سکینہ
بیگم، معروف جید عالم، مولوی محمد عظیم کی بیٹی، سیدھی سچی مثالی بیوی، شوہر کی حالت سے سخت پریشان،
راتوں کو اٹھ اٹھ کر نوافل پڑھتیں گھنٹوں سجدے میں پڑی رہتیں، منتیں مانتیں، کہ اللہ میرے
سہاگ کو سیدھی راہ دکھا، کیا ہو گیا۔ قسمت کو کیسا گھن لگ گیا۔ یا اللہ یہ کیسی آزمائش ہے۔ اللہ اللہ
کر کے سادھو کا اثر کم ہوا اور تبلیغ اسلام کی طرف رجوع ہو گئے۔ امریکہ کے رسائل میں اسلام
کے مختلف موضوعات پر تبلیغ کی غرض سے مضامین شائع کرائے۔ متھرا میں مذاہب
عالم کی کانفرنس میں اسلام پر تقریر کی اور دھوم مچادی مگر دلی کے دل والے، جملے باز پھبتی اور
افعال کی روشنی میں نام رکھنے سے کہاں چوکتے ہیں، یاروں نے ان کا نام "محمد آنند" رکھ دیا۔
شاہد احمد دہلوی نے قاری سرفراز حسین عزمی کی ادھیڑ عمری کی تصویر کاری ان لفظوں میں
کی ہے:

> "آدمی بڑے کلے ٹھلے کے تھے۔ دوہرا ڈیل، کسرتی بدن، سر پر کرسٹی کی ترکی ٹوپی،
> کالا فراک کوٹ، سفید پتلون پاؤں میں ڈاسن کا کالا شو، دائیں ہاتھ میں چھڑی، بائیں
> ہاتھ میں سفید دستانے، گول چہرہ، گیہواں رنگ، کشادہ پیشانی، ستواں ناک موزوں
> دہانہ، کتروان مونچھیں، مختصر سی خوشنما داڑھی، آنکھوں پر سنہرا فریم جس میں ان کی ذہین
> آنکھیں چمک دمک دکھاتی رہتی تھیں خوش کلام زندہ دل"[1]

[1] یاد رفتگاں شاہد احمد دہلوی منقول از تذکرہ قاری

زندہ دلی کی ایک مثال اور سنئے، سجاد حیدر یلدرم سے بے تکلفی تھی وہ ترکی کے لیے روانہ ہوئے

لیکن کسی وجہ سے بیچ راہ سے لوٹ آئے، قاری سرفراز حسین جھوم اُٹھے اور نظم لکھی :

آ گئے سجاد حیدر آ گئے   آ گئے قند مکرر آ گئے

کیوں گئے تھے کیا کیا کیوں پوچھیں ہم   ہم تو یوں خوش ہیں کہ پھر کر آ گئے

اسی مضمون پر ایک اور نظم لکھی :

مبارک ہو سفر سے واپسی سجاد حیدر کو

ہمیں کیا گھورتے ہیں کوسئے اپنے مقدر کو

مذاق میزباں میں لکھ دیا قاری نے یہ مصرع

"پچھتر" کو "چھہتر" کو "ستتر" کو، "اٹھتر" کو

تبلیغ اسلام کے لیے جاپان گئے ناگا ساکی میں بودھ مندر میں تقریر کی۔ روانگی کے وقت

احباب نے مزاحیہ قصیدہ لکھا، ایک شعر سنئے ؎

اک انگلی ناک پر اک کان میں

قاری یوں دیجو اذاں جاپان میں

قاری کی تصانیف بے شمار ہیں۔ ادب اخلاقیات۔ اسلامیات مناظراتی ادب، تصوف کا تقابلی مطالعہ اور ہندوستانیوں کے معاشی بدحالی کے اسباب سے متعلق۔ تقسیم کے ہنگامے میں پوری لائبریری برباد ہوئی، اس میں سانیات اور قاری کی سوانح "تذکرہ قاری" بھی تلف ہو گیا جس کی وجہ سے قاری کی خدمات کے اعتراف کے بیشتر حوالے ختم ہو گئے۔ غدر کے ہنگامے سے دلی کی عظمت کی نشانیاں جو، ہندوستان کے شمالی تھیں خاک ہو گئیں، وہ دلی جو اوراق مصور تھی، ان اوراق کو معاشی بدحالی اور تہذیبی قومی زوال کا گھن لگ گیا تھا ہم جس عہد کی شخصیت کو یاد کر رہے ہیں، اس دور میں اوراق مصور کی شوخی اور ہنرمندی کی رمق باقی تھی۔ یہ اوراق زرد سوکھے پتے کی مانند تھے، ہوا چلتی تھی تو ٹوٹتے اور اڑنے کی آوازے ان کے وجود کا احساس ہوتا تھا۔ امیری فقیری کے لبادے میں تھی اور پر رونق حویلیاں سناٹے کا مسکن بنتی جا رہی تھیں۔ امیروں کی ایک جیب میں بادام کشمش اور دوسری جیب میں چنے ہوتے تھے۔ ایک وضعداری کا پاس دوسری حقیقت کا اعتراف۔ طوائف کا ادارہ باقی تھا۔

تصوف کے آخری چراغ جھلملا رہے تھے۔ داستان سرائی مرثیہ خوانی، قوالی عام تھی۔ جامع مسجد کے شاہی دروازے کے قصہ گو اور نوابین کے ملازم داستان گو فاقہ کشی کا شکار تھے، مارکس نے ہندوستان میں جس نئے طبقے کے ذریعہ انقلاب رونما ہونے کی بشارت دی تھی، وہ طبقہ رفتہ رفتہ ہندوستان، خصوصاً دلی کے منظرنامہ پر ابھر رہا تھا۔ قاری سرفراز حسین مشرق و مغرب کی اقدار سے آگاہ اس نئے دور کے آغاز میں ہندوستانی اسلامی تہذیب اور مذہب اسلام پر جارحانہ حملوں کا جواب دے رہے تھے۔ سماجی جدوجہد کا ابتدائی دور اور علم کی تشنگی سے معمور عہد قاری سرفراز حسین پیدا کرتا ہے۔ سرسید حالی شبلی پیدا کرتا ہے۔

قاری پرمغز، خوش کلام شاعر تھے۔ کالج میں اور ملازمت کے دوران شاعری کی۔ مشاعروں میں بھی شرکت کی۔ چند اشعار نمونتاً پیش ہیں۔

یہ آنکھوں میں ہے صبح سے نیند کیسی،
ادھر کو تو دیکھو، میں کیا پوچھتا ہوں

ذرا آنچل اٹھا دو، اپنے رخ سے تم، تو چھپ جائیں
یہ واعظ اپنی مسجد میں، یہ پنڈت اپنے مندر میں

یہ آخر بھید کیا ہے، مرحبا کیوں، لب پہ جاری ہے
رگ جاں سچ بتا دے، کیا مزہ تھا نوک نشتر میں

رگِ جاں ساز کرتی ہے کبھی اس سے کبھی اس سے
مضراب چھیڑے گی، نوکِ مژگاں اور نشتر میں

قلندر لامکاں پہنچا کہ وہ آزادِ مطلق تھا
لٹک کر رہ گیا زاہد، بچارا خیر اور شر میں

ہمارے کعبۂ دل میں بتوں کا دور دورہ ہے
کہیں دیکھی بھی ہیں، یہ بدعتیں اللہ کے گھر میں

کوچے سے ان کے، اپنا نکلنا رہے گا یاد
دل سرد، لب پہ آہ وفغاں، بیکسی کی چال

آبلہ پائی میں ہوتا کون، مجنوں کا رفیق
منتیں کرنی پڑیں، آخر کو نوکِ خار کی

دل ہے مقام میرا آنکھیں ہیں میری محمل
عاشق کی آرزو ہوں معشوق کی حیا ہوں

لو اُٹھ کے آرہے ہیں وہ بزم رقیب سے
آنکھوں میں نشہ، لب پہ ہنسی بیخودی کی چال

کھُلے بندوں کیا کرتی ہیں چوٹیں، چوڑیاں ان کی
چھپانے سے کہیں چھپتے ہیں، افعی آستینوں میں

جناب عشق کو تھی جستجو غارت گرِ دل کی
شعاع حسن بول اٹھی کہ جی میں برق خرمن ہوں

قادری کی ذہانت، ظرافت ذوق مجلسی، خوش کلامی کا دُور دُور شہرہ تھا، جس محفل میں جاتے، میر محفل وہی ہوتے، حکیم مسیح الملک اور نواب رامپور کی مجلسیں انہی کی بذلہ سنجیوں سے

شگفتہ تھیں۔ روتے آدمی کو ہنسا دیتے تھے۔ ایسے لطیفہ گو اور حاضر جواب کم ہوتے ہیں۔ گرمیوں کی تعطیلات میں مسوری گئے ہوئے تھے، ایک رئیس بھی وہاں آئے ہوئے تھے۔ قاری سرفراز حسین کا نام سنا تو خدمتگار کو دوڑایا کہ نواب صاحب کی محفل میں شرکت کیا کریں، احسان ہوگا۔ جواب انکار میں ملا۔ دوبارہ آیا، اور ناکام واپس ہوا۔ اُدھر اصرار بڑھتا جاتا تھا، ادھر انکار کی شدت، تنگ آکر قاری نے کہلا بھیجا، سو روپیہ گھنٹہ لوں گا، رئیس کوئی بگڑا دل تھا، فوراً بلالیا۔ روزانہ دو سو روپیہ لیتے رہے اور انجمن اسلامیہ کو بھیجتے رہے۔ قاری ان چند ہمہ جہت شخصیات میں سے ایک۔ تھے جو دہلوی مزاج کا بہترین نمونہ کہی جاسکتی ہیں۔ وہ ہندوستان کے پہلے مبلغ اسلام تھے، جو اس غرض سے جاپان انگلستان گئے اور عیسائی مشنریوں کی مانند طریق کار اپنایا۔ ایک روز اخبار میں پڑھا کہ چکاگو میں مذاہب عالم کی کانفرنس میں وویکانند کے لیکچر نے دھوم مچادی اور ایک نوجوان نے اسلام پر لیکچر دیا، جو متاثر نہ کرسکا۔ فوراً کانفرنس کے لیکچرز منگائے، پڑھے اور جواب لکھے، اور انگلستان کے سفر کے لئے تیاری شروع کردی۔ انگلستان کے کیکسٹن ہال میں لیکچر دیا، دھوم مچ گئی لیکچر سن کر ایک خاتون مشرف بہ اسلام ہوئیں۔ ڈیلی مرر، مانچسٹر گارجین لندن ٹائمز نے جلی حروف میں ان کے لیکچرز کی رپورٹیں دیں وہ نٹ کھٹ شریر لڑکا، جس کی ہر حرکت سے لوگ چوکنے رہتے تھے خاندان کے بزرگ ہر وقت نگاہ رکھتے تھے وہ اب بوڑھا ہوچکا تھا۔ زندہ دلی اور خوش مزاجی، گو کہ باقی تھی لیکن قویٰ مضمحل ہونے کے سبب، فالج کا اثر ہوا اور تقسیم سے تیرہ برس قبل دو جون ۱۹۳۴ء کو یہ ہمہ جہت باکمال شخص دارِ فانی سے کوچ کرگیا۔

آہ عزمی سا مفکر اور ادیب بے مثال ہوگیا مجبور کُل من عَلیھا فان سے

حوالہ جات: یادِ رفتہ۔ شاہد احمد دہلوی ۔ قاری سرفراز حسین مرحوم۔ عبدالمجید منیجر ہمدرد دواخانہ۔ ہر فن مولا، پرنسپل مشتاق احمد زاہدی۔ قاری صاحب کی تبلیغی سرگرمیاں منظور حسن نامی۔

ڈاکٹر شریف احمد
شعبۂ اُردو۔ دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

سلام مچھلی شہری

یہ تو کئی سال بعد کی بات ہے، جب فرقت مرحوم کا یہ جملہ، ایک شعر کی طرح، اُردو حلقوں میں چل نکلا تھا:

آپ کا نام ——— سلام
آپ کی شاعری ——— وعلیکم السلام!

اُس سے بھی کئی سال پہلے، ۱۹۶۲ء میں، ایک سرد صبح، آل انڈیا ریڈیو کے ایک کمرے میں میں نے داخل ہو کر کہا تھا: سلام علیکم۔! اور نیلے ملگجے سوٹ میں ملبوس، ایک دوہرے بدن کے شخص نے اکہری آواز میں کہا تھا: وعلیکم السلام۔! اور یہ تھے اُردو کے البیلے شاعر ——— جناب سلام مچھلی شہری۔ اور سلام صاحب ——— جیسے گہری نیند سے کوئی ہڑبڑا کر اُٹھے ——— یک لخت ——— Self Conscious ہو گئے تھے۔ سارے بدن کا زور دونوں کہنیوں پر ڈال کر بولے تھے: "پیارے! مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔ ٹاک (Talk) ہے نا۔ بس، ابھی چلتے ہیں اسٹوڈیو۔ اِک ذرا یہ پیپرز دیکھ لوں ——— دیکھ لوں، نا۔" عرض کیا، ضرور ——— ہاں ٹاک نہیں ہے ——— کتابوں پر تبصرہ ہے۔" سلام نے جلدی جلدی پہلو بدلنے شروع کیے عجیب سی سیمابیت تھی، ان کے پورے وجود پر طاری بڑی سرعت سے انھوں نے ایک سگریٹ اپنے

ترشے ہوئے موٹے سیاہ ہونٹوں میں پھنسا لیا، اور اُن کے ہاتھ ماچس تلاش کرنے لگے۔ میں نے آگے بڑھ کر دیا سلائی سے اُن کا سگریٹ سلگایا اور انھوں نے مسکرا کر کہا: "خوش رہو ___ پیارے!" اور پھر وہ بکھرے ہوئے کاغذات میں کھو گیے۔

اور میں سوچنے لگا ___ اس مردِ آدمی سے میری یہ پہلی ملاقات ہے ___ بالمشافہ۔ مشاعروں میں متعدد بار ضرور سنا ہے۔ پڑھا بھی ہے۔

پڑھ چکا ہوں "نیرنگِ خیال" "ادبی دنیا" "ادبِ لطیف" سے لیکر چمکیلے، رنگین سرورق والے فلمی اور تجارتی رسالوں میں بھی پڑھ چکا ہوں۔ اس کے بوہیمین مزاج کے متعلق سن بھی چکا ہوں ___ لیکن میرے اللہ! یہ تو کوئی چیز ہی اور ہے ___ اور، پھر اس کا ہر جملہ، فقرہ "پیارے" کا تکیہ کیسے لگاتا ہے۔؛ ضرور، کوئی فراڈ ہے۔

اور نہ جانے کب تک میں شعور کی رَو پر بہتا رہتا کہ سلام نے اس زور سے گلا صاف کیا کہ میں اچانک حقیقت کے سنگ لاخ پر آگرا: "بکواس۔ واہیات سخت مکروہ ہے یہ کام! یہ بھی کوئی سروس ہے؟ آؤ، پیارے، چلیں۔ اسٹوڈیو۔" اور چشم زدن میں سارے کاغذات میز کی دراز میں تھے، اور ہم دونوں کمرے کے باہر۔

اور آدھے گھنٹے بعد، ہم کافی ہاؤس میں تھے۔ کیا کرتا، سلام صاحب نے کچھ اصرار ہی ایسا کیا تھا۔ لیکن کافی پینے کے دوران میں، ہم دونوں کو چپ لگ گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے کے بجائے، اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔

"حد ہو گئی، پیارے کچھ بولو" بالآخر سلام صاحب نے فرمایا۔

اب گویا بڑبڑاہٹ کی باری میری تھی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک دم زبان سے نکلا: "سلام صاحب! آپ کی شاعری ...... آپ بہت اچھے شاعر ہیں۔ لیکن۔ لیکن ___ اِدھر بہت دن سے اچھے ادبی پرچوں، سنجیدہ تنقیدی کتابوں میں کچھ چرچا نہیں ہوتا، آپ کا ___" اگر مُنہ سے نکلے الفاظ، واپس آجایا کرتے۔ تو یہ الفاظ میں کسی بھی قیمت پر واپس لینے کو تیار تھا ___ سخت مشکل آپڑی تھی ___ ایک منحرف، آزاد خیال، آزادہ رَو اور روایت کا پرانا باغی شاعر پتہ نہیں، کیا کہہ بیٹھے ___ سلام کی مسکراہٹ بہت لمبی ہو گئی۔ وہ پھر پہلو بدلنے لگے۔ پھر وہ پانی کے

کے گلاس اور کافی کے مگ پر اپنی انگلیوں سے جل ترنگ بجانے لگے۔

"پیارے! شفیق ——"

میں نے لقمہ دیا: "شفیق نہیں شریف —!"

اس سے کیا فرق پڑتا ہے —— چلو، شریف —— میں پوچھتا ہوں،

تم یونیورسٹی میں لکچرر ہو —— میں یونیورسٹی والوں سے بہت ڈرتا ہوں۔ بڑے

اُول جلول لوگ ہوتے ہیں، یہ۔ نہ خود لکھیں، پڑھیں۔ نہ دوسروں کو لکھنے پڑھنے دیں۔ بس علامہ

بنتے ہیں۔ بقراط۔ کیڑے ڈالتے ہیں ہر چیز میں —— پیارے، یہ میں تمہیں نہیں کہہ رہا ہوں میں

تو اُن لوگوں کو کہہ رہا ہوں —— کچھ آتا جاتا نہیں اُنھیں —— اب، یہ دیکھو کہ میں تقریباً ۱۹۳۰ء

سے شعر کہہ رہا ہوں۔ کئی کئی مجموعے میرے چھپ چکے ہیں۔ سراہا بھی ہے لوگوں نے۔ تمہارے

ہندوستان و پاکستان کا کون سا اچھا پرچہ ہے، جس میں، میں نہیں چھپا۔ پھر، شاعری ہی نہیں، ہم

نے (اور یہاں ضمیر متکلم اچانک واحد سے جمع ہو گیا) افسانے بھی لکھے ہیں، ہم نے تنقیدی مضامین

بھی لکھے ہیں) —— اور ڈھیر سارے رُوپک، فیچر، غنائیے، منظوم ڈرامے، ترجمے اور طبع زاد

علاحدہ —— پیارے، ایسا نہیں چلے گا —— ایک کافی اور۔"

اور دوسری کافی آنے سے پہلے اور بعد، وہ یونیورسٹی لکچرر کو، بغیر تیاری کے لکچر دیتے رہے،

"پیارے، غضب ہے غضب۔ ہم روزِ اوّل سے ترقی پسندوں کے ساتھ رہے۔

شاعری میں تبدیلی ہم نے کی۔ روایت سے انحراف ہم نے کیا۔ ہم نے ایک نئی ڈگر نکالی۔ صاف

شفاف، سچی، کھری۔ تجربے، نت نئے تجربے ہم نے کیے۔ جعفری صاحب فرماتے ہیں اپنی کتاب

"ترقی پسند ادب" میں، کہ سلام کے پاس علاوہ ہلکی پھلکی غنائیت، اور ہیئت کے تجربوں کے اور

رکھا کیا ہے —— اچھا، پیارے یوں سہی۔ لیکن، لیکن تم سمجھتے کیا ہو؟ ہم نے واولی ہے مولانا

صلاح الدین سے۔ سمجھے۔ بھئی! کوئی انصاف بھی تو ہونا چاہیے —— اور کتابوں کے تبصرہ نگار

شفیق صاحب (اور میرا نام ان کے ذہن میں پھر بدل چکا تھا)، یہ جو جدیدیت کی لہر کئی سال سے چل

نکلی ہے، یہ بھی عجیب چیز ہے —— بھئی! نئی نظمیں کہتے ہو —— ہماری جیسی۔ نئے شعور اور اک

اور احساس کی بات کرتے ہو، تنہا اور ٹوٹے ہوئے فرد کا ذکر کرتے ہو، اور ہمارا نام نہیں لیتے ——

نہ ، نہ یہ سب گڑبڑ ہے ۔ گھپلا ہے بہت بڑا ــــــ "

سلام صاحب کچھ رُکے ہی تھے کہ میں نے موقع سے فائدہ اُٹھایا :

" یہ سب ٹھیک ہے سلام صاحب ! انصاف وقت کے پاس ہے ۔ ذہانت اور ٹیلنٹ Talent کو ہمیشہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ۔"

اور سلام صاحب پر اس لکچرارانہ حربے کا بھرپور اثر ہوا ۔ انھوں نے بعد کرکے بل کی ادائیگی کی ، اور ایک رفیق کار کے اس دعوے کو بے بنیاد ثابت کر دیا کہ سلام چیک دلوا کر کافی ہاؤس میں خرچ کرادیتے ہیں ــــــ

کافی ہاؤس سے اُٹھ کر میرا تاثر یہ تھا : سلام نفسیاتی گرہوں میں بندھے ہوئے ہیں ۔ فرسٹریشن گہرائی تک پہنچ چکا ہے ۔ لیکن آدمی بہت شفاف Transparent ہیں ۔ آر پار صاف نظر آتے ہیں ــــــ بڑے شاعر نہ ہوں ، لیکن سچے شاعر ضرور ہیں ــــــ شاعری میں بڑائی بخت و اتفاق سے آتی ہے ۔ لیکن سچائی ، شاعر کی اپنی کمائی ہے اور یہ کمائی ہے سلام کے پاس ۔

اور پھر ، کئی سال تک سلام سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی ۔ وقت کا پرندہ بڑی تیزی سے اڑتا رہا ــــــ اور پھر یوں ہوا کہ دلی کی لیکچرروں کی برادری میں چند سال کے لیے ایک اضافہ ہوا ــــــ عزیز اندوری ! نیک نہاد ، مسکین صورت ــــــ عزیز نے خاموشی اور ذہانت سے سلام کو پڑھا تھا ۔ اور فرصت کے لمحات میں سلام کی شخصیت اور شاعری پر سلام بھیجا کرتے تھے ۔ ان کی دھیمی مگر سچی آواز دل میں گھر کر گئی ۔ اور رفتہ رفتہ میں بھی سلامیات کے طلسم میں داخل ہوگیا ۔ جس کی نہ نہیں ۔ یعنی سلام کی بیشتر تحریریں ، کمیاب مطبوعہ نظمیں ، متعدد غیر مطبوعہ نظمیں اور سلام کے نام معاصرین کے خطوط وغیرہ کا مطالعہ ، انھیں کی اعانت سے طے ہوئیں ــــــ اور یوں میں نے سلام کی بازیافت کی ــــــ آنے والی سطور میں ، سلام سے متعلق خبر عزیز اندوری کی دین ہے ، اور تبصرہ کا ذمے دار میں ہوں ۔

وہ بے چین رُوح اور سیمابی جسم ، جسے سلام مچھلی شہری کہا گیا ، یکم جولائی ۱۹۲۱ء کو ضلع جونپور کے قصبے مچھلی شہر میں ، پیدا ہوا تھا ــــ خاندان نچلا متوسط مگر علم دوست اس لیے مفلوک الحال ! دادا محمد اسماعیل محدث ، اور والد عبدالرزاق حافظ تھے ۔ سلام کے بہن ، بھائی پانچ چھ ، دس بارہ نہیں !

بیس تھے (ہاں! اُس وقت ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔) اور قیاس کیجیے کہ عبدالسّلام —— اور سلام کا بھی نام رکھا گیا تھا —— کے حصّے میں بزرگوں اور سرپرستوں کی شفقت اور توجہ کتنی آئی ہوگی۔؟

—— ناعتبرو یا اولی الاًبصار —— لیکن قسّام ازل نے ذہانت وفطانت کی اچھی خاصی نعمت سلام کو دی تھی —— انھوں نے جون پور سے اُردو مڈل امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور سرکاری وظیفہ بھی حاصل کیا۔ فیض آباد کے فاربس ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا اور یہیں انھوں نے اپنے احساسات اور خیالات کو شعر کا جامہ پہنانا بھی شروع کیا —— اُردو زبان و ادب کی طرف خاص توجہ کی، اور اعلیٰ قابلیت وغیرہ کے امتحانات بھی پاس کیے —— اور شاید یہ رسمی تعلیم یہیں ختم ہوگئی —— یہ دوسری بات ہے کہ وہ زندگی بھر تعلیم حاصل کرتے رہے اور بہت تے ضرورت سے زیادہ تعلیم یافتہ "معاصرین" سے زیادہ علم اور عرفان کا اظہار کرتے رہے —— لیکن اِسے کیا کیجیے کہ ان کی اس نام نہاد "کمیِ علم" کا اظہار اُن کے دوستوں اور لکھنے والوں نے اس بے رحمانہ تواتر سے کیا کہ وہ خود اس فریب کا شکار ہوگئے۔ اُن کے فرسٹریشن کا ایک عنصر یہ بھی تھا۔

۱۹۴۴ء میں اُن کی شادی بھی ہوئی اور الٰہ آباد یونیورسٹی لائبریری میں ملازمت بھی ملی۔ ایک سال بعد وہ آل انڈیا ریڈیو، لکھنؤ سے وابستہ ہوگیے۔ اور یہ وابستگی ملازمت سے سبکدوشی تک قایم رہی —— اس مدّت میں، وہ سری نگر اسٹیشن پر فیچر رائٹر بھی رہے، لکھنؤ دوبارہ واپس آئے اور بالآخر دہلی چلے آئے یہیں ۱۹ نومبر ۱۹۷۵ء کو آسودۂ خاک ہوگیے۔

سلام کے نو بچے ہوئے۔ دو فوت ہوگئے۔ دو لڑکے اور پانچ لڑکیاں، بیگم سلام کے ساتھ ہنوز دہلی ہی میں رہتے ہیں۔

معنوی اولاد بھی، سلام کی کم نہیں ہے —— اب سے بہت پہلے، ۱۹۳۹ء میں انھوں نے اپنا پہلا مجموعہ مرتّب کیا، بعنوان "میرے نغمے" جو دو حصّوں میں منقسم تھا: "پھول" اور "انگارے" رومانی نظموں کا حصّہ ہی شایع ہوسکا، "انگارے" برطانوی احتساب کا شکار ہوگیا۔ کچھ ہی مدّت بعد، دوسرا مجموعہ "وسعتیں"، مکتبۂ اردو، لاہور نے شایع کیا۔ گیتوں کا مجموعہ "پایل" ۱۹۴۳ء میں ساقی بکڈپو، دہلی کے ذریعے منظرِ عام پر آیا —— اسی زمانے میں سلام کا ناولٹ "بازوبند" بھی لکھنؤ سے چھپا —— یوں تو سلام کا قلم آخر تک لکھتا رہا۔ ان کی نظمیں، غنائیے اور منظوم ڈرامے وغیرہ

آخر آخر تک ملک کے رسائل وجرائد میں چھپتے رہے ـــ لیکن مجموعوں کی ترتیب اور اشاعت کا خیال ملک کی تقسیم کے بعد ہی ان کے دل میں مردہ ہو چکا تھا۔

سلام، انتقال کر جانے سے بہت پہلے، کچھ صحیح، کچھ غلط ابنارمل یا نیوراتی مشہور ہو گئے تھے۔ اور اس بات سے وہ اچھی طرح واقف بھی تھے ـــ لیکن چوں کہ کھرے آدمی تھے، اس لئے اس کا کبھی بُرا نہ مانے۔ وہ عالم سرخوشی میں کہا کرتے تھے: Be a man, Be what you are ـــ جی ہاں! پینے کے بعد وہ اکثر انگریزی میں بات کرنے لگتے تھے۔ شراب انھوں نے بہت پی اور مسلسل پی اور ہر طرح کی پی۔ لیکن شراب نوشی کو، بقول رشید احمد صدیقی، آرٹ کبھی نہ سمجھا، کمزوری ہی سمجھتے رہے ـــ وہ لڑتے بھی تھے، روٹھتے بھی تھے۔ لیکن اپنی غلطی معلوم ہونے پر، بہت جلد مَن بھی جاتے تھے، دوسروں کو منا بھی لیتے تھے ـــ مجموعی اعتبار سے، بڑے چاہے جانے کے قابل تھے۔

"پیارے! میں بور تو نہیں کر رہا ہوں"؟

باتوں کے دَوران، وہ مختصر مختصر وقفوں کے بعد پوچھا کرتے ـــ اور اس بھولپن سے پوچھتے کہ کوئی "پیارا" بور ہونے کا اعتراف نہیں کر سکتا تھا۔

لیکن فن کار سلام ہنوز اپنی شاعری کے سنہری غبار میں اُوجھل ہے۔ اور منتظر ہے کسی "پیارے" کا، جو اپنی نظر کی تیزی اور صحیح اندیشی سے اِس غبار کو دُور کر کے فن اور فن کار کو علاحدہ دیکھ سکے اور دِکھا سکے۔

ﮦﻭ

رشید حسن خاں

مولوی سید احمد دہلوی

اردو کے مشہور لغت فرہنگِ آصفیہ کے مؤلف مولوی سید احمد دہلوی کو میں نے دیکھا تو نہیں، اور دیکھا بھی کیسے، وہ پیدا ہوئے تھے ۱۸۴۶ء میں، یعنی اب سے ایک سو انتالیس برس پہلے، اور ۱۹۱۸ء میں اس دنیا سے چلے گئے؛ لیکن میں اُن کو جانتا اچھی طرح ہوں۔ وہ اپنی تحریروں میں اپنے کردار، مزاج اور انداز کی رنگارنگی کے ساتھ اس طرح نمایاں نظر آتے ہیں جیسے سامنے موجود ہوں۔ فرہنگِ آصفیہ کی پہلی جلد کا جو پرانا اڈیشن ہے ۱۹۰۸ء کا، اُس میں ان کی تصویر بھی شامل ہے۔ بھاری بھرکم بدن، سر پر ترکی ٹوپی، گلے میں نقش و نگار سے آراستہ مفلر جس کے دونوں سرے اس طرح ملا کر سامنے رکھے گئے ہیں کہ آرائشی حصہ سامنے آگیا ہے۔ بڑی بڑی آنکھیں، چوڑا ماتھا، بھرا ہوا چہرہ، اُس پر خوش نما سفید داڑھی، جو حدِ اوسط سے تجاوز نہیں کر سکی ہے۔ داڑھی کے باوجود چہرے پر خشونت کے آثار نہیں؛ اِس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ وہ بس نام کے مولوی تھے۔ ان کی تصویر اور اُن کی سادہ صاف تحریریں ان کی بے ریا شخصیت کو اس طرح سامنے لے آتی ہیں کہ اجنبیت کا احساس کم ہو جاتا ہے اور شناسائی کا احساس بڑھ جاتا ہے، بس شرط یہ ہے کہ آدمی زبان اور ادب کی نسبت سے مولوی صاحب ہی کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہو۔

غلام یزدانی مرحوم سے دلی والے ناواقف نہ ہوں گے۔ انھوں نے مولوی صاحب سے اپنی ایک ملاقات کا جو حال لکھا ہے، اس سے مولوی صاحب کی آخری زمانے کی تصویر بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

"مولوی صاحب کا حلیہ اور عادات ڈاکٹر جانسن کی شکل وصورت اور خصائل سے ملتے جلتے تھے دونوں کی بصارت کم، دونوں کا مٹاپے کی وجہ سے بے ڈھنگم جسم۔ مولوی سید احمد کی پلکیں بالکل جھڑ گئی تھیں اور پپوٹوں کے کنارے بالکل سرخ رہتے تھے، پھر بھی مطالعہ اور تصحیح کے کام میں مشغول رہتے تھے ___ ایک دفعہ میں کسی لفظ کے معنی کی تلاش میں ان کے گھر پہنچا۔ یہ اس زمانے میں ایک تپلی سی گلی میں رہتے تھے، جو شاہ گنج اور شاہ تارا کے درمیان واقع ہے۔ گرمی کا موسم تھا، میں نے مکان پر جاکر کنڈی کھٹکھٹائی، مولوی صاحب باہر نکل آئے، ننگ دھڑنگ، صرف ایک میلا جانگیا زیب تن تھا۔ میں نے اپنا مطلب عرض کیا۔ فرمایا: ذرا ٹھہریے، پھر گھر کے اندر گئے اور کرتا پاجامہ پہن کر اور ایک کنجیوں کا گچھا لے کر باہر آگئے اور مجھے ساتھ لے کر گلی شاہ تارا کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں ایک لیتھو پریس تھا اور مسودات بھی وہیں رہتے تھے۔ مولوی صاحب ایک ڈسک نما میز پر بیٹھ گئے، بستے میں سے مسودہ نکالا، کچھ ورق گردانے، پھر کلاں نما آئینہ اور اپنی عینک دونوں کی مدد سے میرے پیش کردہ لفظ کے معانی محل استعمال بیان کرنے شروع کیے۔ میں کھڑا سنتا رہا، اور یہ جب تک میری تشفی نہ ہوگئی، سمجھاتے رہے۔ کچھ راہ گیر بھی جمع ہو گئے...... مولوی صاحب ایک کاٹھ کی کرسی پر بے تکلف بیٹھے ہوئے تھے اور اطمینان اور فراغت کا یہ حال تھا کہ آکسفورڈ اور کیمبرج کے پروفیسروں کو اپنے مطالعے کے کمروں میں اتنا ہی سکون حاصل ہوتا ہوگا۔"

(مقدمۂ رسوم دہلی، طبع کراچی)

میں نے ابھی جو مولوی صاحب کی شخصیت کو بے ریا کہا تھا، اس کی تصدیق آپ کو بھی ہوگئی ہوگی۔

زبان کے معاملے میں مولوی صاحب کٹر دلّی والے تھے۔ دہلی اور لکھنؤ میں جو ادبی اور لسانی چپقلش رہی ہے، اُس میں وہ بھی اُلجھے ہوئے تھے اور اِس حد تک کہ ان کا فتوا یہ تھا کہ لکھنؤ والوں کو بھی دلّی والوں کی تقلید کرنا چاہیے کیوں کہ دلّی سے باہر کا آدمی وہ لکھنؤ کا کیوں نہ ہو، اہل زبان ہو ہی نہیں سکتا۔ انھوں نے لکھا ہے: "اسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ دہلی کے سوا کوئی دوسرا شہر ٹکسالی اور مرکزِ اُردو قرار نہیں پا سکتا۔ اُردو لکھ لینا اَور ہے اور اُس کا صحیح لہجہ ادا کرنا اور" آصفیہ جلد اول ص۶۶)
اب آپ کہیں گے کہ کوئی دوسرا شخص کہے تو کہے، ایک لغت نویس کو یہ بات یا ایسی بات نہیں کہنا چاہیے۔ میں اِس رائے میں آپ سے متفق ہوں، مگر اِس کو کیا کیا جائے کہ اس زمانے میں دبستانی اختلاف نے کچھ ایسی ہی جانب داری کی فضا پیدا کر رکھی تھی۔ مولوی صاحب نے کوئی نئی بات تو لکھی نہیں، مرزا داغ اِس سے پہلے کہہ چکے تھے کہ: اُردو ہے جس کا نام، ہمیں جانتے ہیں داغ۔ یہ تو خیر ایک طرف دار اور ایک فدائی کا نعرۂ بے اختیار تھا، لیکن اسی سلسلے میں دو سطروں کے بعد مولوی صاحب نے ایک بہت اہم بات لکھی ہے کہ: "نیز یہ بھی لحاظ رہے کہ زبانِ اُردو سے صرف الفاظِ اُردو مراد نہیں، بلکہ لہجہ بھی، جو اُس کی اصالت ہے، اسی میں شمار کیا جاتا ہے۔ بس جس شخص کا لہجہ مع الفاظِ روزمرہ درست ہوگا، وہی استادِ کامل خیال کیا جائے گا، بلکہ اصل باشندے کا اُسی پر اطلاق ہوگا" یہ نکتہ آج بھی ہماری توجّہ کا طلب گار ہے۔

ایک تو مولوی صاحب پکے دلّی والے تھے، پھر اُردو کا اس وقت تک کا سب سے بڑا لغت مرتب کر رہے تھے۔ اِن دو باتوں نے اُن کی تحریر میں عجیب صورت پیدا کر دی ہے۔ لغت نویسی کی حد تک اُن کا خیال تھا کہ انھوں نے اتنا بڑا کام شروع کیا ہے، نواب کسی اور کو اس میدان میں قدم رکھنے کی ضرورت نہیں۔ امیر مینائی نے جب امیر اللغات کا ایک جز چھاپا تو انھوں نے واضح لفظوں میں امیر پر چوری کا الزام لگایا اور کہا کہ یہ تو میرے ہی لغت کا چربا اتار لیا ہے۔ فرہنگ آصفیہ کی پہلی جلد کے مقدمے میں بہت ہی سخت اور نامناسب الفاظ میں اِن دونوں کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ میں نے آنکھ اور ہاتھ وغیرہ کے جو لغات لکھے تھے، اُنھی کو اِن لوگوں نے اڑا لیا ہے۔ مولوی صاحب سے کون یہ پوچھ سکتا تھا کہ ہاتھ اور آنکھ کے نئے لغات یہ لوگ کہاں سے لاتے۔ اصل بات یہ تھی کہ مولوی صاحب امیر مینائی اور صاحب نور اللغات کو اہلِ زبان ہی نہیں سمجھتے تھے۔ وہ دہلی و لکھنؤ کا پرانا

جھگڑا ــــ مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ مولوی صاحب کی گفتگو کا انداز کیا ہوتا تھا، مگر ان کی تحریر ہم سب کے سامنے ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دلّی والے ہونے کا پورا پورا فائدہ اُٹھایا کرتے تھے ایچ پیچ کے قائل نہیں تھے اور سب کچھ لکھ دینے کو غیر مناسب نہیں سمجھتے تھے، خاص کر لسانی نحو ل میں۔ ایسے میں اگر کہیں لکھنؤ کا ذکر آ گیا تو پھر مولوی صاحب سنجیدگی تحریر کی بھی کچھ ایسی پروا نہیں کرتے تھے اور نہ یہ دیکھتے تھے، کہ جہاں وہ یہ باتیں لکھ رہے ہیں، وہ کوئی رسالہ نہیں، لغت کی کی کتاب ہے۔ فرہنگِ آصفیہ کو دیکھ جائیے، مقدمہ کی کتاب کی بات نہیں، الفاظ کی تشریح کے ذیل میں بھی وہ ایسی گنجائشیں نکال لیا کرتے تھے۔ میں مولوی صاحب کے مزاج، اندازِ فکر اور ایسے عالم میں طرزِ کلام کی وضاحت کے لیے صرف ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ لفظ "توتی" کے ذیل میں مولوی صاحب نے لکھا ہے:

"اس لفظ کی تذکیر و تانیث پر جو لطیفہ حضرت استاد ذوقؔ اور ایک لکھنوی شاعر سے ہوا، اُسے ناظرین کی تفننِ طبع کی غرض سے ...... درج کیا جاتا ہے:
لطیفہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ استاد ذوقؔ کے ایک لکھنوی "دوست" نے ناسخؔ کی ایک تازہ غزل سنائی۔ اسی زمین میں ان کو ذوقؔ نے اپنی غزل سنائی، جس میں یہ شعر بھی تھا:

ہے قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا
خوب طوطی بولتا ہے اِن دنوں صیاد کا

اب باقی لطیفہ مختصراً مولوی صاحب کے لفظوں میں سنیئے: "دوسرا شعر سنتے ہی چونکے اور فرمایا کہ ہیں! آپ نے طوطی کو مذکر باندھ دیا، حالاں کہ اِس میں یائے معروف علامت تانیث موجود ہے ...... اُستاد ذوق نے فرمایا کہ حضرت! محاورے پر کسی کے باپ کا اجارہ نہیں ہے۔ آج آپ میرے ساتھ چوک پر چلیے ...... جب شام کا وقت ہوا، دونوں صاحب جامع مسجد کی سیڑھیوں پر، جہاں گدڑی لگتی ہے، پہنچے ...... دیکھا ...... ایک شہدے صاحب بھی طوطی کا پنجرہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔ اُستاد ذوق نے اشارہ کیا: ذرا ان سے بھی دریافت کریجیے۔ آپ نے بے تکلف پوچھا: بھیّا! تمہاری طوطی کیسی بولتی ہے ...... جواب دیا کہ میاں!

بولی تمہاری ہوگی، یاروں کا طوطی تو خوب بولتا ہے"۔ آپ نے مولوی صاحب کا انداز دیکھ لیا!
اس فرضی لطیفے کا بھلا لغت سے کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ مگر دہلی و لکھنؤ کی بحث میں تعلق نکل آیا۔ سچ
کہا گیا ہے کہ عاشقی میں سب کچھ جائز ہے۔

آج ہم لوگ فرہنگ آصفیہ میں بہت سے عیب نکالتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اس میں بہت
سے بحث طلب مقامات ہیں۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ آج بھی یہ لغت بعض اعتبارات سے بے مثال
ہے۔ اس کی برائی اس وقت واضح ہوگی جب اسے کسی نئے لغت کے ساتھ رکھ کر دیکھئے۔ مثلاً
ترقی اُردو بورڈ کراچی کے ضخیم لغت کی چھے جلدیں اب تک چھپ چکی ہیں، ان جلدوں کے مندرجات
کا مقابلہ فرہنگ آصفیہ کے اندراجات سے کیا جائے تو جگہ جگہ اندھیرے اجالے کا فرق نظر آئے گا۔
الفاظ اور محاورات کے ذیل میں مولوی صاحب نے بہت سی ایسی تفصیلات لکھ دی ہیں جو آج
اور کہیں مشکل سے ملیں گی۔ خاص کر رسم ورواج اور اصطلاحات کے سلسلے میں۔ ایک فرق یہ بھی ہے
کہ مولوی صاحب نے اپنی آنکھوں سے بہت سی رسموں کو دیکھا تھا اور بہت سی چیزوں کو برتا تھا، جن
سے آج کا لغت نگار واقف نہیں، وہ نرا نقل نویس ہے، ادھورا نقل نویس۔

مولوی صاحب فنافی اللغت تھے۔ کیسی کیسی مصیبتیں اس سلسلے میں انھوں نے اٹھائیں، کتنے
دروازوں پر مالی امداد کے لیے دستک دی۔ ایک بار ۱۹۱۲ء میں گھر میں آگ لگ گئی تو سارا اثاثہ جل
گیا، کتابیں بھی جل گئیں۔ لیکن مولوی صاحب نے نہ ہمت ہاری نہ دل چھوٹا کیا۔ کسی ادارے کی مدد سے
انھوں نے اس کام کو شروع نہیں کیا تھا۔ محض ذاتی دلچسپی نے اُن کو لغت نویسی کی طرف مائل کیا۔
اس ذاتی دلچسپی میں بہت بڑا حصہ اس احساس کا تھا کہ دہلی کی زبان محفوظ ہو جائے اور دہلی کی معاشرتی
زندگی کے بہت سے مظاہر کی تفصیلات کاغذ پر درج ہو کر یادگار بن جائیں تاکہ بدلتے ہوئے زمانے
کی دست برد سے محفوظ ہو جائیں۔ انھوں نے معمولی ملازمتیں کیں، دلّی میں بھی رہے، دلّی سے
باہر بھی رہے۔ مگر لغت کے کام سے ایک دن کیا، ایک لحظہ بھی غافل نہیں رہے۔ ایسے دل لگا کر
محض اپنے شوق کی تسکین کی خاطر کام کرنے والے اب کہاں ہیں۔

مولوی صاحب دہلی کے آخری بڑے آدمی تھے جنھوں نے بڑے سے
بڑے کاموں کو انفرادی طور پر انجام دینے کی مشرقی روایت کو برقرار رکھا اور اتنا بڑا لغت مرتب

کر گئے۔ یہ صحیح ہے کہ ایسے کام اب ایک آدمی انجام نہیں دے سکتا، مگر ہمارے یہاں اب تک اجتماعی طور پر اور منصوبہ بندی کے تحت ادبی کام کرنے کی روایت پروان نہیں چڑھ سکی ہے اور لغت یا تاریخ ادب کے سلسلے میں جو پنچایتی کام اب تک ہوئے ہیں، ان کا احوال اس قدر تباہ ہے کہ ان کاموں کے کرنے والوں کو اگر روایتی لیبر کیمپ میں بھیج دیا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ اس صورت حال کے تحت اب سے سوسوا سو برس پہلے جو اتنا بڑا کام ایک فرد واحد نے انجام دیا ہے اور جس میں خامیوں کے مقابلے میں خوبیوں کی تعداد کچھ زیادہ ہی ہے، اُس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ اگر کسی کو اس میں کچھ شک ہو تو اس لغت کے مقابلے کی اس زمانے کی کوئی ایک ہی مثال لے آئیں۔ اب تو مالی وسائل کی کمی نہیں، سائنسی نقطۂ نظر بھی عام ہو چکا ہے اور علم زبان نے بھی بہت ترقی کر لی ہے۔ مولوی صاحب لسانیات سے واقف نہیں تھے (اور اُس زمانے میں کوئی بھی واقف نہیں تھا) دولت مند بھی نہیں تھے، انھوں نے غلطیاں بھی بہت کی ہیں، وہ دہلی و لکھنو کے دبستانی جھگڑے میں بے طرح الجھے ہوئے تھے، اس کے باوجود دو وصف ایسے بھی تھے اُن کے یہاں جن کا اب قحط ہے ایک تو یہ کہ انھوں نے پوری زندگی اپنی اس کے لیے وقف کر دی تھی اور پوری صلاحیت اور توفیق کے ساتھ بس اُسی کے ہو کر رہ گئے تھے اور عمر عزیز کا دو تہائی حصہ اسی ایک کام کی نذر کر دیا آج ہے کوئی ایسا فدائی، ایسا مخلص اور ایسا ڈوب کر کام کرنے والا! اس ایک وصف کے سامنے بہت سی خامیاں بے رنگ ہو کر رہ جایا کرتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ صحیح معنی میں زبان سے واقف تھے۔ اُردو میں کتنا ہی بڑا لغت مرتب ہو جائے جو جدید معیار لغت نویسی کے لحاظ سے بھی اعلا درجے کا بھی ہو، تب بھی فرہنگِ آصفیہ کی اہمیت کم نہیں ہوگی۔ کلاسکی ادب پر کام کرنے والے، خاص کر دہلی کی زبان پر کام کرنے والے ہمیشہ اس سے استفادے پر ہمیشہ مجبور رہیں گے، اس بنا پر کہ جو مختلف معاشرتی اور تہذیبی تفصیلات اس میں محفوظ ہیں، وہ کہیں اور نہیں ملیں گی اور زبان دہلی کے لحاظ سے روزمرہ و محاورہ کے جو بہت سے نکات اس میں مندرج ہیں وہ نئے لغت میں ان کو نہیں ملیں گے۔ ہم لوگ جو زبان اور لغت سے کچھ نہ کچھ تعلق رکھتے ہیں اور ان موضوعات میں سر کھپاتے رہتے ہیں، ہمیشہ مولوی صاحب کو یاد رکھیں گے اور اُن کے خلوص کو اور ڈوب کر کام کرنے کے انداز کو مثال میں پیش کرتے رہیں گے۔

٭٭

ڈاکٹر قمر رئیس
پروفیسر شعبۂ اردو۔ دہلی یونیورسٹی

سجاد ظہیر (بنّے بھائی)

بنّے بھائی کا اصل نام سید سجاد ظہیر تھا۔ وہ لکھتے صرف سجاد ظہیر تھے۔ اگرچہ یہ بات دلچسپ ہے کہ وہ محبان اہل بیت دوستوں اور عزیزوں کے نام سے پہلے سید لکھنے پر اصرار کرتے تھے۔ ان کے والد کا نام سید وزیر حسن اور دادا کا نام سید ظہیر حسن تھا۔ گویا اپنا نام انھوں نے دادا سے لیا تھا۔ نام کے سلسلہ میں یہاں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ۱۹۳۸ء میں جب ان کی تقریب شادی کی تصویر السٹریٹیڈ ویکلی میں شائع ہوئی تو وہاں ان کا نام سید ظہیر خاں شائع ہوا (تحقیق علی باقر) جو شاید ان کے کسی دوست کی ستم ظریفی تھی۔ سید سجاد ظہیر ۵ نومبر ۱۹۰۵ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے وہ اپنے سات بھائی بہنوں میں پانچویں نمبر پر تھے۔ ان کا خاندان اگرچہ جونپور سے تعلق رکھتا تھا لیکن ان کے والد وکالت کے سلسلہ میں لکھنؤ میں آباد ہو گئے تھے۔ شرفا کے دستور کے مطابق بنے بھائی کی ابتدائی تعلیم مولوی صاحبان کے ذریعہ گھر پر ہی ہوئی۔ دینیات کے علاوہ عربی اور فارسی کے ابتدائی درس بھی گھر پر ہی ہے۔ پھر اسکول میں انھوں نے اردو اور فارسی پڑھی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور ۱۹۲۶ء میں اس دانش گاہ سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔

اس کے بعد وہ انگلستان روانہ ہو گئے۔ اور تقریباً نو سال انھوں نے طالب علم کی

حیثیت سے لندن میں گزارے۔ اگرچہ ایسا لگتا ہے کہ تعلیم سے زیادہ انھیں وہاں سیاسی ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں میں دلچسپی تھی۔ ہندوستانی طلبا ء میں وہاں انڈین نیشنل کانگریس کا جو سیل تھا اس کے تنظیمی کاموں میں وہ سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ وہ آکسفورڈ یونیورسٹی سے شائع ہونے والے جرنل کے اڈیٹر بھی رہے جسے یونیورسٹی کے ذمہ داروں نے بند کر دیا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی سے بنے بھائی نے پہلے ایم۔ اے اور پھر بار ایٹ لا کی ڈگریاں حاصل کیں۔ جدید علوم وفنون اور خاص کر ادب کے مطالعہ سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ ۱۹۳۰ء کے بعد انھوں نے کہانیاں بھی لکھیں جو ۱۹۳۲ء میں 'انگارے' میں شائع ہوئیں۔ لندن میں مارکسزم کے مطالعہ کا بھی انھیں موقع ملا۔ ان کے دوستوں کے حلقہ میں ملک راج آنند، ہیرن مکرجی ڈاکٹر گھوش اور اقبال سنگھ جیسے نوجوان طالب علم شامل تھے اور یہ سب اشتراکی نظریات کے ماننے والے تھے۔ اُس زمانہ میں ہٹلر کے نازی جرمنی میں روشن خیال اور کمیونسٹ دانشوروں اور ادیبوں پر بڑے ظلم ہو رہے تھے اور یورپ میں فاشزم انسانی تہذیب و تمدن کے لیے بھیانک خطرے کا روپ اختیار کرتا جا رہا تھا۔ بقول بنے بھائی " فاشزم کے ظلم کی دردبھری کہانیاں ہر طرف سنائی دیتیں جرمنی میں آزادی پسندوں اور کمیونسٹوں کو سرمایہ داروں کے غنڈے طرح طرح کی جسمانی اذیتیں پہنچا رہے تھے ...... ان سب نے ہمارے دل و دماغ کے اندرونی اطمینان اور سکون کو مٹا دیا تھا۔"

انہی حالات کے زیراثر انھوں نے ۱۹۳۵ء میں لندن میں ڈاکٹر تاثیر ملک راج آنند اور دوسرے ہندوستانی طلبا کے مشورہ سے ادیبوں کی ایک تنظیم بنائی جس کا نام Indian Progressive Writers Association رکھا گیا۔ اس کے پہلے صدر ملک راج آنند ہوئے۔

۱۹۳۶ء میں ہندوستان واپس آکر انھوں نے نئے سرے سے اس انجمن کا مینی فسٹو ترتیب دیا اور اپریل ۱۹۳۶ء میں کل ہند کانفرنس کر کے ہندوستانی ادب کی سب سے بڑی تحریک کی بنیاد رکھی۔

بنے بھائی جب لندن سے واپس آئے تو ان کے والد سر وزیر حسن الہ آباد میں رہنے لگے تھے۔ اس لیے بنے بھائی بھی الہ آباد میں رہنے لگے تھے۔

ابتداء میں شاید والدین کے اصرار پر وہ کچھ دنوں شاندار سوٹ پہن کر کورٹس کے چکر بھی لگانے لگے۔ لیکن پھر اچانک بقول سید احتشام حسین ان کا سوٹ اتر گیا اور وہ کھدر کے معمولی لباس میں نظر آنے لگے۔

۱۹۳۴ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کی تحریک پر کانگریس سوشلسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں وہ دوسری بار کانگریس کے صدر بھی چن لیے گئے، وہ چاہتے تھے کہ اشتراکی خیالات رکھنے والے تعلیم یافتہ نوجوان کانگریس کے تنظیمی کاموں میں ان کی مدد کریں۔ چنانچہ ڈاکٹر اشرف۔ زیڈ۔ اے احمد اور محمود الظفر کے علاوہ بنے بھائی بھی ان کا ہاتھ بٹانے لگے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے انھیں کانگریس کی خارجہ پالیسی کے ونگ کا سکریٹری بنادیا۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم کے کاموں میں بھی بڑی سرگرمی اور تندہی سے مصروف رہے۔ اسی زمانہ میں ان کا ناول، لندن کی ایک رات شائع ہوا۔ جس نے ایک تخلیقی فنکار کی حیثیت سے ان کی شہرت کو مستحکم کر دیا۔

بعض دوسرے نوجوانوں کی طرح بنے بھائی بھی کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی دونوں میں شامل رہے۔ لیکن ۱۹۴۲ء میں انھیں ہفتہ وار "قومی جنگ" کے چیف اڈیٹر کی حیثیت سے کمیونسٹ پارٹی نے بمبئی بلالیا اور وہ اس سیاسی پرچہ کی ادارت کرنے لگے۔ اس زمانہ میں بمبئی میں علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، سید سبطِ حسن اور دوسرے نوجوان ادیب جمع ہو گئے تھے۔ ملک کی تمام اہم زبانوں میں ترقی پسند تحریک تیزی سے فروغ پارہی تھی۔ ۱۹۴۳ء میں بنے بھائی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے رکن چن لیے گئے

آزادی کے بعد وہ پارٹی کی ہدایت پر ۱۹۴۸ء میں پاکستان چلے گئے۔ وہاں انھیں کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم کرنا تھی۔ پاکستان پہنچ کر انھوں نے خاموشی سے مزدور کسان رہنماؤں سے رابطہ قائم کیا اور وہ پارٹی کے جنرل سکریٹری چن لیے گئے۔ وہاں پارٹی چونکہ غیر قانونی تھی۔ اس لیے انھیں زیادہ کام روپوشی کی حالت میں ہی کرنا پڑا اس کے باوجود بقول سید سبطِ حسن " انھوں نے تین سال کی مختصر مدت میں کمیونسٹ پارٹی کے بکھرے ہوئے تاروں کو نہ صرف از سرِ نو جوڑا بلکہ نئے کارکنوں کی سیاسی تربیت کر کے اس نوزائیدہ پارٹی کو ایک نہایت باعمل اور منظم جماعت میں تبدیل

کردیا..... ان کی شخصیت میں اس بلا کی کشش تھی کہ پارٹی کا ہر رکن ان سے ذاتی طور پر ایک یگانگت اور اپنائیت محسوس کرتا تھا۔

پارٹی کی تنظیم کا یہ کام جاری تھا کہ مارچ ۱۹۵۱ء میں انھیں راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار کرکے قید کر دیا گیا۔ ان کی بیوی رضیہ آپا اور بچے ہندوستان ہی میں تھے۔ اسیری نے جدائی کے غم کو اور بھی گہرا کر دیا۔ بنے بھائی نے چار سال قید و بند کی اذیت میں بسر کیے۔ کبھی تنہائی میں اور کبھی فیض اور دوسرے ساتھیوں کے ساتھ۔ ہر چند کہ سزائے موت کی تلوار ان کے سر پر لٹک رہی تھی لیکن وہ ذرا بھی ہراساں نہیں تھے۔ اس کا اندازہ مختلف جیلوں سے رضیہ آپا کے نام ان کے لکھے خطوں سے ہوتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ بعد میں بھی وہ اپنے عقیدہ اور عزائم کو کس طرح سینے سے لگائے ہوئے تھے۔

۱۹۵۵ء میں رہا ہو کر ان کے ہندوستان آنے کا حال آزاد قلم خواجہ احمد عباس نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔

"جب پاکستان کی ملٹری حکومت نے سید سجاد ظہیر کو سازش کے الزام میں برسوں نظر بند رکھنے کے بعد رہا کیا تو میں پنڈت جی کے پاس گیا اور کہا کہ اب تو سجاد ظہیر کو ہندوستان بلا لیجیے وہ بولے 'ان کو ہندوستان سے جانے کے لیے کس نے کہا تھا'

میں نے عرض کی کہ کمیونسٹ لیڈروں کا حکم تھا کہ سجاد ظہیر پاکستان جا کر وہاں کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم کریں۔

پنڈت جی بولے — "بھلا لکھنؤ کے نازک مزاج سجاد ظہیر پاکستان جا کر وہاں کے پنجابیوں سندھیوں اور بلوچیوں کی تنظیم کریں گے؟ ..... خیر تم ان کو لکھ دو یا کہلوا دو کہ ہندوستان آنے کے لیے بوریا بستر باندھ لیں'

اگلے مہینے ہی بنے بھائی ہندوستان آ گئے۔ سب سے پہلے پنڈت جی سے ملنے گئے۔ انھوں نے پیار سے گلے لگا لیا اور کہا "بیوقوف کہیں کے"

پنڈت نہرو کی محبت اور سرپرستی کے باوجود تین سال تک بنے بھائی ہندوستان کی شہریت سے محروم رہے بلکہ state less آدمی کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے رہے۔

۱۹۵۹ء میں کیونسٹ پارٹی نے ہفتہ وار 'عوامی دور' کے مدیر کی ذمہ داریاں سنبھال کر وہ پھر سرگرم ہو گئے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بکھرے ہوئے شیرازکو انھوں نے ایک بار پھر جمع کرنے کی کوشش کی۔ بارہ سال بعد دسمبر ۱۹۶۵ء میں انھوں نے دہلی میں ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس کی اس کے ساتھ ہی ایفروایشیائی ادیبوں کی تنظیم میں بھی گہری دلچسپی لے رہے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں دہلی میں ایفروایشیائی ادیبوں کی پہلی کانفرنس کے پیچھے ان ہی کی تحریک اور تنظیمی صلاحیت کام کر رہی تھی۔ اور پھر ۱۲ر دسمبر ۱۹۷۳ء کو انھوں نے ایفروایشیائی ادیبوں کی الماآتا کانفرنس میں ہندوستانی ادیبوں کے سربراہ کی حیثیت سے حصہ لیا اور اسی کانفرنس کے ایک اجلاس میں شدید حملۂ قلب کے بعد انھوں نے آخری سانس لی۔ اسی طرح ایک ایسے شخص کی زندگی کا سفر ختم ہوا جس نے اپنی حیات کا ایک ایک لمحہ ملک و قوم انسانیت، ادب اور آرٹ کی بے لاگ خدمت گزاری میں صرف کیا۔ جس نے بیسویں صدی کے ہندوستانی ادب کو بالکل ایک نیا موڑ دیا۔ جس نے ایک انجمن کو ایک تحریک بنا دیا اور ہندوستانی ادب کو نہ صرف ہندوستان کی بلکہ ساری دنیا کی عوامی انقلابی تحریکوں کی ترجمانی کا منصب سونپا۔

بنے بھائی سے میری غائبانہ ملاقات ۱۹۵۲ء میں لکھنؤ میں اس وقت ہوئی جب میں لکھنؤ یونیورسٹی کا طالب علم تھا اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتا تھا۔ اُس وقت بنے بھائی پاکستانی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازش کے جرم میں قید تھے اخباروں میں اس سیاسی سازش کی خبروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ممکن ہے دوسرے ملزم بری جائیں لیکن بنے بھائی سزائے موت سے نہیں بچ سکتے۔ اس وقت میں نے اپنے تصور میں ان کی جو شبیہہ بنائی تھی وہ اسٹالن سے ملتی جلتی تھی۔ شیر کی طرح بارعب چہرہ۔ آتش نفس، شعلہ بیان مقرر۔ بجلی کی طرح کوندتی ہوئی شخصیت تیکھے تیور۔ الغرض اس وقت ایک مثالی کیونسٹ کا جو تصور ہو سکتا تھا وہ میرے ذہن میں تھا۔ لیکن ۱۹۵۹ء میں جب دہلی کے ایک ادبی جلسہ میں ان سے پہلی بار ملا۔ ان سے باتیں کیں تو انھیں ایک بالکل دوسرا ہی انسان پایا۔ نرم لب لہجہ۔ شیریں گفتگو۔ بے پناہ پرکشش سادگی اور دل کو موہ لینے

والی پُراسرار مسکراہٹ۔ یہ تھا پہلا تاثران سے ملاقات کا۔ اور پھر جیسے جیسے ان کے قریب آتا گیا ان کی تہ دار اور پرکار شخصیت کا طلسم کھلتا گیا۔

اس کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا کہ ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں وصف ان کا بنے بھائی ہونا تھا۔ ہر شخص ان سے مل کر انھیں سجاد ظہیر کے بجائے بنے بھائی کہہ کر مخاطب کرنا ہی باعث فخر سمجھتا تھا۔ میں نے دیکھا ہے کہ بعض ٹیڑھے اور انا پرست ادیب بھی جب ان سے ملتے تو ان کی موہنی مسکراہٹ کے جادو سے اپنی ساری کجی بھول جاتے اور انھیں بنے بھائی کہہ کر خوش ہوتے۔ اس لیے کہ ان کی محبت اپنائیت اور انکسار اگر ایک طرف ان کی شخصیت کا جوہر تھا جو ان کے وجود میں رچا بسا تھا تو دوسری طرف شاید غیر محسوس طور پر یہ ان کے حربے بھی تھے جن سے وہ مخالفین کو بھی نہتہ کر دیتے تھے۔ وہ بنے بھائی کے استدلال سے زیادہ ان کے خلوص اور ان کی نرم گفتاری سے متاثر ہوتے تھے۔ اور ایک بار ان کے خلوص کا نقش بیٹھ گیا تو پھر اپنے خیالات اور دلائل کو منوانا بھی ان کے لئے دشوار نہیں ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اگر کوئی کسی وقت گہرائی سے اس حقیقت کا مطالعہ کرے گا کہ ترقی پسند مصنفین کی تحریک دنیا کے دوسرے ملکوں کے بجائے اس شدومد سے ہندوستان ہی میں کیوں پھیلی تو وہ دیکھے گا کہ اس کا ایک بڑا سبب اس کے رہنما بنے بھائی کی پُرکشش شخصیت تھی وہ کسی بھی ادیب کو ہم خیال ہم نوا یا ہمدرد بنانے کا گر جانتے تھے۔ وہ دوسرے معاصر دانشوروں کے برعکس اپنے مخالفین کی باتیں بھی بڑی دلچسپی اور صبر سے سنتے اور جب وہ اپنے سارے دلائل ختم کر چکتا تو وہ آہستہ آہستہ بڑی نرمی اور اپنائیت سے اپنے موقف کی وضاحت کرتے مجھے یاد ہے کہ ایک بار حوض خاص میں ان کے گھر پر بعض مسائل کے تعلق سے میں نے ان کی کڑی نکتہ چینی شروع کی۔ رضیہ آپا درمیان میں مجھے ٹوکنے لگیں تو انھوں نے رضیہ آپا کو منع کیا۔ بڑی خندہ پیشانی سے میری گفتگو جس میں کچھ تلخی بھی تھی سنتے رہے۔ لیکن آخر میں جب میں اُٹھ کر چلنے لگا تو مجھے محسوس ہوا کہ متنازعہ مسائل کے تعلق سے میں نے ان کو نہیں بلکہ انھوں نے مجھ کو اپنا ہم خیال بنا لیا ہے۔

بنے بھائی ۱۹۶۴ء۔ حوض خاص کے جس مکان میں رہتے تھے اس کے کمروں کا رقبہ اور فرنیچر

وغیرہ سے صرف اتنا ہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کسی ایسے ہیڈ کلرک یا سیکشن آفیسر کا مکان ہے جو اتفاق سے کچھ شعروادب کا مذاق بھی رکھتا ہے۔ اگر رضیہ آپا لکچرر نہ ہوتیں اور بعد میں ترجمہ کا کام نہ کرتیں تو شاید ان کے بچوں کی تعلیم بھی مکمل نہ ہو پاتی اس لیے کہ بنے بھائی نے کوئی ایسا کام نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی جس سے کچھ مالی منفعت وابستہ ہو۔ حالانکہ سر وزیر حسن کا یہ ذہین بیٹا پنڈت نہرو کا چہیتا اور آکسفورڈ کا ایم۔ اے اور بار ایٹ لا اگر کانگریس کا نیتا بن جاتا یا انگریز بہادر کی چاکری کرتا یا پوری توجہ سے وکالت ہی شروع کر دیتا تو دس بیس لاکھ کی جائداد اور بینک بیلنس کا مالک ضرور ہوتا اس کی بیوی اور بچے زندگی میں محرومی اور کم مائیگی کے اذیت ناک تجربوں سے نہ گزرتے لیکن بنے بھائی نے بہت سوچ بچار کر کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی یعنی بے مائیگی اور مستقل محرومی کا راستہ اختیار کیا اور زندگی غربت لیکن غیرت مندی احساس حمیت اور شان استغنا سے بسر کی۔

بنے بھائی کی شرافت مروت اور اطوار کی نرمی میں مشرقیت اور کبھی کبھی جاگیرداری ذہنیت کا انداز نمایاں رہتا تھا۔ وہ ہر کام نرمی آسودگی، اطمینان اور اپنے سلیقہ سے کرتے عجلت اور تیزی طراری کو ان کے مزاج سے کوئی نسبت نہیں تھی۔ میں نے تاشقند اور ماسکو کے زمانہ قیام میں بھی ان کے اس رویے میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں دیکھی۔

ایک بار ازبکستان کی صدر مملکت محترمہ نصر الدینووا سے ملنے انھیں جانا تھا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ میں بھی ساتھ چلوں۔ میں ان کے ترجمان کے ساتھ صبح نو بجے ہوٹل میں انھیں لینے پہنچا تو وہ بستر ہی میں دراز تھے۔ میں گھبرایا اور ان سے جلدی کرنے کو کہا۔ بولے 'بھئی ایسی بھی کیا وحشت ہے۔ صدر مملکت نے بلایا ہے تو آرام سے چلیں گے۔ وہ بڑے سکون سے اٹھے۔ آدھ گھنٹہ غسل خانہ میں لگایا۔ پھر ناشتہ طلب کیا اور اسی طمانیت قلب سے ناشتہ کیا۔ آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے۔ لیکن شکر ہے کہ مقررہ وقت پر ہم لوگ پہنچ گئے۔ صدر مملکت نے چائے کے علاوہ پستے بادام اور لذیذ پھلوں سے ہماری تواضع کی لیکن مجھے سگرٹ کی طلب بے چین کیے ہوئے تھی۔ میں نے جیب سے پیکٹ نکالا تو بنے بھائی نے اپنے مخصوص نرم لہجہ اور اردو زبان میں مجھے تنبیہ کی، میزبان نے یہ نہیں OFFER نہیں کی ہے تو نہیں پینا چاہیے۔ یہ سن کر میں نے چپکے سے پیکٹ واپس جیب میں رکھ لیا لیکن میزبان نے کن انکھیوں سے سب

دیکھ لیا اور اپنے سکریٹری سے اچھی سگریٹ منگا کر ہم دونوں کو پیش کر دی۔

مجھے اکثر محسوس ہوا کہ بنے بھائی جتنے بڑے کمیونسٹ تھے اس سے کچھ بڑے وطن پرست تھے۔ اس سلسلہ میں وہ کبھی کبھی حکومت کو بھی اپنے مشوروں سے نوازتے رہتے تھے۔ پاکستانی سیاست کے ماہرین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔" شملہ معاہدہ کی گفت وشنید کے زمانہ میں وہ اور فیض صاحب ماسکو میں تھے ہم لوگ روز ملتے تھے۔ ایک دن شاید ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے سب کو کھانے پر مدعو کیا۔ وہاں بنے بھائی نہیں پہنچے۔ معلوم ہوا کہ وہ اچانک ہندوستان روانہ ہو گئے۔ شملہ مذاکرات کے سلسلہ میں حکومت نے ان کی موجودگی کو ضروری سمجھا۔ بعد میں میں نے بنے بھائی سے اس کی تصدیق چاہی تو وہ خوب صورتی سے ٹال گئے۔

اس سلسلہ میں ایک واقعہ اور یاد آرہا ہے۔ ایک بار محمد حسن، ڈاکٹر صدیق الرحمان قدوائی اور میں تینوں بنے بھائی کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ہم تینوں نے الگ جا کر سازش کی کہ آج بنے بھائی سے راولپنڈی سازش کیس کی تفصیل پوچھنا چاہیے کہ اصل واقعہ آخر تھا کیا؟ ادھر ادھر کی تمہید باندھنے کے بعد آخر ہم لوگوں نے پوچھ ہی لیا خیال تھا کہ اپنے بھائی چونکیں گے سنجیدہ ہو جائیں گے اور پھر اپنے مخصوص ٹھہرے ٹھہرے انداز میں اس سیاسی ڈرامہ کی ساری تفصیل سنائیں گے۔ لیکن انھوں نے دو چار جملوں میں ہی ساری داستان ختم کر دی۔ بولے "میجر اکبر خاں ایک کاک ٹیل پارٹی میں مجھ سے ملے۔ کچھ سرور کے عالم میں تھے۔ حکومت کو بدلنے کی بات کرنے لگے۔ میری مدد چاہی۔ میں خاموشی سے سنتا رہا اس کے بعد ایک خاتون کے ذریعہ ان کے دو ایک پیغام ملے لیکن ابھی ہم لوگ ان کے منصوبہ کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ میں بھی نہیں پائے تھے کہ گرفتار کر لئے گئے۔"

بنے بھائی کی شخصیت کو ایک ادیب، دانشور سیاستداں اور انسان کی حیثیت سے مختلف خانوں میں تقسیم کر کے دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ وہ بڑی گھٹی ہوئی اور متحد Integrated شخصیت کے مالک تھے ان کی وضعداری، نرمی اور مروت کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ اپنے بنیادی عقائد میں کوئی سمجھوتہ کرتے یا کر سکتے تھے۔ وہ بڑے منطقی ذہن سائنسی مزاج اور سلجھی ہوئی فکر کے آدمی تھے۔ ادب اور زندگی کے ہر مسئلہ کو بڑے وسیع سیاق میں دیکھتے تھے۔

مشرق کی اعلیٰ قدروں اور جدید مغربی علوم کی بصیرت نے ان کے وجود کو ایک روشن اور منفرد قالب میں ڈھال دیا تھا۔ وہ حافظ کی غنائی شاعری اور فرانس کے انقلابی شاعر لوئی اراگاں کی انقلابی فکر دونوں سے ایک بلند سطح پر محظوظ ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی بہترین تخلیقی صلاحیتوں کو اس عہد کی سب سے بڑی تحریک کی تعمیر پر صرف کیا۔ اُردو ہی نہیں ہندوستان کی دوسری زبانوں کے کتنے ہی ممتاز ادیبوں کی ذہنی اور تخلیقی تربیت میں انھوں نے نمایاں حصّہ لیا لیکن افسوس کہ ان کی ایک مختصر سوانح عمری بھی اب تک نہیں لکھی جا سکی۔ اُمید ہے کہ آئندہ سال ترقی پسند تحریک کے ۵۰ سالہ جشن کے موقع پر ان کی عظیم خدمات کا اعتراف ضرور کیا جائے گا۔

*

سید ضمیر حسن دہلوی

شاہد احمد دہلوی

دلی بھی عجیب شہر ہے۔ اس کے ہر بگاڑ میں ایک بناؤ ہے۔ بیسیوں دفعہ لٹی اور ایسی لٹی کہ ٹھکہ ہوگئی مگر پھر آباد ہوگئی اور ایسی آباد ہوئی کہ پہلے سے بھی زیادہ بارونق ہوگئی۔ باہر والے جوق درجوق آکر یہاں آباد ہوتے ہیں۔ باہر والوں کو دلی ہمیشہ راس آئی۔ یہ بھی اس شہر کی ایک کرامات ہے۔ ڈپٹی بہاء الدین مرحوم کے صاحبزادے سلطان الدین صاحب نے اس خصوص میں ایک بڑی دلچسپ بات بتائی۔ انھوں نے کہا کہ میری دادی صاحبہ فرماتی تھیں کہ "دلی، دلی والوں کی بیوی ہے اور باہر والوں کی ماں" میں نے دادی صاحبہ سے پوچھا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا شوہر کی نگاہ جیب پر رہتی ہے اور ماں کی نگاہ اولاد کے پیٹ پر رہتی ہے۔

اب سے چالیس پینتالیس سال پہلے تک دِلی میں شاہجہانی دیگ کی کھرچن باقی تھی بڑے وضعدار لوگ تھے یہ دلی والے جب تک جیتے رہے ان کی وضع میں فرق نہیں آیا۔ ہر شخص اپنی جگہ پر ایک نگینہ تھا۔ دِلی کی انگوٹھی میں جڑا ہوا۔ انہیں دیکھ کر آنکھوں میں روشنی آجاتی اور ان کی باتیں سن کر دل کا کنول کِھل جاتا تھا۔ خوش مذاق، خوش صفات، خوش طبع اور خوش گفتار۔ اب ایسے لوگ کہاں پیدا ہوں گے۔ یہ ایک مخصوص تہذیب کی پیداوار تھے۔ افسوس اس تہذیب کی شمع گل ہوگئی اور شمع کے ساتھ پروانے بھی رخصت ہوئے۔

ع ایک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

انہیں باکمال، بے مثال یادگار زمانہ لوگوں میں ایک شخص تھا شاہد احمد دہلوی، ادیب، ابن ادیب۔ مجھ زبان کے پھوہڑ کو آج اسی کے بارے میں عرض کرنا ہے۔ حضرات مجھے آتا جاتا تو کچھ ہے نہیں۔ بزرگوں کی انگلی پکڑ کر چلتا ہوں۔ وہی مثل ہے ننگی کیا نہائے گی کیا نچوڑے گی۔ حکم حاکم مرگ مفاجات۔ اُردو اکادمی کے وسیلے سے دلّی کا ذکر چھڑا ہے تو طائران خوش نوا اپنی اپنی بولیاں بول رہے ہیں تو مجھے بھی کچھ کہتے ہی بنے گی۔

حافظ شیرازی واقعی لسان الغیب تھے۔ انہیں صدیوں پہلے معلوم ہو گیا تھا کہ ہندوستان میں ایک شخص شاہد نام کا پیدا ہوگا، اور وہ رسالہ "ساقی" نکالے گا۔ چنانچہ ایک ترک شیرازی کے سیاہ خال پر، سمرقند و بخارا نچھاور کرنے والے نے، اور زیادہ فخیر بنتے ہوئے، دونوں جہان، اس شخص اور اس کے رسالے پر قربان کر دئے تھے۔

جہانِ فانی و باقی، فدائے شاہد و ساقی

ساقی کا دفتر اسی حویلی کے ایک حصے میں تھا جہاں ڈاکٹر نذیر احمد اور مولوی بشیر احمد بیٹھ کر خدمت ادب کر چکے تھے۔ نیچے کی منزل میں باپ اور دادا کی مطبوعات کا دفتر تھا۔ اوپر کی منزل میں دو بڑے کمرے شاہد نے گھیر لئے تھے۔ ایک میں ساقی کا دفتر تھا دوسرے میں وہ خود براجمان ہوتے تھے۔ دونوں کمروں میں میز کرسی کا نام و نشان نہ تھا۔ دری چاندنی پر نیچے کی نشست رہتی۔ بڑے بڑے جغادری ملاقاتیوں کو وہیں بٹھا لیا جاتا تھا۔ میز کے بغیر چائے کی پیش کش بھی ہو جاتی تھی۔ شاہد بڑے سادہ طبیعت کے انسان تھے۔ موسم گرما میں تہمد اور بنیان میں آکر اپنے کمرے میں بیٹھ جاتے۔ سردی کے موسم میں خاکی گرم قمیض اور سفید لٹھے کا پاجامہ ان کا خاص لباس تھا۔ ایک اونی چادر مستقل طور پر کمرے میں پڑی رہتی تھی جب ضرورت ہوئی کندھے پر ڈال لی جاتی۔ تقسیم ہند کے بعد جب کراچی کی پیر الٰہی بخش کالونی میں ان کے ایک بے تکلف دوست نے انہیں حسب معمول بنیان پہنے، تہمد باندھے زمین پر بیٹھے رسالہ پیک کرتے دیکھا تو ہنس کر کہا: "شاہد صاحب ایسے میں آپ کی ایک تصویر لے لی جائے"۔ شاہد زور سے ہنسے اور کہنے لگے "ہاں اُس کے نیچے لکھ دینا، پچیس سال ادب کی خدمت کرنے والے کا حشر"۔

شاہد صاحب ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ دِلّی میں پلے بڑھے۔ بچپن اور جوانی کا زمانہ یہیں گذرا۔ دِلّی کی ہر بات، ہر رسم و رواج، ہر عمارت، ہر گلی کوچے، ہر فن اور ہر ذوق شوق سے انہیں پوری واقفیت تھی۔ چنانچہ جب تک وہ یہاں رہے اپنی تحریروں میں انھوں نے دِلّی کو زندہ رکھا نقلِ وطن کے بعد یہ سلسلہ اور طول پکڑ گیا۔ ایسے جاندار مرقعے کھینچے کہ شہر کراچی میں دِلّی والوں کی ہچکیاں بندھ گئیں یہ ارمغان دلی پہنچے تو لوگوں نے آنکھوں سے لگائے۔ بار بار پڑھ کے ایمان تازے کیے اور سچ پوچھئے تو دلّی میں جو لکھنے والوں کی نئی کھیپ ہے، وہ انہیں تحریروں کے فیضان سے ہے، شاہد صاحب اور دوسرے چند بزرگوں کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔

کہتے ہیں حضرت جہاں پناہ کے چڑیا خانے میں ایک بلبل ہزار داستان پلی ہوئی تھی۔ اُستاد میرن جو چڑیا خانے کے داروغہ تھے اس کی اکھیا کرتے تھے۔ جب بہار کا موسم آتا اور بلبل کو چہکنے کا شوق ہوتا تو استاد میرن اس کا پنجرہ لے کر بیگم کے باغ میں آجاتے۔ شہر میں ایک دن پہلے اس کی دھوم مچ جاتی تھی۔ شوقین لوگ اپنی اپنی اگن، چنڈول، طوطے، مینا کے پنجرے لے کر باغ میں پہنچتے اور جب بادشاہی بلبل ہزار بولیاں بولتا تو سبحان اللہ کہہ کر پنجرے کو تھپک دیتے تھے مراد یہ ہوتی کہ بلبل ہزار داستان کی بولی کان لگا کر سُن اور چپ رہ کہ تجھے بھی یہ بانگ آجائے۔ چنانچہ جب بلبل کی بولیاں سن کر، لوگوں کے اگن چنڈول خوب بولنے لگتے تو وہ فخریہ کہتے کہ جناب ہمارے اگن، چنڈول نے بادشاہی ہزار داستان کی مار کھائی ہے۔

۱۹۶۱ء میں کسی ثقافتی وفد کے ساتھ شاہد صاحب دہلی آئے تو اپنے ایک دوست کی وساطت سے مجھے اُن کی زیارت نصیب ہوئی۔ جامع مسجد کی جنوبی دیوار کے ساتھ ایک چھوٹا سا چائے خانہ تھا۔ یار لوگ اُسے چنڈو خانہ کہتے تھے دوست نے مجھ سے وہاں چلنے کو کہا۔ میں ذرا اچھی بری جگہ بیٹھنے سے کتراتا ہوں اس لیے پس و پیش کرنے لگا۔ بحث و تمحیص میں دیر گئی اور جب ہم وہاں پہنچے تو ایک شخص ڈھیلی ڈھالی شیروانی پہنے، ذرا پکے رنگ اور موٹے موٹے ناک نقشے کا آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے۔ منہ میں بیڑی دبائے۔ سر پر کتھئی رنگ کی جناح کیپ اوڑھے، جو ذرا دائیں طرف جھکی ہوئی تھی کسی کا بازو پکڑے ہوٹل سے نکل رہا تھا۔ میرے ساتھی نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا تو میں سمجھ گیا کہ یہی وہ انسان ہے جس کے قلم سے

تخلیقی سوتے پھوٹ کر میرے کام و دہن کو سیراب کرتے رہے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی بڑے بے ڈھب سے آدمی تھے۔ غضب کے کاہل۔ کہیں آنے جانے سے انہیں وحشت ہوتی تھی۔ پابندیٔ اوقات کا یہ عالم کہ اگر کہیں پانچ بجے جانا ہوتا تو وہاں سات بجے پہنچتے تھے یا پھر وقت سے گھنٹہ آدھ گھنٹہ پہلے ہی پہنچ جاتے تھے۔ ہم نے ان کے اعزاز میں دو چار محفلیں منعقد کیں مگر جب دیکھا کہ دِلی کی ہوا بندھنے کے بجائے اکھڑ رہی ہے تو اس مہمان نوازی سے باز آئے۔ بھٹ پڑے وہ سونا جس سے پھٹیں کان سلام ایسی دوستی کو جس میں جان کا نقصان۔ شاہد صاحب چائے کے دھنی تھے مگر اچھی بری کی خاک تمیز نہ تھی۔ دن بھر میں چالیس پچاس بیڑیاں پیتے تھے اور ایسی بدمذاقی سے پیتے تھے جیسے گھر کے نوکر پیتے ہیں۔ کسی اچھے ہوٹل میں دعوت دی جاتی تو کنی کاٹ جاتے۔ پھکڑ، پھبتی باز، کرخندار اور پشت لوگوں میں بیٹھ کر بڑے مگن دکھائی دیتے تھے۔ جب کسی ایسے ویسے سر پھرے سے ملتے جو اپنے تئیں نازوں میں تلتا تھا تو ان کا ناریل چٹخ جاتا پھر کیا تھا زبان توان کے گھر کی لونڈی تھی اور ایسے موقعوں پر بقول جوش، وہ اس سے سلوک بھی لونڈیوں جیسا ہی کرتے تھے۔ وہ بڑے طنطنے والے تھے اور یہ طنطنہ ان کا یونہی نہ تھا۔ کسی بنیاد پر استوار تھا۔ سجاد ظہیر اور اختر حسین رائے پوری کے اشتراک سے انجمن ترقی پسند مصنفین کی دلی میں شاخ قائم ہوئی تو وہ اس کے سکریٹری رہے۔ پھر کرشن چندر اور واسین کی کوششوں سے ہارڈنگ لائبریری میں آل انڈیا رائٹرز کانفرنس کا انعقاد ہوا تو ان کی توجہ سے ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ ادب میں تجدد کا غلغلہ بلند ہوا تو شاہد صاحب پیش پیش۔ پاکستان میں رائٹرز گلڈ بنا تو وہ اس کے کرتا دھرتا۔ جو شخص اس حد تک ادبی چودھری ہو وہ بھلا کیوں کسی کو خاطر میں لائے۔ چناں چہ وہ اس کے حق دار تھے کہ جدھر سے گذریں لوگ کہیں "با ادب بلا ملاحظہ ہوشیار شہنشاہِ ادب کی سواری آتی ہے۔"

شاہد صاحب لڑائی بھڑائی والے آدمی نہ تھے۔ صرف پیٹھ پیچھے برا کہنے پر اکتفا کر لیتے تھے مگر ان کے دوست بڑے مزامیر تھے۔ جیسے پتنگ کو دریائی دی جاتی ہے اسی طرح وہ شاہد میاں کو ابھار دیتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی لڑائیاں تو، ان شہ دینے والوں نے جتنی کتنی لڑائی ہونگی البتہ وہ مہابھارت جس کا ادبی دنیا میں دیر تک چرچا رہا جوش اور شاہد صاحب کا معرکہ تھا۔

دو ہاتھیوں کی ٹکر تھی۔ ضربِ شاہد بہ فرق شاہد باز اور اس کا جواب نہ بنتی نہ ڈھول بجیا دراصل دو ادبی اسکولوں کے غالب رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اصل میں شاہد صاحب کو شاعروں سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ وہ کہتے تھے کہ نثر نگار گھنٹوں پتہ مار کر بیٹھتا ہے بیسوں کتابیں پڑھتا ہے تب کہیں جاکر نثر کا کوئی ٹکڑا تیار ہوتا ہے اس کے برعکس شعر چلتے پھرتے تیار ہو جاتے ہیں۔ کانا اور بے دوڑی اس پر بھی شعر کے مقابلے میں نثر کو سننے والے میسر نہیں آتے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ شاہد صاحب کا شاعری کا خانہ ہی خالی تھا اسی لیے تو ساقی کا حصہ نظم ہمیشہ نثر کے آگے کمزور رہا۔ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ نثر نگار کو سنے نہ جانے کی جھونجھ ہی تھی جو انھوں نے پکے راگ گاگا کر نکالی۔ شاہد صاحب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ والدین کا سایہ اوائل عمری میں سر سے اٹھ جانے اور سگے سوتیلوں کے قصیوں سے بچنے کے لیے وہ کچی عمر سے پختہ کار ہونے تک زیادہ تر مردانے ہی میں وقت گذارتے تھے اور انھوں نے اپنا سونا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا سب مردانے ہی میں کر لیا کرتے تھے جہاں ان کا زیادہ وقت نوکروں کی صحبت میں گذرتا اسی لئے ان میں کچھ ایسے خصائل پیدا ہو گئے تھے جو بڑے گھروں کے نوکروں میں ہوتے ہیں مثلاً بااثر لوگوں کی مدح سرائی اور بے حیثیت لوگوں کی ہرزہ سرائی، بڑے آدمیوں کو آتا دیکھ کر ٹوپیاں اوڑھنا اور بیڑیاں بجھانا، افسروں کا احترام، اور برابر والوں کے ساتھ بے لگام۔ منہ پر تعریفوں کے پل اور پیٹھ پیچھے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر برائیاں نکالنا۔ سو یہ تمام برائیاں تو میری نظر سے نہیں گذری فقط کان گنہگار ہیں البتہ بیڑی پینے، پوسٹ کارڈ لکھنے اور بعض لوگوں کی بھد اڑانے دیکھنے کا میں بھی قصوروار ہوں۔

دراصل شاہد صاحب کے اندر ایک اور آدمی چھپا رہتا تھا۔ یہ مشکل اکثر نابغہ حضرات کو درپیش آتی ہے۔ جوش صاحب سے غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے ٹٹ پونجئے خاندان، سود خوار ملا اور غاصب حاکموں سے بچھو علمائے کرام کے گھر جنم لینے اور تربیت پانے جیسی کھری کھوٹی باتیں بے تکان کہہ ڈالیں۔ بس پھر کیا تھا شاہد صاحب کو بھی غصہ آگیا اور غصے میں پٹھانوں کے لٹھ کے آگے ایک دلی والے کی زبان کی برش بھلا تیغ اصفہانی کی کاٹ سے کم کیونکر ہو سکتی تھی۔ کہتے ہیں لوگ اکبر کی تلوار سے زیادہ ابوالفضل کے قلم سے ڈرتے تھے ابوالفضل کی

تحریریں تو خیر جو ہیں قلم کی برش کا اندازہ کرنے کے لیے شاہد صاحب کی تحریریں پڑھنا کافی ہے۔

شاہد احمد دہلوی بڑے وضعدار آدمی تھے۔ دلی کی تمام ادائیں ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ رکھ رکھاؤ کے بڑے شائق تھے۔ احترام کرتے تھے احترام کراتے تھے۔ جوشیلے بھی تھے اور ہوشمند بھی۔ آدمی کی زندگی میں کچھ مواقع ایسے آتے ہیں جب اُس کی اقدار شناسی کا بھرم کھلتا ہے۔ پردیس جانے سے دہلی والے سدا گھبرایا کئے۔ میر ہوں یا ذوق دلی کی گلیاں چھوڑ کر جانے پر کوئی رضامند نہیں ہوا۔ مثل مشہور ہے دلی کی بیٹی اور متھرا کی گائے کرم پھوٹیں تو باہر جائے۔ شاہد صاحب کی قسمت میں یہ روز بد بھی دیکھنا لکھا تھا۔ فسادات کے ہنگامے سے گھبرا کر وہ سرحد پار کر گئے۔ کراچی شہر میں اللہ معاف کرے اُن دنوں خاک اڑتی تھی۔ گدھے گاڑی اور اونٹ گاڑی کے نظارے عام تھے نارائن روڈ کے کوارٹروں میں جب یہ جا کے پڑے تو ساری اقدار دوستی مٹی میں مل گئی۔ گھر کی شناخت تھی نہ اپنی ذات کی۔ دلی والوں کو وہاں تلیر کہا جاتا تھا۔ یہ بھی مدتوں رواں دواں پھرتے رہے۔ آندھی میں چراغ جلایا کئے وہ شخص جو لاکھوں کی جائداد چھوڑ کر گیا تھا دانے دانے کو محتاج ہوگیا۔ کنبہ ماشاءاللہ بڑا ساراتھا۔ آخر وہ فن جس کی خاطر بزرگوں کی گالیاں سنی تھیں اور جسے اپنے وطن میں وہ سدا چھپائے رہتے تھے۔ غریب الوطنی میں روزی کا سہارا بنا۔ دیس چوری پردیس بھیک۔ سارے پردے فاش ہو گئے۔ شاہد احمد دہلوی نے آخر عمر تک ریڈیو پر گانے بجانے کی روٹی کھائی۔ موسیقی منجملہ فنون لطیفہ ہے مجھے اس کا اعتراف ہے مگر ساتھ ساتھ اس کی شکایت بھی کہ وہ شخص ہم قلمکاروں کا رفیق تھا اور ہماری برادری سے اسے حالات کے جبر نے اغوا کر لیا۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو نہ جانے ہم پر اس کی شخصیت کے کون سے گوشے مزید اجاگر ہوتے۔

شاہد صاحب میں سب سے بڑی بات ان کی سادگی تھی۔ جھوٹی عزت ان کو چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ خوب کھل کر اخلاص بھری باتیں کرتے تھے بے تکلف فقرے چست کرتے تھے مزا لیتے تھے گھل مل جاتے تھے۔ بڈھوں میں بڈھے جوانوں میں جوان۔ ہر ایک کے متعلق بہت کچھ جانتے تھے دلی ہی کے نہیں زمانے بھر کی دائی تھے ادیبوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کرتے تھے دار گفتگو کرتے، خود بھی ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنساتے تھے، گھنٹوں چنیں

کرنا ان کا مزاج تھا۔ اچھی بُری ہر قسم کی بات کرتے تھے ملاقات نئی ہو یا پرانی ملنے والے کو یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بڑے آدمی سے بات کر رہا ہے۔ مقدور بھر خاطر مدارات بھی کیا کرتے تھے خط کا جواب خواہ دو سطروں میں دیتے مگر دیتے ضرور تھے۔ چلتی پھرتی گالیاں بھی دیتے، چھیڑ چھاڑ بھی کرتے مگر سنجیدگی طبع برقرار رہتی تھی ہنسی مذاق ان کی فطرت میں داخل تھا۔ ایک مرتبہ جب ان کے منشی جی اپنی بیوی کی شکایت دیر تک ان کے آگے کرتے رہے تو شاہد صاحب نے ہنس کے فرمایا: "بھائی کیا تمہاری بیوی سوتیلی ہے۔" ساقی کے دفتر میں بعض ملاقاتیوں اور عقیدت مندوں کو بھی مذاق کا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے تھے۔

شاہد صاحب کی شادی کم سنی میں ہوئی تھی۔ اتنی کم عمری میں کہ وہ شادی کے مفہوم سے بھی آگاہ نہیں تھے۔ جب وہ جوان ہوئے تو دونوں میاں بیوی میں ایسی مفاہمت، ہمدردی اور محبت راسخ ہو چکی تھی جو دو معصوم دلوں کے درمیان طویل یکجائی پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ شاہد صاحب کی بیگم کے پہلو میں ناسور پیدا ہو گیا۔ یہ بیماری مریض کے لیے سخت تکلیف دہ اور تیمار دار کے لیے بڑی صبر آزما تھی۔ اُن کی بیوی اس طویل علالت سے اکتا کر زندگی سے کنارا کرنے لگیں مگر شاہد صاحب آخیر دن تک ان کو موت سے بچانے کے لیے جدوجہد کرتے رہے اور انھوں نے جوانی کا وہ زمانہ جو کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔ جب انسان بے فکری اور خوشیوں کا متلاشی ہوتا ہے اپنی بیوی کی خدمت گذاری میں بسر کیا۔ چودہ سال انھوں نے اپنی بیوی کی پٹی روزانہ خود اپنے ہاتھوں سے کی۔ اس واقعہ سے ان کے پاکیزہ کردار، وفاشعاری اور فرض شناسی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ انھوں نے اپنی اولاد کی پرورش پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی مگر ذرا بتائیے تو سہی کیا انسان اتنی بڑی تلخ کامی کے بعد بھی اپنے مزاج میں توازن کو جوں کا توں برقرار رکھ سکتا ہے؟ چودہ برس کی یہ ذہنی کوفت تو رام چندر جی نے بن باس میں بھی نہ اٹھائی ہوگی۔

یہ کون نہیں جانتا کہ شاہد پتوڑوں کے رئیس تھے۔ باپ دادا کا چھوڑا ہوا سرمایہ اور پھر خود اپنی آمدنی دو ڈھائی ہزار روپے ماہوار تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب روپے کا سولہ سیر آٹا اور روپے کا سیر بھر گھی بھی ملتا تھا۔ مگر غرور یا نخوت ان میں نام کو نہ تھی۔ جتنی امیروں سے نفرت تھی اتنی ہی غریبوں

سے محبت کرتے تھے۔ بلا کے خود دار تھے۔ طبیعت کی خاکساری ان کا طرۂ امتیاز تھی۔ مزاج شاہانہ پایا تھا۔ بے دریغ روپیہ خرچ کرتے تھے۔ غریبوں، ناداروں کی امداد ان کا ایمان تھا اور دوست احباب کے ساتھ سلوک کرنے کو فرض جانتے تھے۔ سادگی کا یہ عالم کہ گرمی ہو یا جاڑا کبھی بیش قیمت لباس نہیں پہنا۔ قیمتی لباس پہننے والوں پر وہ دولہا میاں کی پھبتی کستے تھے۔ دلی کے ایک رئیس ادیب خلیق دہلوی کے صاحبزادے آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں کامیاب ہو کر لندن جانے لگے تو خلیق دہلوی نے دلی کے بہت بڑے انگریزی ہوٹل میں لوگوں کو چائے پر مدعو کیا۔ سہ پہر کو شاہد صاحب کے ایک عزیز شاہد صاحب کو لینے آئے تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور روزمرہ کا لباس پہن کر چلنے لگے۔ عزیز بڑی حیرت اور تعجب سے بولے: "یہ کیا ارے بھئی دلی کے ایک رئیس نے چائے دی ہے اپنے نہیں تو میزبان کے شایان شان تو لباس پہنئے۔" وہ خود قیمتی لباس میں ملبوس تھے۔ شاہد صاحب کا مزاج بگڑ گیا بولے: "اچھا لباس مدعو ہیں انسان نہیں، تو خدا حافظ آپ تشریف لے جائیے۔" یہ کہہ کر بیٹھ گئے اور پھر ان کے لاکھ اصرار پر بھی دعوت میں نہیں گئے۔ گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا چاہتے تو ایک چھوڑ دو دو موٹریں خرید لیتے۔ بڑے بھائی کے پاس ایک موٹر بھی تھی مگر شاہد اپنے کالج کے زمانے میں سائیکل پر اور بعد میں پیدل ہی پھرا کرتے تھے۔ بہت ہوا تو دو پیسے کا ٹکٹ لے کر ٹرام میں بیٹھ گئے۔ انھوں نے زندگی بھر کسی کا احسان نہیں لیا جب کہ ان کے دوست احباب کسی نہ کسی صورت میں ان کے مرہونِ منت رہے تھے اور خاص طور پر ادیبوں کو جتنا انھوں نے بھرا ہے شاید ہی کسی نے بھرا ہو۔ گمنام سے گمنام ادیبوں کی مدد کی۔ ان کے مضامین درست کر کے ساقی میں شائع کئے۔ اُن کے مجموعے چھاپے اور انہیں بقائے دوام کے دربار میں لا کھڑا کیا۔ آزاد نے عبدالرحیم خان خاناں کی دریا دلی کے افسانے سنائے ہیں شاہد صاحب کی فراخ حوصلگی کا ذکر کرنے کے لیے بھی ایک دفتر درکار ہے ساقی کا دفتر ایک زمانے میں ادیبوں کی مرادیں پوری کرنے والا آستانہ تھا جسے نہ دے مولا اسے دے آصف الدولہ۔ شاہد صاحب نے معمولی مسودوں کی منہ مانگی قیمتیں ادا کیں۔ سینکڑوں لکھنے والوں کو تنگی معاوضے دیئے۔ ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ سفر اور حضر میں معاونت کی۔ غرض یہ کہ کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹایا۔ ان کے دفتر میں چوریاں ہوتی تھیں۔ ہر زمانے کے نوکر چوری کرتے ہیں۔" شاہد صاحب کے سامنے مقدمہ پیش کیا جاتا

تو وہ ہنس کے ٹال دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک کلرک پر بے ضابطگی کا الزام تھا۔ دفتر سے رسالے چرا کر بازار میں بیچتا تھا۔ جب جرم ثابت ہوگیا تو شاہد صاحب کے ایک ماتحت نے اسے یہ سزا سنائی کہ اس کی تنخواہ سے ہر ماہ بیس روپے کاٹ لیے جائیں۔ شاہد صاحب تک بات پہنچی تو انھوں نے تنخواہ میں چالیس روپے کا اضافہ کر کے بیس روپے ماہوار خرد برد کے حساب میں وضع کرنے کا حکم دیا۔ لوگ ان کے دفتر سے سالنامے مانگ کرلے جاتے اور بازار میں فروخت کردیتے تھے۔ شاہد صاحب کو پتہ چلتا تو کہتے بیچارے کو ابتد ضرورت ہوگی جو اس فعل پر آمادہ ہوا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ کوئی صاحب مسمی صورت بنائے ساقی کے دفتر میں وارد ہوئے۔ کچھ رقم کا سوال کیا۔ کہتے تھے ان کی بیوی سخت بیمار ہے۔ شاہد صاحب نے فوراً مدد کی۔ شام کو جب یہ ناولٹی پر اپنے دوستوں کے ساتھ فلم دیکھ رہے تھے تو انہیں یہ دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی کہ وہ صاحب کسی برقعہ پوش خاتون کے ہمراہ ان سے اونچی کلاس میں تشریف فرما تھے۔ شاہد صاحب نے انہیں وقفے کے دوران دیکھا اور دوستوں سمیت اُٹھ کر چلے آئے دو ایک ساتھیوں نے اعتراض بھی کیا مگر یہ بولے "میاں اس کے عیش کو دیکھ کر برہم کیوں ہوتے ہو۔ خدا جانے بے چارہ کب سے ملاقات کو ترستا ہوگا۔

چکوا چکوی دو جنے اِن مت مارے کوئے

یہ مارے کرتار کے رین بچھوہا ہوئے

مغربی ناقدین کا کہنا ہے کہ اسلوب تحریر ادیب کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے۔ مشرق میں اس کی جیتی جاگتی مثال شاہد احمد دہلوی کی تحریریں ہیں۔ وہ سیدھی سادھی ہلکی پھلکی نثر لکھتے تھے۔ ان کی سرشت کا جمہوری عنصر ان کی تحریریں سرایت کر گیا تھا۔ میر تقی میر کی طرح وہ جامع مسجد کی سیڑھیوں سے زبان کی سند لیتے تھے۔ انہیں دلی کے ہر طبقے کی گفتگو پر ایسا عبور تھا کہ جس لب و لہجے میں چاہیں من و عن لکھ سکتے تھے۔ وہ بیگماتی زبان بھی لکھتے تھے اور دلی کی کرخنداری اور بازاری بولی لکھنے پر بھی انہیں قدرت حاصل تھی آخر عمر تک وہ عمومی مجمعوں میں عوام کی گفتگو کے رموز اور داؤں پیچ بڑے غور سے دیکھتے اور سنتے رہے اسی وجہ سے ان کی تحریروں میں ایک زبانوی ارتقا ملتا ہے۔

شاہد احمد دہلوی کو سمجھنے کے لیے جہاں آباد کی اس روایت کو سمجھنا ضروری ہے جس نے اپنی گود میں شرافت، وضعداری، ایثار، خلوص اور محبت کے احساسات کی پرورش کی تھی۔ اسی روایت کا نام دہلویت ہے۔ دہلویت جس میں لال قلعے کی عظمت و تجمل بھی پرتو فگن ہے اور جامع مسجد کی وسعت و پاکیزگی بھی کارفرما ہے۔ اس دہلویت کی تخلیق میں مغلوں کی قلبی وسعت فطری لطافت، میر اور درد کے سوز و گداز اور غالب کی انسان دوستی نے حصہ لیا تھا۔ یہ دہلویت جو ہمارا ثقافتی متاع ہے، اسی کا نام تھا شاہد احمد دہلوی۔ شاہد احمد دہلوی اب ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن اُن کی یاد سے جگمگاتا ہوا یہ شاندار ایوان ان کی چھوڑی ہوئی روایت کے احیاء کی خوش آیند بشارت دے رہا ہے۔

ہر اہل دل کی طرح بیماریٔ دل نے ہی شاہد احمد دہلوی کا کام تمام کیا۔ دلّی ان کا دل تھی۔ دلّی ان سے کیا بچھڑی ان کے لیے بیماریٔ دل بن گئی۔ وہ ساری زندگی دہلی کی وزنی یاد کو اپنے نام کی پشت پر ڈھوئے ڈھوئے پھرتے رہے۔

بقول ابراہیم جلیس یہ عجیب بات ہے کہ سب انسان تو ایک بار مرتے ہیں لیکن شاہد صاحب دو بار مرے۔

۱۹۴۷ء میں ان کی پہلی موت واقع ہوئی اور
۱۹۶۷ء میں وہ آخری بار انتقال کر گئے۔

ع ہمیشہ رہے نام اللہ کا......

ﷲ

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی

شفیق الرحمٰن قدوائی

اُس زمانے میں شال سب لوگ نہیں اوڑھا کرتے تھے۔ بس کچھ لوگ تھے اور ایسے ہر زمانے ہوتے ہیں کہ جو چاہے گھر سے پہن کر نکل آئیں، دیکھنے والوں کو وہ اچھا لگنے لگتا ہے۔ سفید براق کھدر کے کرتے پھر جواہر کٹ واسکٹ اوپر سے بادامی یا خاکستری رنگ کی شال سر پر گاندھی ٹوپی ذرا ترچھی خوب صورت، ترشی ہوئی باوقار داڑھی۔ گندمی چہرے پر سنہرے فریم کی عینک۔ ہاتھ میں ایک چھڑی اور لبوں پر ہر لحظہ کھیلتی ہوئی جادو بھری مگر مانوس مسکراہٹ جو ان کے وجود کی علامت بن گئی تھی اور آج تک شناساؤں کی محفل میں ان کا نام آتے ہی پھیل جاتی ہے۔ میں نے ان کو ہمیشہ ایسا ہی دیکھا۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ وہ زمانہ طالب علمی میں بڑے خوش پوش تھے، بڑا قیمتی لباس پہنتے۔ ریشم انھیں بہت پسند تھا۔ ابھی علی گڑھ کے ایم اے او کالج میں بی اے فائنل میں پہنچے تھے کہ گاندھی جی اور علی برادران نے غیر ملکی سامان کے بائیکاٹ کی اپیل کی۔ انھوں نے ایک روز اپنے سارے کپڑوں کو جمع کر کے آگ لگادی۔ اس وقت سے وضع قطع بدل گئی۔

رشید احمد صدیقی صاحب لکھتے ہیں:

"ان کا کھدر دیکھ کر کچھ ایسا خیال آتا جیسے دنیا میں پہلے پہل کپڑے کا اطلاق اسی پر ہوا جو شفیق صاحب کے حصے میں آیا تھا اور خود ان کو اور ان کی سج دھج کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا کہ

دنیا کسی کا کچھ بگاڑ سکتی ہو یا نہیں شفیق صاحب کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ بگڑ جانے کی چیز شفیق صاحب نے اپنے پاس رکھی ہی نہ تھی :

اس لباس اور وضع قطع کے پیچھے باغیانہ ادا بھی تھی اور مزاج کی قلندری بھی۔ باغیانہ اس لئے سامراج کے خلاف صف آزما ہونے کے لیے صرف حکومت سے بغاوت کا جذبہ ہی کافی نہ تھا خود اپنی پرانی زندگی کی ساری نشانیوں کو تج دینا لازم تھا جو جاگیردارانہ سماج کی خاندانی وجاہت، دنیوی حیثیت اور خوشحالی سے وابستہ تھیں اور قلندرانہ اس لیے کہ ورثے میں پائی ہوئی وفاداری کے آداب سے بے پروائی ان کا مزاج بن گئی تھی۔

۱۹۲۰ء میں انھیں ایم۔اے۔او کالج سے ان کی سرگرمیوں کی بنا Rusticate کر دیا گیا اور ان کے والد حبیب الرحمٰن صاحب کو بذریعہ تار پرنسپل نے اطلاع دی کہ اپنے بیٹے کی حرکتوں کے ذمہ دار اب وہ خود ہوں گے۔ تار پڑھا گیا تو باپ پر بجلی ٹوٹ پڑی جرم یہ تھا کہ بیٹے نے نان کوآپریشن کی پالیسی کے تحت دوسرے نوجوانوں کے ساتھ مل کر ایم۔اے۔او کالج کے غلامانہ کردار کو تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ کچھ عرصے بعد انھیں تحریک کے کام کے سلسلے میں آندھرا بھیجا گیا جہاں وہ گرفتار کر لیے گیے۔ گاندھی جی نے اپنے اخبار ینگ انڈیا کے ۳ نومبر ۱۹۲۱ء کے شمارے میں لکھا :۔

"Mehmood Husain and Shafiqur Rehman Kidwai are the students of National University. They were posted in Andhra District by Maulana Mohammad Ali. They were doing there great work in most unassuming manner.

پھر تفصیل سے ساری رپورٹ درج کرتے ہیں جس میں یہ بھی ہے کہ مجسٹریٹ نے ان کے کردار اور عزم کی بنا پر کہا کہ

"Gentleman! it is a painful duty to sentence men of your stamp".

پھر گاندھی جی لکھتے ہیں :

"I do not know whom to congratulate most, the brave youngmen, the magistrate andthe police or the Principal who has moulded the character of these youngmen. As forthe Government which sends such innocent men to prison, I can only say it is diggingits own grave in a way no Non-cooperation can".

وہ ویلور جیل میں رکھے گئے۔ یہاں راج گوپال اچاری بھی تھے۔ راجہ جی ان سے جس قدر متاثر ہوئے اس کا اظہار انھوں نے اسی زمانے میں اپنی ڈائری میں کیا اور شفیق صاحب کے انتقال کے وقت اپنے تعزیتی پیغام میں انھیں a saint in the disguise of a friend کہہ کر ڈائری کی یہ عبارت جو ۱۱ مارچ ۱۹۲۲ء کو درج کی گئی تھی یوں نقل کی۔

"Of Shafiqur Rehman of Aligarh, what shall I say? I count it as a privilege to know such a man - I have not known a better young man or a more self-restrained, a more truelygod-fearing, fineror nobler soul".

ان کی گرفتاری پر کہرام برپا ہو گیا جس لڑکے کے بارے میں سوچا تھا کہ ولایت جائے گا۔ واپس آکر بڑے عہدوں پر فائز ہوگا وہ حکومت کی نگاہوں میں مجرم ٹھہرا۔ خاندان کی عزت خاک میں مل گئی۔ والد نے عاق کر دیا اور پھر مدتوں انھوں نے گھر کا رخ نہ کیا۔ وقت گزرتا گیا۔ مولانا محمد علی شفیق الرحمن صاحب سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی جلاوطنی پر افسردہ تھے چنانچہ وہ حسن الرحمن صاحب کے پاس آئے اور سمجھا بجھا کر ان کی خطا معاف کرائی مگر ان پر ایک رنگ چڑھ چکا تھا۔ ماں باپ اور اعزا جذبۂ آزادی اور جامعہ کے تعلیمی کاموں میں ان کی سپردگی کی کیفیت دیکھ کر دھیرے دھیرے ان کی اس باغیانہ قلندری کا احترام کرنے لگے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ ان کی شادی کا ہے۔ مجھے ان کی ڈائری میں ملا ہے ۱۴ جولائی ۱۹۳۲ء کو وہ لکھتے ہیں۔

تقریباً چھ بجے ہمشیرہ عزیزہ زبیدہ سلمہا سے معلوم ہوا کہ والدہ کا ارادہ ہے بعد نماز جمعہ بتاریخ ۱۵ جولائی میرا عقد بلا کسی اطلاع کے کر دیا جائے میں نے جمعہ کے دن دوپہر کو بارہ بجے میں ایک عزیز دوست کی دعوت قبول کر لی تھی وہاں جانا ضروری تھا

اس لیے میں نے تجویز کیا کہ جمعرات کی رات کو ہی فراغت ہو جائے۔ چنانچہ جمعرات کی رات،
کو والد مسجد میں ٹھہر گئے ...... کچھ چھوارے فراہم کر لیے گئے تھے۔ میں نماز عشا پڑھ کر
واپس آیا تھا کہ پھر والد نے بلایا اور چند اعزا گھر کے جو موجود تھے ان کو بھی بلایا اور خود
ہی نکاح پڑھ دیا۔"

شادی اپنے سگے چچا کی بیٹی صدیقہ بیگم سے ہوئی تھی۔ چچا اپنے بھتیجے کا حال جانتے تھے
بھائی کے مشورے سے طے کیا کہ انھیں کچھ دینا دلانا بے کار ہے۔ سب ضائع ہو گا کسی چیز کی انھیں
ضرورت ہی نہیں مگر جو کپڑے وہ پہنتے ہیں، پرانے ہو گئے ہیں اس لیے کھدر کے کچھ نئے جوڑے بنوا دیے
جائیں۔ کیونکہ خود ان کے پاس اتنے پیسے کبھی نہ ہوں گے۔

آزادی کے چند سال بعد انھیں یونیسکو کے تعلیمی مشن کے نگراں کی حیثیت سے انڈونیشیا بھیجا
گیا۔ خواجہ غلام السیدین صاحب کا کہنا ہے کہ اپنے تجربے اور انہماک کی بنا پر پیرس میں یونیسکو کے
ہیڈ کوارٹرز میں ان کی بڑی شہرت اور مقبولیت تھی۔ کیونکہ تعلیم بالغان اور سماجی تعلیم کے میدان میں
اتنا کام اس وقت تک کسی نے نہیں کیا تھا۔

۱۹۵۲ء میں پہلے عام انتخابات ہوئے۔ ان کی عدم موجودگی میں فیصلہ کیا گیا کہ وہ اجمیری گیٹ
کے حلقۂ انتخاب سے دہلی اسمبلی کے لیے کھڑے ہوں۔ انھوں نے سختی سے انکار کر دیا۔ یہاں سے
پیغام پر پیغام بھیجے گئے مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ اور اپنے جائے قیام چھوڑ کر کہیں اور چلے
گئے تاکہ کوئی ان سے رابطہ قائم ہی نہ کر سکے۔ بالآخر کانگریس کے عمائدین نے تنگ آ کر ان کے دوست
وی۔ ایس ماتھر صاحب کو انڈونیشیا بھیجا۔ ماتھر صاحب کو راستے ہی میں معلوم ہوا کہ وہ جکارتا سے
غائب ہو چکے ہیں چنانچہ وہ ان کا پیچھا کرتے ہوئے چلے اور انھیں سنگاپور میں پکڑا۔ مگر انھوں نے ماتھر
صاحب کی ایک نہ سنی خود انڈونیشیا چلے گئے ماتھر صاحب کو دہلی واپس کر دیا۔ انڈونیشیا میں ذاکر صاحب
کا تار جواہر کے لیے حکم نامہ تھا۔ پہنچ گیا تو انھوں نے نامزدگی کے کاغذات پر دستخط کر کے بھیجے۔
الکشن کا ہنگامہ شروع ہوا۔ وہ انڈونیشیا سے چلے مگر راستے سے غائب ہو گئے۔ دہلی میں ان کا انتظار ہوتا رہا۔
اور وہ الکشن کے خاتمے کے انتظار میں حیدر آباد، اورنگ آباد، بمبئی میں اپنے دوستوں کے ہاں
چھپتے چھپاتے گھومتے رہے۔ حریف مخالف کی طرف سے کہا جانے لگا کہ شفیق الرحمٰن قدوائی کا تو

وجود نہیں ہے۔ وہ کب کے مر چکے ہیں۔ چنانچہ میری والدہ کو گھر گھر ان کی تصویر کے ساتھ یہ کہنے کے لیے جانا پڑا کہ زندہ ہیں مگر ضروری کاموں میں مصروف ہیں۔ اس لیے نہیں آسکے۔ الکشن لڑایا جاتا رہا۔ ہمدردوں اور خیر خواہوں کی جان پر بنتی رہی۔ نتیجہ آیا تو اپنی تمام کوششوں کے باوجود وہ کامیاب ہو گئے تھے۔ اس کے بعد وہ ایک دن گھومتے پھرتے دہلی پہنچ گئے۔ اسٹیشن سے سیدھے دوستوں کے گھر گئے۔ سب کو منایا۔ ہنسایا۔ راضی کیا۔ پھر حلقہ انتخاب کے ایک ایک گھر پر شکریہ ادا کرنے گئے۔ یہ سب ہو ہی رہا تھا کہ دہلی میں وزارت سازی کا وقت آیا۔ اب یہ پھر غائب ہو گئے۔ لکھنؤ اور اس کے آس پاس اپنے اعزا اقربا سے ملتے ہوئے ہر روز جائے قیام بدلتے رہے۔ تلاش شروع ہوئی۔ سندیلے میں ملے۔ لکھنؤ لائے گئے۔ اپنے ایک بھائی جسٹس مشیر حسین قدوائی کے ہاں بیٹھے جن سے وہ بے حد محبت کرتے تھے، مزے مزے کی باتیں کر رہے تھے کہ جواہر لال جی کا فون پہنچا۔ یہ اُٹھ کے بھاگنے لگے۔ بھائی نے ڈانٹا فون پر بتا دیا کہ وہ موجود ہیں اور تھما دیا۔ اب کیا کر سکتے تھے۔ دہلی جانا پڑا۔ نہرو جی نے خواہش ظاہر کی کہ وہ وزیر تعلیم کا عہدہ سنبھالیں انھوں نے لکھا کہ انھوں نے اپنی ساری زندگی جامعہ کے لیے وقف کر رکھی ہے اس لیے اس سلسلے میں جو بھی معاملہ ہو وہ جامعہ سے کیا جائے۔ جامعہ نے حکم دیا تو وہ وزیر بھی ہو جائیں گے۔ آخر کار وہ دہلی اسٹیٹ میں تعلیم، مالیات اور صنعت کے وزیر ہو گئے۔ مبارک سلامت ہونے لگی۔ ایک عزیز کو انھوں نے جواب دیا کہ جواب تک بادشاہ رہا اُسے وزیر بنا دیا گیا یہ کون سی ترقی ہے۔

وزارت کا حلف لینے کے بعد گلی بتیا محل میں اپنے گھر پہنچے تو دیکھا کہ پولیس کی ایک گارد لگی ہوئی ہے۔ سیکریٹری سے پوچھا تو پتہ چلا کہ ان کی جان کی حفاظت کے لیے یہ انتظام کیا گیا ہے۔ سنتے ہی تن بدن میں آگ لگ گئی۔ کہنے لگے کہ جن لوگوں کا دن رات کا ساتھ رہا۔ بُرے بھلے میں کام آئے ان سے اب میری جان کو خطرہ ہونے لگا۔ ان کو ہنستے ہوئے تمام عمر دیکھا تھا برہم ہوتے ہوئے کسی نے نہ دیکھا تھا۔ سو اس کا تماشا دیکھ لیا۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے ایک ایک سپاہی کو اپنے سامنے روانہ کیا۔ سرکاری افسر جو ساتھ آئے تھے اس منظر کو دیکھ کر سہم کر چلے گئے۔ پھر ضابطہ پورا کرنے کے ایک سپاہی بھیجا گیا۔ جو تھوڑی دیر بعد گھر کے سامنے سے گزر جاتا والد کو آتا جاتا دیکھ کر ادھر ادھر ہو جاتا تھا وہ گول مٹول سا دلچسپ آدمی تھا۔ دن بھر گلی کے بچوں کے ساتھ کھیلتا۔ کھانے، چائے

کے وقت بلایا جایا کرتا تھا۔ جب مٹکاف روڈ کی سرکاری رہائش گاہ پر منتقل ہونے کا سوال آیا تب بھی بے حد غم وغصہ کا اظہار کرتے رہے مگر بالآخر مجبور ہونا پڑا۔

وزارت میں آنے کے بعد ان کا دلی کے گلی کوچوں میں گھومنا ختم ہوگیا۔ جامعہ کے عیش ختم ہوگئے اور پھر رسمی تقریبات نے انھیں اس درجہ افسردہ کیا کہ ان کی مسکراہٹ میں اب کرب کی جھلک صاف نظر آنے لگی۔ اب بھی وہ بھاگ نکلنے کی کوشش کرتے تھے۔ مجمع سے نکلتے ہی کار سے اُتر آتے اور ڈرائیور کو ہدایت کر دیتے کہ اتنے بجے فلاں مقام پر مل جانا اور پیدل چل نکلتے مگر زندگی یوں کتنے دن گزر سکتی تھی۔ دل کا سخت دورہ پڑا۔ تین ماہ کی بیماری کے بعد ۲ اپریل ۶۵۲ کو سدھار گئے۔ وزارت سے ان کی اتنی الجھن کے باوجود انھوں نے کچھ ایسا کیا کہ یہاں بھی ان کی کارکردگی کو سراہا گیا۔ اور اس کا اثر اس قدر بڑھا کہ انتقال کے بعد خلا محسوس کیا جانے لگا۔ دہلی کانگریس پارٹی میں اختلافات ہوئے بالآخر دہلی اسٹیٹ ہی توڑ دی گئی۔ جواہر لال جی نے صدر کانگریس کی حیثیت سے انکوائری کی اور اپنی رپورٹ میں لکھا کہ:

> (The differences) have been aggravated..... during last year or so, ever since the unfortunate death of Mr.Shafiqur Rehman Kidwai, who was...... universally liked and respected by all for his ability and sterling qualities. His death created a serious gap which could not be easily filled.

میری والدہ پر والد کی شخصیت کا گہرا اثر پڑا۔ جو ان کی زندگی میں گھر سے نکلی نہ تھیں انھوں نے والد کے انتقال کے بعد ان کا کام سنبھالا۔ اور پرانی دلی کے کئی محلوں میں عورتوں اور بچوں کی تعلیم وترتیب کے لیے جامعہ کی نگرانی میں بالک ماتا سینٹر قائم کیے جو آج تک جیبیہ قدوائی صاحبہ کے زیر نگرانی چل رہے ہیں اور جن کی بدولت بچوں کی دو تین نسلیں اپنے گھروں سے نکل کر زندگی کے میدان میں داخل ہو چکی ہیں میری والدہ والد کے انتقال کے بعد صرف پانچ سال زندہ رہ سکیں مگر ان پانچ برسوں میں وہ دہلی میونسپل کارپوریشن اور پھر راجیہ سبھا تک پہنچیں۔ جب والد کی یادگار کے

کے طور پر آل انڈیا اولڈ ایجوکیشن ایسوسی ایشن نے اندر پرستھ اسٹیٹ میں شفیق میموریل عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے جواہر لال جی کو بلایا تو والدہ نے کہا کہ سنگ بنیاد جواہر لال جی نہیں بلکہ دلی کا وہ شخص رکھے گا جس کو تعلیم بالغان کا ادارہ شروع کرتے وقت سب سے پہلے شفیق صاحب نے لکھنا پڑھنا سکھایا تھا۔ چنانچہ نہرو جی آئے۔ مگر ان کی موجودگی میں جامعہ کے ایک گاڑی کے ڈرائیور محمد علی نے سنگ بنیاد رکھا۔ اس موقع پر نہرو جی نے ان کے بارے میں کہا :

"He was that rare type of human being that was the salt of the earth, not seeking public acclaim, quietly working away, not losing heart, whatever happened, in fact, cheering up others who, at times might ~~thxxx~~ lose their hearts".

میری آنکھ جامعہ میں کھلی۔ جامعہ جنگ آزادی کا ایک محاذ تھی جہاں پہلے دن سے سامراجی حکومت کے خلاف بغاوت کا سبق دیا جاتا تھا اور یہ بتایا جاتا تھا کہ جامعہ کے طالب علموں کو ہندوستان میں کوئی اعلیٰ عہدہ تو کیا معمولی ملازمت بھی نہیں مل سکتی کیونکہ حکومت کی نظروں میں وہ معتوب ہوں گے۔ اس لئے یہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھیں زندگی گذارنے کا کوئی اور ہی ڈھب نکالنا ہوگا۔ یہ سب ہو رہا تھا کہ آزادی آگئی۔ جامعہ نے نئی حکومت کی مالی امداد کو قبول کیا اور یہاں کا نظام بدلنے لگا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب بائیں بازو کی جماعتوں نے آزادی کو فریب قرار دیا۔ اسٹوڈنٹ فیڈریشن اور انجمن ترقی پسند مصنفین اسی نعرے سے متاثر تھی۔ میں اگرچہ ابھی اسکول میں تھا مگر جامعہ کی تعلیم و تربیت نے سیاست سے گہری دلچسپی شروع سے پیدا کردی تھی، چنانچہ میں نے جامعہ میں ان ہی جماعتوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ میرے والد اپنے سخت گاندھیائی نقطہ نظر کے باوجود مجھے اپنی سرگرمیوں سے باز رکھنے کی کوشش کرنے کی بجائے آزادانہ طور پر سوچنے کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ بزرگانہ نصیحتوں کی جگہ مشفقانہ بے تکلفی کے ساتھ بحثیں کرتے۔

فقرے چست کرنے اور مجھے اپنی بات کہنے پر طرح طرح سے اُکساتے اسی لیے مجھے ان کی موجودگی میں کبھی اس ہیبت کا احساس نہیں ہوا جو باپ کے روایتی پیکر سے وابستہ ہے۔ جب ملک سے باہر گئے تو ہدایت کی کہ میں پابندی سے ہندوستان کے سارے حالات پر اپنا تبصرہ انھیں بھیجا کروں میں نے ایک بار جامعہ کے بارے میں انھیں کچھ لکھا۔ انھوں نے جواب میں لکھا:

"جامعہ کی بدانتظامیوں کو کہاں تک شمار کروگے۔ جامعہ کی وجہ سے دیکھو کوریا میں کیا ہو رہا ہے۔ اور کوریا کیوں جاؤ۔ دیکھو ہندوستان میں کیا کیا تباہیاں ہو رہی ہیں۔ اور یہاں جنوب مشرقی ایشیا کا حال مجھ سے پوچھو اس میں بھی مجھے جامعہ کی بدانتظامیوں کی جھلک نظر آتی ہے لیکن خدا کرے کہ جامعہ کی تمام بد انتظامیوں کے باوجود تم اس سال اپنے امتحان میں پاس ضرور ہو جاؤ۔ تصویریں، نوٹ اور ٹکٹ صرف تمہارے لیے بھیج رہا ہوں عتیق میاں کو الگ بھیجوں گا۔ ورنہ تمہارا کیا ٹھکانہ! ان کا حصہ بھی کھا جاؤ اور اس کا الزام بھی جامعہ کے سر منڈھ دو۔"

۱۹۴۹ء۔۵۰ کا زمانہ ہے۔ جامعہ ملیہ میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے دنیا جہان کے معاملات پر باتیں کر رہے ہیں۔ ان ہی باتوں میں جامعہ کے مسائل پر گفتگو ہونے لگتی ہے۔ اسٹوڈنٹ فیڈریشن اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں کا ذکر چھڑتا ہے۔ اسی دوران ایک صاحب کہتے ہیں "شفیق صاحب آپ کا بیٹا آپ سے باغی ہو گیا ہے۔" وہ جواب دیتے ہیں "جب میں نے خود اپنے باپ سے بغاوت کی تو میرے بیٹے کو بغاوت کا حق کیوں نہ ہو۔" جو لوگ بیٹھے ہیں لطف اندوز بھی ہوئے ہیں اور متعجب بھی، جامعہ کے ارباب حل وعقد میں سے ایک شخص جامعہ کے مسائل کے بارے میں فکر مند بھی ہے اصولوں کا پابند بھی اور اپنے بیٹے کا باپ بھی۔

جامعہ کے بہت سے بزرگوں خصوصاً میرے اساتذہ نے اس گفتگو کا ذکر بارہا مجھ سے کیا ہے۔ اور اس وقت مجھے ان کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک دکھائی دی ہے جس میں محبت بھی ہوتی ہے اور غرور بھی کیونکہ یہ جامعہ کے ایک کارکن شفیق الرحمٰن کا فقرہ ہی نہیں ہے۔ اس جمہوری تمدن کی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو کسی زمانے میں جامعہ ملیہ کے ماحول سے عبارت تھا۔ جامعہ عجیب جگہ تھی یہاں آنے والے اپنی ساری کشتیاں جلا کر آتے تھے۔ کھاتے پیتے گھرانوں کے لوگ عیش وعشرت

کی زندگی چھوڑ کر، یورپ کے بہترین اداروں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے لوگ مستقبل کی ترقیوں کے امکانات پر خاک ڈال کر ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے پڑھے لکھے لوگ اپنی ملازمتوں کو ٹھکرا کر یہاں آیا کرتے تھے۔ چند برسوں تک مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کے اثر سے اس کی مالی کفالت کچھ متمول لوگ کرتے رہے۔ حکیم اجمل خاں کے انتقال کے بعد جامعہ کے بند ہونے کی نوبت آگئی۔ مگر کارکنوں نے فیصلہ کیا کہ جامعہ بند نہیں ہوگا۔ تمام عمر کم سے کم تنخواہ پر کام کریں گے۔ شفیق الرحمن صاحب ۱۹۲۰ء میں پھر گرفتار کرلئے گئے تو دہلی کے چیف کمشنر نے نظام کی امداد بند کردی جب وہ جیل سے نکلے تو انھوں نے حلقہ ہمدردان جامعہ قائم کیا۔ جامعہ کی مالی مشکلات بڑھ گئیں مگر اس میں جامعہ والوں کو ایک نیا چیلنج نظر آیا۔ ڈاکٹر محمد اکرام خاں کا کہنا ہے کہ وہ ایک بار دہلی کے چند دولت مند لوگوں سے بہت بڑی رقم لے کر شفیق الرحمن صاحب کے پاس آئے۔ وہ خوش تھے کہ ان کے کارنامے کی داد ملے گی۔ مگر ہوا الٹا۔ شفیق الرحمن صاحب نے کہا کہ یہ سب روپیہ جاکر واپس کر آیئے اور بجائے چند لوگوں کا بہت سا روپیہ قبول کرنے کے زیادہ لوگوں کے پاس جاکر تھوڑا پیسہ لایئے کیونکہ جامعہ کا مقصد ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے عوام کی بڑی تعداد کو جامعہ کی تعلیمی مہم میں شریک کرنا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اہل ثروت کے بے جا اثر و اقتدار سے جامعہ کو بچانا بھی ہے۔ جامعہ نے انگریزی حکومت کی امداد بھی کبھی قبول نہیں کی اگرچہ اس کے اشارے بار بار ہوئے۔ یہ ٹھسا اور طنطنہ اس زمانے کا ہے جب سال سال بھر تنخواہ نہیں ملتی تھیں۔ گھر میں فاقے ہوتے تھے۔ قرول باغ سے جامع مسجد اور چاندنی چوک تو کیا او کھلے تک بھی بسا اوقات پیدل جانا پڑتا تھا۔ استغنا اور بے پروائی کا یہ زمانہ بھی خوب تھا۔ دیکھنے والوں کے لیے یہ قربانیاں تھیں۔ مگر شفیق الرحمن صاحب اور جامعہ والوں کے لئے تو اسی زندگی میں ایک عیش تھا۔ ایک کبھی نہ ٹوٹنے والا نشہ۔ وہ ہاکی کے بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ دہلی کے ٹیم میں تھے۔ گانا اچھا گاتے تھے۔ باقاعدہ سیکھا تھا۔ اور کلاسیکی موسیقی کے ریکارڈ بہم۔ لوگوں کو اپنے پاس بیٹھا کر سناتے تھے۔ جب پیسے ہوتے تو بہت اچھا کھانا کھاتے تھے۔ خواجہ غلام السیدین نے ایک جگہ لکھا ہے:

"میرے ایک دوست نے بیان کیا کہ شفیق صاحب اکثر قرول باغ سے جامع مسجد

پیدل جاتے ہیں۔ وہاں ایک نانبائی کی دوکان پر چند آنے دے کر کھانا کھاتے ہیں پھر نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ اپنے کام میں ڈوب جاتے ہیں۔ اگر کوئی انھیں ایسے موقع پر پکڑ لیتا تو اس وقت ان کے چہرے کی بشاشت ان کے جادو اثر تبسم اور ان کے سکون و اطمینان کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کا سارا عیش و آرام اور تمام راحتیں ان کے قدموں بکھری ہوئی ہیں۔ غالباً یہی سکون باطن تھا جس نے شفیق کی آنکھوں کو وہ چمک، وہ معصوم شرارت اور بے لوث محبت کی وہ بے ساختگی اور تابانی بخشی جو آپ کو بچوں کی آنکھوں میں نظر آتی ہے۔ اٹھائیس سال کے عرصے میں ان کی آنکھوں کی اس چمک کے اوپر امتدادِ زمانہ کا مطلق کوئی اثر نہیں دیکھا۔"

۱۹۴۷ء تک وہ فیض روڈ پر رہتے تھے، فسادات ہوئے۔ وہ پناہ گزینوں کی مدد کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ ہمارا گھر بھی لُٹ گیا۔ وہ بس وہی ایک جوڑا کپڑا لئے ہوئے جوان کے جسم پر تھا نکل آئے اور رفیوجی کیمپوں میں کام کرنے۔ گوپی ناتھ امن صاحب کو جوان کے بہت پرانے اور عزیز دوست تھے پتہ چلا تو وہ ڈھونڈھتے ہوئے ان کے پاس پہنچے۔ امن صاحب لکھتے ہیں:

"سراسیمگی کے عالم میں ان سے ملنے پہنچا تو دیکھا کہ وہی مسکراہٹ ان کے لبوں پر کھیل رہی ہے جو مصائب کا مقابلہ کرنے والوں کی روایتی علامت ہے۔ اپنے سامان لٹنے کا حال کچھ اس طرح بیان کیا گویا کوئی مزاحیہ افسانہ سنا رہے ہوں۔ مجھے اظہار ہمدردی کرنے کی جرأت بھی نہ ہوئی۔"

۱۹۴۷ء کے بعد مٹیا محل میں خواجہ محمد شفیع کے مکان میں رہنے لگے۔ یہ مکان خواجہ شفیع صاحب کے پاکستان جانے کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کی حفاظت میں تھا۔ مولانا نے میرے والد کے حوالے کیا اور یہیں جامعہ ملیہ کا شعبۂ تعلیم و ترقی قرول باغ سے منتقل ہو گیا۔

انھوں نے عمر بہت کم پائی۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۱ء سے ۲ اپریل ۱۹۵۳ء تک کل اکاون سال تین ماہ اس دنیا میں رہے۔ مگر یہ نصف صدی کچھ ایسی تھی کہ اس میں ہمارے ملک نے صدیوں کا فاصلہ طے کر لیا۔ زماں و مکاں کے ان حدود کے اندر تیز رفتار تبدیلیاں افراد کو اپنے

سانچے میں ڈھالے بغیر کیسے رہ سکتی تھیں۔ وقت کا چیلنج تو ہر زمانے میں رہا ہے مگر اس چیلنج کو قبول کرنے والے افراد اتنے کبھی نہ دیکھے گئے جتنے کہ بیسویں صدی میں نمودار ہوئے۔ شفیق الرحمٰن قدوائی ایسے ہی لوگوں میں تھے۔

ان کے انتقال کے وقت میں انٹرمیڈیٹ میں پڑھ رہا تھا۔ میری بہن اور دو بھائی تو بہت ہی چھوٹے تھے۔ ہمارا ان کا ساتھ بہت ہی کم رہا۔ ان کے بارے میں بزرگوں سے بہت کچھ سُنا۔ اخباروں رسالوں میں پڑھا اور کچھ ان کے کاغذات میں پایا۔ مگر ہم نے جو دیکھا وہ بہت تھوڑا تھا۔ اور جتنا ان کے بارے میں سنتے رہے اپنی محرومی کا احساس اور بڑھتا رہا۔ پھر بھی اکثر سوچتا ہوں۔

یہ ایک تبسم بھی کیسے ملتا ہے

☆☆

ڈاکٹر جاوید وششٹ

شمیم کرہانی

سادات کرہان کے مورثِ اعلیٰ حضرت میر شمس الدین عرف شمسیؒ صوفیِ صافی و بزرگ مُرتاض تھے۔ انھوں نے سات حج پا پیادہ کیے تھے۔ حضرت شمیم کرہانی مرحوم کے والدِ ماجد سیّد محمد اختر، اختر نے حضرت شمسیؒ کے نام پر شمیم صاحب نام شمس الدین رکھا، گھر میں آپ کو پیار سے "شمسو" بھی کہتے تھے آپ کی ولادت اپنے ننہال پارہ، ضلع غازی پور میں ۸ر جون ۱۹۱۳ء کو ہوئی۔ بچپن کرہان میں گزرا۔ وفات دہلی میں ۱۹ر مارچ ۱۹۷۵ء کو ہوئی۔ ایوانِ غالب کے مشاعرہ میں آپ کیفی اعظمی سے بغلگیر ہو رہے تھے کہ اچانک طبیعت خراب ہو گئی، فوراً ارون ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں لے جایا گیا۔ دماغ کی رگ پھٹ جانے سے موت واقع ہوئی۔ اِنّا لِلّٰہ وَ اِنّا اِلیہ راجعون!

ابتدائی تعلیم، خاندانی رسم ورواج کے مطابق گھر ہی پر ہوئی۔ پھر وثیقہ عربک اسکول فیض آباد میں داخلہ لیا اور وہاں سے مولوی اور کامل کے امتحانات پاس کیے۔ آپ آٹھ نو برس کے سن میں ہی شعر کہنے لگے۔ اس زمانے کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے ؎

نئی طرح کی کشاکش ہے آرزو کے لیے
نہیں، ہے میرے لیے اور، ہاں عدو کے لیے

کسی کو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ شعر آپ کا ہے۔ ابتدا میں منقبتی و رثائی اشعار کہتے تھے۔ حضرت آرزوؔ لکھنوی کے باضابطہ شاگردِ رشید ہوئے۔ سیّد علی جواد زیدی صاحب شاعری کے لنگوٹیا یار تھے۔

ہمہ خانہ آفتاب کے مصداق شمیم صاحب کے بزرگوں میں ان کے والد سیّد محمد اختر اختر

ان کے رشتے کے بڑے چچا حکیم زکی حسین اور چھوٹے چچا سید محمد رسا اور سید احمد علی احمد اور رشتے کے پھوپا سید علی اجواد افسر بھی شاعری کرتے تھے۔ آپ کے منجھلے بھائی سید اعظم حسین اعظم بھی شاعر تھے۔ آپ کے نانا سید محمد صالح صاحب پاروی عالم تھے، ماموں سید عباس حسینی مشہور افسانہ نگار اور بڑے بھائی سید علی بخش غضنفر تھے۔ گویا شمیم صاحب نے شاعری کے آغوش میں آنکھ کھولی۔

بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو شمیم صاحب نے سب سے پہلے ڈی اے وی ہائی اسکول اعظم گڑھ میں فارسی اور اردو کے مدرس کی حیثیت سے ملازمت کی۔ تنخواہ بہت معمولی اور وہ بھی گنڈے دار ملتی تھی۔ آپ نے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ مگر گریجویشن نہ کر سکے۔ اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول، دہلی میں ہی آپ کو داغِ مفارقت دے گئے۔

شمیم صاحب کی بیگم محترمہ کاظمی بانو صاحبہ بڑی سلیقہ شعار، قدیم روایات کی پاسدار، شمیم صاحب کی پرستار، شاعر و ادیب ہیں۔ پروفیسر سید احتشام حسین صاحب مرحوم شمیم صاحب کے ہم زلف تھے۔ تین بیٹے مراد اختر، عابد اختر اور سلمان اختر ہیں۔ مراد اور عابد دونوں شاعر ہیں۔ شمیم صاحب بڑے شفیق باپ تھے۔ مراد میاں باہر چلے جاتے اور لوٹنے میں ذرا دیر ہو جاتی تو شمیم صاحب مضطرب ہو جاتے۔ طرح طرح کے وسوسے ذہن میں آتے، خدانخواستہ کہیں کوئی حادثہ تو پیش نہیں آگیا۔ مجھے ہنسی آتی کہ کس قدر غیر صحت مند فکر ہے۔ بچوں کو بہت پیار کرتے۔ کبھی کبھی میں انھیں کہتا کہ آپ لڑکوں کو خراب کر رہے ہیں۔ تو جواب میں خواجہ میر درد کے شعر میں تحریف کر کے اس طرح پڑھتے:

ان کے ملنے سے منع مت کر

اس میں بے اختیار ہیں ہم

۱۹۴۲ء کی تحریک "بھارت چھوڑو" کے دوران میں شمیم صاحب دن بھر میں ایک باغیانہ نظم کہہ لیتے۔ اس طرح مجموعہ تیار ہو گیا۔ باغیانہ نظمیں "روشن اندھیرا" میں شائع ہوئیں۔ سید علی جواد زیدی صاحب نے مقدمہ لکھا۔ شمیم صاحب کے بھائی سید علی بخش عرف غضنفر حسین کانگریس کمیٹی کے صدر تھے۔ ان کی وساطت سے رفیع احمد قدوائی مرحوم نے "روشن اندھیرا" کی طباعت کے جملہ اخراجات جیب خاص سے ادا کیے تھے۔ لوری کی ضد "جگاوا" نظم کہی۔ آپ کا پہلا مجموعہ "برق و باراں" ہندوستانی بکڈپو نے شائع کیا۔ مجموعہ کے نام سے ہی ظاہر ہے شمیم صاحب

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی مرحوم سے متاثر تھے۔ ان کے علاوہ انیس و چکبست کے رنگِ شاعری کے بھی عاشق تھے۔ لیکن آگے چل کر اپنا مخصوص" رنگِ شمیم" قائم کیا، نکھارا اور چمکایا۔

قدوائی صاحب کے یہاں شمیم صاحب کی فیروز گاندھی سے ملاقات ہوئی۔ ان سے مراسم بہت بڑھ گئے۔ شمیم صاحب کو فیروز گاندھی نے الیکشن میں کانگریسی امیدواروں کی حمایت پر آمادہ کیا۔ لیکن آپ جلد ہی سیاست سے دست بردار ہو گئے۔

اعظم گڑھ کے قیام کے دوران میں شمیم صاحب کی ملاقات وہاں کے قد آور ماسٹر سید منور حسین رضوی سے ہوگئی۔ منور صاحب کے ایک بھائی سید شوکت حسین مشہور فلم ڈائرکٹر اور ملکۂ موسیقی نورجہاں کے شوہر تھے۔ وہ اس وقت پنچولی پکچرز لاہور میں منتقل ہو چکے تھے۔ یہ دونوں بھائی نیشلسٹ خیالات کے تھے اور دونوں ہی شمیم صاحب کی شاعری سے بے حد متاثر تھے۔ شوکت کی طلبی پر شمیم صاحب لاہور گئے، کچھ گانے بھی لکھے لیکن فلم کے کاروباری ماحول میں اُن کا دل نہ لگا اور وہ بہت جلد وہاں سے اعظم گڑھ واپس آگئے۔

۱۹۶۲ء کی بات ہے، میں نے اپنے پہلے مجموعہ" شعلۂ تشنگی" کا انتساب" آشا" کے نام کیا تو شمیم صاحب نے مسکرا کر پوچھا کہ آشا خواب ہے یا حقیقت ؛ میں نے کہا کچھ خواب ہے کچھ حقیقت۔ مگر یہ میرا جذباتی آئیڈیل ہے۔ شمیم صاحب بھی موڈ میں تھے، اپنی نوجوانی کا ایک واقعہ سنایا کہ میری عمر بیس برس کی ہوگی، ایک شام ایک تالاب کے کنارے خانہ بدوش لوہاروں کا قافلہ رُکا تھا۔ یکایک نظر پڑی ایک حسین و معصوم دوشیزہ سے آنکھیں چار ہوئیں۔ لبوں پر مُہرِ خاموشی ثبت ہوگئی۔ مثنوی زہرِ عشق کے ہیرو کی طرح روتے ہوئے اپنے گھر لوٹ آئے۔ مگر اس کا خیال دل و دماغ پر مُسلّط ہو گیا، رات بھر نیند نہیں آئی۔ دوسرے دن شام کو نظارۂ جمال کے لیے پھر وہاں پہنچے۔ اسے پھر دیکھا۔ ایک غزل ہوگئی۔ مگر آج بھی اس سے گفتگو نہ ہو سکی۔ کیونکہ یہاں جرأت رندانہ کا فقدان تھا۔ تیسرے دن قافلہ جا چکا تھا۔ اب وہاں ٹوٹے پھوٹے چولھے اور بجھی راکھ کے سوا کیا رکھا تھا۔ عربی شاعروں کی طرح اس کے چولھے کی نشان دہی کی گئی۔ وہ یہاں بیٹھ کر روٹیاں پکاتی تھی، یہاں بیٹھ کر پتھر کی مورتی کی طرح اپنے آپ میں کھو جاتی تھی۔ بہر حال آج بھی اس کی شکل آنکھوں میں پھرتی ہے۔ اور شعر کا تقاضا کرتی رہتی ہے۔

دھان پان مشرق، لباسِ مغرب میں، ایک پہچان، ایک شاعر، ایک انسان۔ کوٹ پینٹ ٹائی اور عینک کی یک جائی، مگر کالر اور ٹائی میں شکر رنجی، کالر میں قدرے برہمی تو ٹائی میں کچھ بے چارگی۔ یہی کالر اور ٹائی کی برہمی اور بے چارگی، شاعری کی غماز تھی۔ کشیدہ قامت، لکھنوی نزاکت کا سمبل، کرباتی، جاگیردارانہ نفاست کی علامت۔ کشادہ پیشانی، کشادہ دلی کی چاندنی، فراخدلی کی روشنی، انسان دوستی، اخلاص پرستی، مرنجامرنجی۔ عینک کے موٹے موٹے شیشوں کی اوٹ میں کھوئی کھوئی، گہری سوچ میں ڈوبی سی آنکھیں، آنکھوں میں آب زمزم اور گنگا جل۔ گمشدگی و خود فراموشی میں ہی خودیابی کا احساس۔ تصور میں اڑتے رنگین آنچل، رومانی شاعری کی مقطر روح! لبوں پر تبسم کی چاندی، مسکان کا سونا، خلوص کا آئینہ، اخلاص کا آبگینہ۔ نرم دم گفتگو" پر ایسا فل سٹاپ لگا کہ "گرم دم جستجو" تک پہنچنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ بہت ملایم لہجے میں گھلاوٹ میر کی سی خود کلامی، نرمی اور دل گداختگی، تشیعت کے باعث، سرشت وجبلت کا جزواعظم شاہ خرچ مگر تنگ دست، اقتصادیات کی الف بے سے بے نیاز، جاگیردارانہ فراخ دستی سے سازباز ایسے حالات میں بھی شاعرانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ حسن طلب کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے۔ ایک رقعہ بیاض میں ملا ہے:

برادرم

دہر میں یارِ باوفا ہیں آپ! درد سے میرے آشنا ہیں آپ

حال ہے تنگ دستیوں سے تباہ، کیونکہ اب تک ملی نہیں تنخواہ

مختصر کہہ دوں، کیوں دوں میں بھاشن، آج مجھ کو منگانا ہے راشن

غمِ دوراں کو رام کر دیجیے! دس کا بس انتظام کر دیجیے

آپ دنیا میں شادماں رہیے

اپنے یاروں پہ مہرباں رہیے

عالمِ تفکر میں پیشانی پر شکن، جیسے حیاتِ عصر کی تاریخ، تحریر، عبارت۔ پیشانی کی یہی شکن شاعری کی الجھن ریکھا، شعر کا لیکھا جوکھا۔ سر کے لمبے لمبے گھنے کالے بال روئیں روئیں بکھراؤ، فکر کی الجھنوں کا کساؤ، تخلیق کا ٹھہراؤ، آہنگ اور سوچ کا رچاؤ، جنوں کی اوگھٹ گھاٹی۔

فرقت کاکوروی مرحوم سے شمیم صاحب کی بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ "اے فرقت" اور اے شمیم" کا مخلصانہ تخاطب، فرقت صاحب شمیم صاحب کو "اے کھٹمل" کہہ کر پکارتے اور پرُلطف فقروں کی پھلجھڑیاں چھوڑتے تو شمیم صاحب کی ساری پریشانیاں دور ہوجاتیں۔ فرقت صاحب کا مرثیہ کہہ کر میں بغرض اصلاح شمیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جب آپ مرثیہ کے اس بند پر پہنچے تو آنکھیں نم ہوگئیں۔ گلا رُندھ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ بند یہ تھے۔

وہ دوست جس کے لب پہ ہنسی، دل میں درد تھا　　رخسارِ زندگی کا ہر اک رنگ زرد تھا
یکتا تھا طنز میں، تو ظرافت میں فرد تھا　　"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

بزم مشاعرہ سے وہ اوڑھے کفن چلا
کاشی کی سمت جیسے کوئی برہمن چلا

فرقت کے بھولپن میں بھی تھا ایک بانکپن　　نٹ کھٹ پنے کو اس نے بنایا تھا ایک فن
باغ و بہار تھا، وہ ظرافت کا بھولپن　　اپنے ہی قہقہوں کا مگر اوڑھ کر کفن

شعر و سخن کی بزم سے چپ چاپ اٹھ گیا
کاندھوں کا بار بھی نہ ہوا، آپ اٹھ گیا

شمیم صاحب فرقت صاحب کے لیے دیر تک روتے رہے۔ کیسے پرُخلوص دوست تھے۔

پروفیسر سید احتشام حسین صاحب مرحوم کا مرثیہ شمیم صاحب نے چھلکتی آنکھوں اور دھڑکتے دل سے کہا تھا۔ "جان برادر" کا جب یہ بند کہا تو گھر ایک بار پھر ماتم کدہ بن گیا؛ ؎

لاؤ ذرا قریب، جنازا تو دیکھ لوں،　　تابوت کھول دو کہ سراپا تو دیکھ لوں
اُجڑی ہوئی بہار کی دنیا تو دیکھ لوں،　　رُخ سے کفن ہٹاؤ کہ چہرا تو دیکھ لوں

اللہ یہ تو نقد و نظر کا امام ہے
جس کے لیے فنا نہیں، وہ احتشام ہے

"اب ایسے مخلص لوگ کہاں ملیں گے؟"

اپنے شاگردوں کی تربیت کے لیے شمیم صاحب نے "حلقہ ارباب فکر" قائم کیا۔ مصرع طرح پر نشست مشاعرہ منعقد ہوتی۔ شمیم صاحب کی اصلاح بڑی جدید اور علمی قسم کی ہوتی

اصلاح کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ شاعر کے خیال کو جوں کا توں رکھتے تھے، صرف لفظوں کے ہیر پھیر سے ہی شعر پرواز کناں ہو جاتا۔ سنت درشن سنگھ درشن کا رنگ خاص ہی تصوف تھا۔ ان کی غزلیں صوفیانہ اور عاشقانہ ہوتیں۔ رضا امروہوی رومانی غزلیں کہتے۔ محسن زیدی کی فکریہ غزلیں ان کی پہچان بن گئیں۔ ست نام سنگھ خمار کی غزلیں نفسیاتی پہلوؤں کو اجاگر کرتیں۔ شمیم عثمانی کی تہہ دار غزلیں ارباب فکر و نظر کے لیے خاصے کی چیز تھیں۔ حلقہ کے دوسرے ارباب فکر میں ساقی لکھنوی، شاد دہلوی، اندرجیت لال، مشہور صحافی اور اُردو انگریزی کے ادیب۔ سید غلام سمنانی شمیم صاحب کے شاگرد نہیں تھے۔ سمنانی صاحب کی کی غزلیں کلاسیکی رکھ رکھاؤ کے ساتھ جدید فکر و نظر کی حامل ہیں۔ ڈاکٹر یونس جعفری استاد فارسی ذاکر حسین کالج، دہلی۔ ایک محقق، نقاد، مترجم، حلقہ ارباب فکر کے اکلوتے عالم۔ جگدیش جین شمیم صاحب سے اصلاح لیتے تھے خوشی کی بات ہے کہ انھوں نے اپنا رنگ خاص اختیار کر لیا ہے۔ حلقہ کے " ایک سامعین " بھی تھے، نام یاد نہیں آرہا، بلا کے سخن فہم و سخن سنج تھے مزے کی بات یہ ہے کہ حلقہ ارباب فکر، رجسٹرڈ ہونا تو درکنار، صرف منہ زبانی تھا یعنی نہ کوئی رجسٹر، نہ حاضری، نہ آئین، نہ دستور۔ شمیم صاحب حلقہ کے مستقل صدر اور جاوید وشسٹ مستقل سیکریٹری۔ ایک بار کچھ ممبران نے آئین سازی کی اہمیت پر زور دے کر ایک آئین ساز کمیٹی بنا ڈالی۔ مگر جب حلقہ کا دستور پیش ہوا تو شمیم صاحب نے ویٹو کر دیا۔ یعنی ان کی رائے تھی کہ اس طرح ادب میں سیاست در آئے گی اور ادب میں زہر گھل جائے گا۔ نہایت بے قاعدگی کے باوجود، حلقہ ارباب فکر نے محسن زیدی کا مجموعۂ کلام "شہر دل" درشن صاحب کا "تلاش نور" اور میرا پہلا مجموعہ "شعلہ تشنگی" پیش کیا۔

"عکس گل" شمیم صاحب کی غزلوں کا مجموعہ ہے، جس کا دوسرا ایڈیشن یو، پی اُردو اکادمی کی جانب سے شائع ہوا ہے۔ "عکس گل" میں شمیم صاحب کی غزل اپنے شباب پر ہے ؎

عکس گل میں شمیم کربانی دل کی سب واردات کہتے ہیں
"عمر کٹتی ہے جب خموشی میں تب کہیں ایک بات کہتے ہیں"

غزل شمیم کرہانی ؎

ہر غزل ایک شیشۂ رنگیں — جادۂ عشق، حسن کی منزل
شمع کی لو، دھنک کی انگڑائی — پھول کی پنکھڑی، کلی کا دل

نظم شمیم ؎

فن کے سانچے میں ڈھل گئی ہے زیست — ہر غزل پرتوِ زمانہ ہے
شعر، معصوم و دلفریب صنم — نظم جیسے نگارخانہ ہے

شمیم صاحب کے کچھ ایسے شاگرد بھی تھے جو اندھیرے اُجالے اصلاح لیتے تھے بلکہ اپنے شاگردوں کی غزلیں بھی بنواتے تھے۔ شمیم صاحب ہنس سب کچھ بتا دیتے اور دیر تک ہنستے رہتے۔

ایک روز میں جو کوچۂ میر عاشق میں شمیم صاحب کے دولت کدے پر پہنچا تو دیکھا کہ شمیم صاحب اور سید علی جواد زیدی صاحب میں بڑے زوروں سے بحث جاری ہے۔ زیدی صاحب ہر لفظ پر زور دے کر کہہ رہے تھے کہ " جناب! آپ کی مشاعرہ کی غزلیں مشاعرہ کے ساتھ ہی اُڑ جائیں گی۔ ان میں CONTENT OF THOUGHT تو ہے ہی نہیں۔ آپ بھاری بھرکم فکریہ غزلیں کہیے! شمیم صاحب اس بات پر زور دے رہے تھے۔ ع " پر مجھے گفتگو عوام سے ہے۔ آخر اس دن کے بعد مشاعرہ کی غزل کے علاوہ فکریہ غزلیں بھی کہی جانے لگیں۔

غالباً عسکری صاحب مرحوم کے ایما پر مہدی نظمی صاحب اور شمیم صاحب کے مابین شعری معرکہ ہوتے رہ گیا۔ ایک ہی نشست میں اس کا اظہار اور خاتمہ۔ شمیم صاحب اس گوں کے تھے ہی کہاں کہ کسی کے حریف بنتے۔ بات بڑھتے بڑھتے رہ گئی۔

آخری زمانے میں اختلاجی کیفیت کا یہ عالم تھا کہ شمیم صاحب اچانک اپنا ارادہ بدل دیتے۔ اس کی دلچسپ مثال سونی پت کا وہ مشاعرہ تھا جس کے لیے دہلی جنکشن سے ٹکٹ لیکر سونی پت شٹل میں شعرا سوار ہو گئے تھے۔ مگر شمیم صاحب کشن گنج اسٹیشن پر اتر پڑے اور کہنے لگے کہ وہ نہیں جائیں گے ہیں اور رضا امروہوی بھی اتر پڑے اور انھیں گھر پہنچایا گھر پہنچتے نارمل ہو گئے۔

اُستاد محترم حضرت شمیم کرہانی صاحب مرحوم کے خط و خال کے نقوش، جن سے اُبھرتی ہے ایک شاعر کی شخصیت، ایک فنکار کی ریاضت، ایک شخص کی شرافت اور ایک انسان کی انسانیت ؎

نا اُمیدی کہاں کہ سینے میں
جذبۂ نو دمیدہ آج بھی ہیں
رونقِ انجمن تھے کل بھی شمیمؔ
بزم میں برگزیدہ آج بھی ہیں

مؤ

بہار برنی

طالب دہلوی

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی بعض خصوصیات کے سبب ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ ان کی وضع قطع۔ طور و طریق، ان کی بات چیت، رواداری اور وضعداری، غرض ان کی پوری شخصیت دل میں کھپ جاتی ہے۔ میرے نزدیک شیش چندر سکسینہ طالب دہلوی کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے جو بے حد منجا مرنج اور خوش گفتار تھے۔ گنگا جمنی تہذیب کی اعلیٰ قدریں انہیں زندگی بھر زندگی کی طرح عزیز رہیں۔ وہ اعلیٰ درجہ کے شاعر صحافی اور ادیب تھے۔ میرے شطرنج کے ساتھی تھے لیکن جو چیز مجھے ان سے بے حد قریب لے آئی وہ ان کی اُردو زبان کے ساتھ بے انتہا محبت تھی۔ ابتداً ان کے ساتھ میری ملاقاتیں رسمی ہوتی تھیں پھر کم و بیش سترہ اٹھارہ برس تک ایسی گہما گہمی کے تعلقات رہے کہ ہر روز دو دو تین تین گھنٹہ تک نشست رہتی تھی۔ صاحب حیثیت تھے لیکن طبیعت میں انکسار بے حد تھا مال و زر کو ان کی رواداری اور وضعداری کی راہ میں حائل ہوتے کبھی نہیں دیکھا۔ شاید اس لیے کہ ان کی آنکھوں نے بہت کچھ ہاتھوں سے نکلتے دیکھا تھا۔ پھر بھی اتنا تھا کہ فکر معاش کبھی انہیں چھو کر بھی نہیں گذری۔ گھر کے مسائل کی بات دوسری ہے کہ ان سے کسی کو نجات نہیں۔ میں نے ان کے چہرے پر شادمانی کے رنگ اور رنج و غم کی کیفیتوں کو بکھرتے دیکھا تھا۔ ان کا یہ شعر اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے ــــــ

دیکھنے والے بہر رنگ تجھے دیکھیں گے　　کبھی آئینہ سے باہر کبھی آئینہ میں

وضعداری طالب دہلوی کی زندگی کے ہر پہلو سے عبارت تھی۔ لباس کا معاملہ ہو یا طور وطریق اور کردار وگفتار کا۔ رسمی تعلقات کی بات ہو یا دوستی کی طالب دہلوی کی وضعداری میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔ جب کسی کو دوست مان لیتے تو اخلاص اور وضعداری کی انتہا کر دیتے تھے۔ سچ یہ ہے کہ میں ان کی بزرگی، اُردو فارسی اور انگریزی ادب کے ان کے گہرے مطالعہ اور ان کی شاعری سے زیادہ ان کی دوستی کا قائل تھا۔ دِلّی والوں میں پنڈت رتن موہن خار زتشی کو بے حد عزیز رکھتے تھے میری دانست میں پانی پت کے طالب اور ہم دو کے علاوہ ان کے قریب کوئی اور ایسا نہیں تھا کہ جس کے ساتھ بات چیت میں وہ تکلفات کی حدوں کو توڑ کر بازار کے دِلّی والے بن جاتے ہوں صاف ستھرا لباس پہنتے تھے مگر کھلا اوبالی پن کے ساتھ قمیض اور پائجامہ جس کا ایک پائنچہ اونچا اور دوسرا نیچا رہتا تھا۔ ازار بند کے معاملہ میں کبھی کبھی حضرت جگر کی پیروی بھی کرتے تھے

سردیوں میں شیروانی کا اضافہ البتہ ہو جاتا تھا۔ سر پر مولانا آزاد کی جیسی اونچی باڑھ کی ٹوپی اس طرح منڈھ لیتے تھے کہ کان تک نظر نہیں آتے تھے۔ بلند قامت تھے کتابی چہرہ، پرکشادہ پیشانی اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک ان کی شخصیت کو بھاری بھر کم بنائے رکھتی تھی۔

طالب دہلوی کا خاندان بہت مختصر تھا۔ ایک بھائی ایشّ چندر جو بقید حیات ہیں ایک بیٹی سنگیت جس نے شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ کناڈا میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ خدا نے تین بیٹے بھی دئے تھے جو عالم طفلی ہی میں داغ جدائی دے گئے طالب کو اس کا بے حد غم تھا۔ وسط ۱۹۷۵ء میں دوسری اور آخری بار اپنی بیٹی اور نواسے آکاش سے ملنے کناڈا گئے تو وہیں علیل ہو گئے اکتوبر ۱۹۷۵ء میں واپسی ہوئی صحت کافی گر چکی تھی دلی کی آب وہوا نے کچھ اثر تو کیا مگر کام نہ آئی اور ۱۴ نومبر کو اچانک اعصاب جواب دے گئے فالج کا حملہ ہوا وہ بھی سر اور چہرہ پر۔ اسی روز شام کو ان سے ملاقات ہو چکی تھی شب میں گیارہ بجے جب اطلاع ملی کہ طالب اسپتال میں ہیں تو دل کو دھکا سا لگا۔ اسپتال پہونچکر انہیں دیکھا۔ وہ بول نہیں سکتے تھے جب میں نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھا تو ہاتھ کو دبانے لگے جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں کہ کون آیا ہے بالآخر ۱۵ اور ۱۶ نومبر کی درمیانی شب میں یہ آفتاب شعر وسخن بھی غروب ہو گیا ان کے گھر آج بھی میرا آنا جانا رہتا ہے

وہ صورتیں الہٰی کس دیس بستیاں ہیں
وہ جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

طالب دہلوی کو جاننے والے سبھی اس بات سے واقف ہیں کہ ان کا جنم ایک بے حد وحساب متمول مہذب اور باوقار سکینہ خاندان میں ہوا تھا۔ ان کی تاریخ پیدائش ۱۲ فروری ۱۹۱۰ء ہے اور جائے پیدائش انبالہ چھاؤنی۔ طالب نے انبالہ چھاؤنی ہی میں ابتدائی تعلیم و تربیت پائی اور وہیں کے ایک ہائی اسکول سے میٹرک کی سند حاصل کی۔ اس وقت ان کے والد رائے صاحب مہیش داس انبالہ میں آنریری مجسٹریٹ تھے اور اپنے والد رائے صاحب سالک رام کے کاروبار کے تنہا وارث تھے۔ یہ وہی سالک رام ہیں جنھوں نے ٹھیکہ لے کر دِلّی میں دریائے جمنا پر پرانا پل تعمیر کرایا تھا۔ دِلّی میں چاوڑی بازار کی بتاشہ والی گلی میں ان کا آبائی مکان اور دوسری کئی جائیدادیں تھیں چنانچہ طالب دہلوی نے جب میٹرک کی سند لے لی اور اُن کی و اُن کے برادر خورد کی اعلیٰ تعلیم کا مسئلہ پیش آیا تو رائے صاحب مہیش داس نے اپنے خاندان کو انبالہ سے دلی میں منتقل کر دیا۔ دلّی میں انھوں نے مشن کالج سے انٹر اور ہندو کالج سے بی اے کیا۔

طالب خالص دلّی والے تھے۔ انبالہ میں پیدا ہوئے صرف اس بنیاد پر یہ کہنا درست نہیں ہے کہ وہ پنجاب کے تھے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے ایک جگہ طالب دہلوی کو خود انہیں کے حوالے سے پنجابی لکھا ہے۔ شاید انہیں سہو ہوا۔ میں نے طالب سے اس بارے میں کئی بار پوچھا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمارے پرکھے کب اور کہاں سے دِلّی آئے معلوم نہیں البتہ قریب اور دور کی رشتہ داریاں یو۔پی کے اضلاع میں بکھری ہوئی ہیں۔

طالب دہلوی سے میری پہلی باقاعدہ ملاقات ۱۹۵۱ء میں مولانا سمیع اللہ مرحوم کے کتب خانہ عزیزیہ میں ہوئی۔ یہ کتب خانہ اُردو بازار جامع مسجد میں اب بھی موجود ہے، مولانا مرحوم کی زندگی میں وہاں ہر شام شاعروں ادیبوں اور اُردو کے صاحب نظر استادوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ آزاد ہندوستان کی دِلّی میں یہ ایک ایسا واحد مرکز تھا جہاں باہمی ملاقاتیں بھی ہوتی تھیں اور ایک دوسرے کی پہچان بھی۔ پرانے شہر کے ادیب اور شاعر ہر شام وہاں جمع ہوتے تھے اور فاصلوں پر رہنے والے گاہے گاہے۔ کچھ احباب اسے خانقاہ بھی کہنے لگے تھے۔ باہر سے آنے والوں میں کون ایسا بڑے سے بڑا

شاعر اور ادیب تھا جو دلّی میں رکا ہو اور اس نے اس خانقاہ میں حاضری نہ دی ہو۔ میں روزنامہ الجمعیۃ سے متعلق تھا اور دلّی میں مستقل سکونت اختیار کر چکا تھا میری ہر شام بھی بہت باقاعدگی کے ساتھ اسی خانقاہ میں کبھی اندر تو کبھی باہر پڑی ہوئی بنچ پر گذرتی تھی۔ طالب دھلوی کی اردو بازار میں آمد کا خاص مقصد کسی نئی کتاب کی تلاش اور خریداری ہوتا تھا اور جب آتے تھے تو کتب خانہ عزیزیہ میں ضرور رکتے تھے۔ میں نے مولانا سمیع اللہ مرحوم کو احترام کے ساتھ جن لوگوں کی پذیرائی کرتے دیکھا ان میں طالب دہلوی بھی شامل تھے۔ گلزار دھلوی نے ان سے تعارف کرایا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میں انہیں دیکھ بھی چکا ہوں۔ میں نے اپنی یادداشت کو آزمانے کے لیے طالب صاحب سے جب یہی بات کہی تو انھوں نے مسکرا کر سر ہلایا۔ یہ غالباً ۱۹۴۵ء کی بات ہے جب ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کو ڈاکٹریٹ ملنے کی خوشی میں بلند شہر میں ایک تاریخی مشاعرہ ہوا تھا۔ نواب جعفر علی خاں اثر اس کے صدر تھے اور ڈاکٹر رام بابو خصوصی مہمان۔ اسی مشاعرہ میں اساتذہ اور صرف دوسری صف کے ممتاز مشاہیر ہی کو مدعو کیا گیا تھا طالب دہلوی ان میں شامل تھے۔ یہ میری طالب علمی کا دور تھا طالب دہلوی کو بھی دیکھا اور سنا تھا اور یہی وہ بات تھی جس کی طرف میں نے طالب سے اشارا کیا تھا۔ اسی مشاعرہ کا تذکرہ خصوصیت کے ساتھ میں نے اس لیے کیا کہ اس سے طالب کی شاعرانہ حیثیت پر روشنی پڑتی ہے۔

مشن کالج کی طالب علمی کے زمانہ میں ہی طالب شعر کہنے لگے تھے بس ایک رہبر کی ضرورت تھی جو آسانی سے میسر آگیا۔ منشی مہاراج بہادر برقؔ جو آغا شاعر قزلباش کے ایک قابل فخر شاگرد تھے۔ طالب کے حقیقی پھوپا تھے اور تباشہ والی گلی میں انہیں کے کرایہ دار تھے۔ طالب نے انہیں کے روبرو زانوئے ادب طے کیا۔ اس طرح طالب کا شعری سلسلہ خاندانی ذوق سے جا ملتا ہے جب کبھی طالب اپنے لڑکپن کا ذکر کرتے تو ان کے چہرہ پر بہاریں کھل اٹھتی تھیں۔ کہتے تھے کہ میں بڑا خوش قسمت ہوں کہ مجھے کالج کی زندگی میں پروفیسر اشتیاق حسین قریشی، پروفیسر سید اظہر علی اور پروفیسر بھگوت سروپ جیسے مشفق اساتذہ اور ہلال احمد زبیری اختر انصاری اور اخگر جالندھری جیسے ساتھی طالب علم میسر آئے۔ اسی زمانہ میں طالب نے اپنی شاعری کی دھاک جما لی تھی رسائل میں شائع ہونے لگے تھے۔ کالج کے ایک مشاعرہ میں جو سروجنی نائیڈو کی صدارت میں ہو طالب کو ان کی غزل پر دوسرا انعام ملا تھا۔ اس زمانہ کے بہت سے لطیفے سنایا کرتے تھے ایک مشاعرہ کا خصوصیت

کے ساتھ تذکرہ کرتے تھے اس مشاعرہ میں منور لکھنوی مدعو تھے۔ مشاعرہ سکون سے جاری تھا جب منور لکھنوی کی باری آئی تو انھوں نے حاضرین سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ انہیں کلام سنانے کا شوق نہیں ہے اگر کوئی صاحب نہ سننا چاہیں تو سیٹ خالی کر دیں۔ چونکہ سامعین پرسکون تھے اور کسی نے منور صاحب کو اشارتاً یا کنایتاً بھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا ان کی بات سن کر ٹہوکا پر اتر آئے۔ منور صاحب نے غصہ میں لیکن بڑی خوب صورتی کے ساتھ اپنی بیاض میرے سامنے پھینک دی۔ میں نے اس کو آگے اچھال دیا اور وہ غائب ہوگئی۔ طالب علمی کے زمانہ ہی میں طالب دہلوی کو ۱۹۲۸ء میں پنڈت امرناتھ ساحر کے سالانہ طرحی مشاعرہ کا دعوت نامہ ملا تھا اور یہ ایک بڑی بات تھی۔

طالب دہلوی نے اپنی شعری زندگی میں ۱۹۲۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کا وہ دور بھی دیکھا تھا جب اہل فکر و نظر صلاحیت والوں کی پذیرائی کیا کرتے تھے پھر ۱۹۴۷ء کے بعد کا وہ دور بھی انھوں نے دیکھا جب نفسا نفسی زندگی کا شعار بنتی جا رہی تھی اور خود نمائی و خود ستائی کو آگے بڑھنے کا ذریعہ سمجھا جانے لگا تھا اس نئے دور میں پہلے دور کی نمائندگی کر رہے تھے لیکن اس کیفیت کے ساتھ کہ:

کوئی اپنا مزاج دان نہ ملا
ہم نے خود اپنے ناز اٹھائے ہیں

یا

آج "تاریکیٔ" ماحول سے دم گھٹتا ہے
کل خدا چاہے گا طالب تو سحر بھی ہوگی

سحر تو نہیں ہوئی البتہ طالب شام غریباں کی نذر ضرور ہوگئے۔ وہ کبھی بھول کر بھی کسی کی برائی نہیں کرتے تھے وہ ایک اچھے ہندو تو تھے ہی دوسرے مذاہب کے بارے میں بھی بہت اچھی معلومات رکھتے تھے لیکن میں نے کبھی انہیں مذہبی مباحث میں الجھتے نہیں دیکھا۔ ہر لحاظ سے سیکولر تھے۔

طالب دھلوی کے ڈرائنگ روم میں کچھ تصاویر آویزاں تھیں ان میں ایک ان کے والد کی تھی اور دوسری دادا کی۔ کچھ تصاویر ایسی تھیں کہ جس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔

ایک روز میں نے ایک تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ کس کی ہے۔ مسکرائے اور کہا "شیخ عبدالغفور کی خان مسلمان تھے۔ ہمیں انھوں نے گود میں کھلایا تھا۔ ہمارے یہاں ہی انتقال ہوا اور یہیں سے تکفین و تدفین ہوئی"۔

اُردو طالب دہلوی کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اُردو کے ساتھ ان کا قلبی لگاؤ اور والہانہ محبت ان کی تہہ دار شخصیت کا ایک ایسا پہلو تھا کہ جس نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کا سلسلہ چل رہا تھا۔ ایک روز جب میں ان کے یہاں پہونچا تو کچھ افسردہ دکھائی دئے مجھے دیکھتے ہی ہاتھ ملایا بولے۔ "آؤ مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔ میں نے کہا خیریت تو ہے۔ وہ مسکرائے کہنے لگے دل پر ایک بوجھ ہے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پھر ایک بزرگ اور مقتدر شاعر کا نام لیا اور کہا ان کا فون آیا تھا۔ اس بات پر چراغ پا ہیں کہ میں نے مردم شماری میں اُردو کو مادری زبان کیوں لکھوایا۔ مسلم نوازی کا طعنہ دے رہے تھے۔ ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا ہے۔ میں نے پوچھا پھر آپ نے کیا جواب دیا، کیا جواب دینا یہی کہ اپنی تو ایک ہی زبان ہے مادری بھی اور پدری بھی۔ وضعداری کا عالم یہ رہا کہ صاحب مذکور کے انتقال کے بعد بھی طالبؔ اس کے گھر حال چال پوچھنے کے لیے بڑی باقاعدگی کے ساتھ جاتے رہے۔ وضعداری کی یہ کیفیت صرف احباب تک ہی محدود نہ تھی ادبی و علمی انجمنوں مشاعروں اور مجلسوں میں شمولیت کا عالم بھی یہی تھا جس مجلس میں ایک بار شریک ہو جاتے پھر باقاعدگی کے ساتھ شریک ہوتے رہتے تھے امرناتھ ساحر کی بزم ہو یا خواجہ محمد شفیع کی اُردو مجلس انجمن ترقی اُردو کی نشستیں ہوں یا انجمن تعمیر اُردو کی محفلیں طالب ان میں برابر شریک ہوتے تھے مطالعہ کے علاوہ انہیں فلم دیکھنے اور شطرنج کھیلنے کا بھی گہرا شوق تھا لیکن ہر شوق کی تکمیل کے لیے وقت مقرر تھا۔ شراب نوشی شوقیہ کر لیتے تھے عادتاً نہیں اور وہ بھی مخصوص آداب کے ساتھ۔

طالب دہلوی ایک کہنہ مشق شاعر تو تھے ہی اعلیٰ درجہ کے نثر نگار صحافی اور مترجم بھی تھے۔ زندگی بھر انھوں نے مختلف انداز سے اُردو کی خدمت کی۔ بہ حیثیت شاعر انھوں نے اُردو کے شعری سرمایہ میں اضافہ ہی نہیں کیا بلکہ وہ ایک مدت تک دلّی میں تاریخ ساز مشاعروں کا اہتمام بھی کرتے رہے اپنے استاد برقؔ دہلوی کے انتقال کے بعد ۱۹۳۷ء میں یوم برقؔ کا پہلا مشاعرہ اپنے گھر پر ہی کیا پھر ۱۹۴۹ء تک ہر سال وہ اپنے گھر پر ہی یوم برق کا اہتمام کرتے رہے۔ ۱۹۵۱ء سے یوم برق کا انتظام

سری چندر گپت سبھانے سنبھالا یہ سلسلہ بھی ۱۹۶۱ء تک جاری رہا ان مشاعروں کا اہتمام بھی طالب کرتے رہے۔ ہندوستان کا کون ایسا قابل ذکر شاعر یا ادیب ہوگا جوان مشاعروں میں شریک نہ ہوا ہو یا جس نے کوئی مقالہ نہ پڑھا ہو۔ آٹھ برس تک لالہ مٹول کے تاریخی اور کامیاب مشاعروں کا اہتمام بھی طالب ہی کرتے رہے۔ جب تک جیئے انجمن ترقی اُردو دگی کی ہر تحریک میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ طالب دھلوی کا نثری سرمایہ شعری سرمایہ سے کم نہیں ہے اس میں ادبی تاریخی، سماجی اور تنقیدی مضامین اور سوانحی خاکے بھی شامل ہیں۔ انگریزی افسانوں کا ترجمہ کرنے کا انہیں بے حد شوق تھا یہ تمام افسانے اور مضامین مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہے جن اخبارات و رسائل کو ان کا مکمل تعاون حاصل رہا ان میں الہام۔ کلیم زمانہ بسروج آزاد ماہ نو شعلہ وشبنم پیام مشرق اور تیج خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں ۔ ۱۹۳۰ء میں وہ تیج سے بلا معاوضہ وابستہ رہے یہ سلسلہ چھ ماہ چلا پھر جب ۱۹۶۱ء میں تیج ویکلی نکلا تو گوپی ناتھ امن کے معاون کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ اپنی اس ملازمت کا ذکر کرتے ہوتے ایک جگہ انھوں نے لکھا "کتابوں کو پڑھے بغیر ان پر تبصرہ کرنے کا فن میں نے گوپی ناتھ امن ہی سے سیکھا" ماہنامہ دستگیر۔ گیت اور کئی دوسرے رسائل کے وہ اعزازی مدیر رہے دلی انتظامیہ کے رسالہ آج کل میں بہ حیثیت نائب مدیران کا تقرر چار بار ہوا۔ چوتھی بار انہیں پہلے پانچ سالہ پلان کا اُردو ترجمہ کرنا پڑا۔ امریکن رپورٹر میں بھی وہ نائب مدیر رہے اس طرح ان کی صحافتی زندگی نے بھی اُردو کو بہت کچھ دیا۔

اُردو کتابوں کو خریدنا بھی اُردو کی ایک بڑی خدمت ہے ہمیشہ نئی کتابوں کی تلاش میں رہتے تھے اس طرح کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ ان کے پاس جمع ہوگیا تھا جس کو انھوں نے باقاعدہ لائبریری کی شکل دے رکھی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد میری ہی تجویز پر یہ پوری لائبریری غالب اکیڈیمی کے سپرد کردی گئی تاکہ دست و برد زمانہ سے محفوظ رہ سکے۔

طالب متعدد کتابوں کے مؤلف اور مصنف تھے۔ ان کی تالیفات میں حرف ناتمام یادگار برق ہمارے حسین انوار نظر خدنگ ناز اور خمستان کیفی۔ شامل ہیں اول الذکر دونوں کتابوں کا تعلق برق دھلوی سے ہے ان میں طالب نے یوم برق پر پڑھے جانے والے مقالات اور مشاعروں کی تفصیلات کو محفوظ کر دیا ہے۔ ہمارے حسین حضرت امام حسین

کے ساتھ طالب کی عقیدت کا مظہر ہے اس میں انھوں نے حضرت امام سے متعلق ممتاز ہند و شعرار کی نظموں کو یکجا کیا ہے۔ رتن مالا سبزہ بیگانہ اور سحر حیات ان کے شعری مجموعے ہیں۔ رتن مالا کی حیثیت ایک شعری انتخاب کی ہے جبکہ سبزہ بیگانہ ان کا مجموعہ کلام۔ سحر حیات کو ان کی پہلی برسی پر راقم الحروف نے ترتیب دے کر شائع کیا۔ سیر کشمیر ان کا ایک بے حد دلچسپ سفر نامہ ہے اور ظاہر ہے سفر نامہ لکھنا بجائے خود ایک فن ہے۔ ان کی ایک اہم کتاب "یہ تھی دلی" ہے۔ اس تصنیف کے لیے طالب کو کس طرح تیار کیا گیا یہ ایک دلچسپ کہانی ہے۔ انجمن ترقی اُردو دلی پردیش نے غالباً ۱۹۷۳ء میں یہ تھی دلی کے موضوع پر ایک مخصوص ادبی نشست کا اہتمام کیا تھا مختلف عنوانات پر مختلف اہل قلم سے مقالے لکھنے کی درخواست کی تھی انجمن کے جائنٹ سکریٹری کی حیثیت میں نے طالب دہلوی کو بھی زحمت دی۔ انھوں نے یہ تھی دِلّی کے عنوان سے ایک پرمغز اور خوب صورت مقالہ پڑھا جو بیحد پسند کیا گیا۔ بعد میں میرے اصرار پر انھوں نے اسے بڑھا کر کتابی شکل دیدی۔ اس کتاب کی مکمل تیاری تک میں نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ہر روز جب ان کے یہاں پہونچتا میرا پہلا سوال یہی ہوتا کہ لائیے دکھائے اور آگے کیا لکھا ہے۔ خود بھی یہ تھی دلی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ جب بھی تساہل یا سستی سے کام لیا تو آپ نے (یعنی راقم الحروف نے) بربنائے خلوص ومحبت ڈانٹ بھی تبائی بلکہ پلائی کہ فضول کاموں میں وقت ضائع کیا جاتا ہے۔ کتاب کو جلد از جلد مکمل نہیں کیا جاتا۔ یہ تھی دلی چند ہم عصر وہ صورتیں الہٰی یاران کہن اور یادرفتگان جیسی کتاب تو نہیں ہے نہ اس میں شخصیات سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے تاہم یہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کی دِلّی ادبی شعری اور مجلسی زندگی کا ایک خوبصورت مرقع ہے۔ اس موضوع پر تحقیق کے طالب علم اسے نظر انداز نہیں کر پائیں گے۔

یہ سچ ہے کہ دِلّی اہل ہنر اور اہل علم سے کبھی خالی نہیں رہی۔ اس کی مٹی بڑی مردم خیز ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہر ذرہ اپنی جگہ آفتاب ہوتا ہے اہل علم پیدا ہوتے رہیں گے لیکن طالب دہلوی جیسا وسیع القلب وسیع النظر نیک اور وضعدار انسان کہاں ملے گا۔

٭٭٭

ڈاکٹر صغریٰ مہدی

ڈاکٹر سیّد عابد حسین

(دہلی اُردو اکیڈیمی کی طرف سے جب مجھے یہ مراسلہ ملا کہ اکیڈیمی دتی والوں پر خاکے لکھوا رہی ہے اور اس میں ڈاکٹر عابد حسین بھی شامل ہیں تو مجھے خوشگوار تعجب ہوا اور اطمینان بھی کہ ابھی یہ طے نہیں ہو پایا ہے کہ عابد صاحب کا تعلق یو، پی سے ہے کہ مدھیہ پردیش سے کیونکہ ان کی پیدائش بھوپال میں اور خاندان یو پی میں رہتا تھا اس لیے یو، پی والے انھیں مدھیہ پردیش کا اور مدھیہ پردیش والے یو پی کا بتاتے ہیں۔ چلئے دہلی نے ان کو اپنا لیا یہ صحیح بھی کہ ان کی زندگی کا تین چوتھائی حصہ دہلی میں گذرا اور اسے بسانے میں ان کا ارادہ اور پسند شامل تھی۔ دہلی، دہلی والے اور دہلی کی تہذیب انھیں عزیز تھی۔ وہ جب بھی کہیں جاتے دہلی کو بہت یاد کرتے)

بڑا سا سر چاند صاف اس کے گرد کھچڑی بالوں کی جھالر جو آخر میں بالکل سفید ہو گئے تھے لمبے لمبے کان فراخ پیشانی جس پر غور و فکر کی لکیریں روشن اور ذہین آنکھیں سانولا رنگ گہرا سانولا کہہ لیجئے دبلا پتلا جسم جو کبھی فربہی کی طرف مائل نہ ہوا کھدر کا سفید کرتا پاجامہ پہنے، جس پر کبھی کبھی سالن اور اکثر روشنائی کے دھبے ــــ کبھی بیٹھے سگار پی رہے ہیں کبھی ہیڈ فون کانوں سے لگائے خبریں سن رہے ہیں کبھی اپنے کمرے میں لکھ رہے ہیں اس طرح کہ چند لائنیں لکھتے ہیں۔

پھر کاٹ دیتے ہیں اور پھر قلم کو کاغذ پر رکھ اپنی دونوں ہتھیلیوں کو زور زور سے رگڑنے لگتے ہیں۔ کبھی سرمئی شال اوڑھے جاڑوں میں بان کے پلنگ پر اپنے گھر کے آنگن میں اخبار پڑھنے میں محو ہیں۔ کبھی کرکٹ کی کمنٹری سننے کے لیے ٹرانسسٹر کان سے لگائے بیٹھے ہیں کبھی کوئی جاسوسی ناول پڑھنے میں مصروف ہیں کبھی بیمار کے سرہانے بیٹھے اس کی تیمارداری کر رہے ہیں۔ کبھی اپنا قلم اپنی گھڑی اپنا اخبار تلاش کر رہے ہیں اور نہ ملنے پر خفا ہو رہے ہیں اس طرح کہ گفتگو میں آپ اور جناب پر بہت زور دیتے۔ غصے میں زبان کی لکنت اور بڑھ جاتی ہے مگر بات کو ادھوری نہیں چھوڑتے اس کو ضرور پورا کرتے چاہے اسے دور کرنے میں کتنی ہی دیر لگ جائے۔ صبح وشام کھدر کی اچکن اور گاندھی کیپ میں چھڑی ٹہلنے کے لیے ضرور جاتے ہیں اور ٹہلنے کے دوران چھڑی کو یوں گھماتے ہیں کہ ادھر ادھر چلنے والے راہگیر اپنے کو نہ بچائیں تو چوٹ کھا جائیں۔ اپنا کام خود کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہاں تک کہ جب دروازے پر دستک ہوتی ہے تو نوکر کے ہونے کے باوجود خود ہی پہنچ جاتے ہیں اور آنے والا اگر اجنبی ہوتا تو شانِ تمکنت سے کہتا ہمیں ڈاکٹر سید عابد حسین سے ملنا ہے "جی تشریف لائے میں ہی عابد حسین ہوں اور وہ اسے اپنے گھر کے چھوٹے سے کمرے میں لے آتے ہیں، جہاں بید کی دو چار کرسیاں ایک چوکی اور ایک میز رکھی ہوتی دیوار پر موتی سے بنی ہوئی ایک سنہری اور گاندھی جی کا ایک پنسل اسکیچ لگا ہوا ہے۔ دوسرے کمرے میں ان کی بیوی امدادِ عزیزان کی ایک ایک بڑی رقم نکال گھر کے خرچ میں کتر بیونت کر رہی ہوتیں۔

یہ تھے ہمارے عابد صاحب۔ ان کا تعلق یو پی کے مشہور مقام قنوج کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں داعی پور میں بسے ایک کاشتکار سادات خاندان سے تھا۔ ۲۵ جولائی ۱۸۹۶ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد سید حامد حسین ریاست میں ملازم تھے۔ ان کا بچپن اور لڑکپن بھوپال، داعی پور اور لکھنؤ میں گذرا جہاں ان کی ننہال بھی عابد صاحب کا خاندان خوشحال نہیں تھا اس لیے بہت عسرت اور تنگی میں بچپن گذرا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسے اور ثانوی تعلیم بھوپال کے جہانگیریہ اسکول میں حاصل کی۔ بی۔ اے

میور سینٹرل کالج الہ آباد سے پاس کیا اور ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایم۔اے انگریزی میں داخلہ لیا مگر چند مہینے بعد بھوپال سے وظیفہ ملنے پر انگلستان کا سفر اختیار کیا اور آکسفورڈ میں ہسٹری آنرز میں داخلہ لیا اس کا ابتدائی امتحان پاس بھی کر لیا مگر بوجہ خرچ کی تنگی برلن یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور ایڈورڈ شپرانگر کی زیر نگرانی ہربرٹ اسپینسر کے نظریہ تعلیم پر مقالہ لکھا اور PhD کی ڈگری حاصل کی۔

زمانۂ طالب علمی کے زمانے سے ہی ان کی رجحان تصنیف و تالیف کی طرف تھا ادبی مضامین لکھتے، ترجمہ کرتے شاعری کرتے۔ دوران قیام برلن میں انھوں نے ایک ڈرامہ پردۂ غفلت لکھا جس کا شمار اُردو کے چند اچھے ڈراموں میں ہوتا ہے۔

جرمنی میں پروفیسر مجیب اور ڈاکٹر ذاکر حسین کا ساتھ رہا ڈاکٹر ذاکر حسین سے جامعہ ملیہ کا ذکر سنا۔ اور پھر ویانا میں حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری سے ملاقات ہوئی اس کے بعد انھوں نے جامعہ ملیہ میں کام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

۱۹۲۶ء میں جرمنی سے واپسی پر جامعہ ملیہ میں کام شروع کیا اس وقت ۱۹۵۶ء تک جامعہ سے منصبی تعلق رہا۔ یہاں انھوں نے انتظامی کام بھی کیے اور تصنیف و تالیف کے بھی پڑھایا بھی۔ یہاں سے نکلنے والے پرچے کی ادارت بھی کی وہ اس کے لائف ممبر اور ٹرسٹی بھی تھے۔ اور آخر دم تک جامعہ کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے رہے اور ان کی آخری آرام گاہ بھی جامعہ ملیہ ہی میں ہے۔

عابد صاحب کو گاندھی جی سے خاص تعلق تھا وہ ان کی واردھا اسکیم کے تعلیمی سنگھ کے ایک مدت تک ممبر رہے۔ اکثر سیوا گرام میں جا کر گاندھی جی کے ساتھ وقت گذارتے اور بقول خود ان کے گاندھی جی کی روحانی اور اخلاقی اقدار سے فیض یاب ہونے کا شرف حاصل کرتے۔ ۱۹۴۷ء میں ہفتہ وار اخبار نئی روشنی نکالا، آفیشل لنگویج کمیشن کے ممبر رہے۔ علی گڑھ میں جنرل ایجوکیشن کے ڈائرکٹر رہے۔ ریڈیو صلاح کار رہے اور بہت سی ادبی انجمنوں اور تعلیمی اداروں سے وابستہ رہے۔ مگر ان کی اصل توجہ تصنیف و تالیف پر رہی اس سلسلے میں ان کا ایک اہم کام مولوی عبدالحق کے ساتھ مل کر اُردو انگلش لغت کی تدوین ہے ان کا اصل میدان ترجمہ تھا۔ انھوں نے بہت اہم کتابوں کا ترجمہ براہ راست جرمن زبان سے اُردو میں کیا۔ گاندھی جی اور پنڈت جواہر

نہرو کی اہم تصانیف کا اُردو میں ترجمہ کی اُردو داں طبقے کو ان سے روشناس کرایا۔ انھوں نے اپنی تصانیف کے لیے بہت اہم اور مشکل میدان چنا یعنی ہندوستانی تہذیب و تمدن اور اس کے پیچیدہ مسائل۔ ان کی سب سے اہم کتاب ہندوستانی تہذیب کا مسئلہ ہے جو انگریزی میں National Culture of India کے نام سے شائع ہوئی اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں اور ان کی آخری اہم کتاب ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں اور انگریزی میں Destiny of Indian Muslims ہے۔ یہ کتاب عابد صاحب کا اس اہم کام کی طرف پہلا قدم تھا جو انھوں نے اپنی زندگی کی آخری سالوں میں کیا یعنی اسلام اینڈ دی موڈرن سوسائٹی کر کے کیا انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ سب مذاہب ایک دوسرے کے قریب آجائیں اور اسلام کے پیرو جدید زمانے کے چیلنج کو قبول کر سکیں۔ اور آخر ۱۳ دسمبر ۱۹۷۸ء کو انھوں نے اس دارفانی سے بہت کام نہ کرنے کی حسرت کے ساتھ عالم جاودانی کو کوچ کیا۔

عابد صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو اپنی منزل کا تعین ابتدا ہی سے کر لیتے ہیں۔ اور پوری زندگی اس تک پہنچنے کی سعی میں گذار دیتے ہیں۔ انھیں اس کا یقین تھا کہ انھوں نے اپنے لیے جس راستے کا انتخاب کیا ہے صحیح ہے اس لیے اس راہ میں آنے والی کٹھنائیوں کو انھوں نے پامردی اور خوش دلی سے جھیلا۔ وہ ایک مفکر بھی تھے ایک عملی انسان بھی۔ ان کے یہاں فکر و عمل کی راہیں الگ الگ نہیں تھیں۔ انھوں نے مذہب انسانیت ملک قوم ملت اور خاندان سب کے فرائض ادا کیے اور اپنی ذات کو بھی فراموش نہیں کیا مگر اس کی محبت کو کبھی غالب بھی نہیں آنے دیا۔

مایوسی تھکن بیزاری بدگمانی اور عیب جوئی کے الفاظ ان کی لغت میں نہیں تھے۔ انھوں نے مصلحت جھوٹ اور بیوقوفی سے کبھی نباہ نہیں کیا اور اس کے اظہار پر انھیں غصہ آجاتا اور اس کے برملا اظہار کرنے سے نہ چوکتے۔ انھیں زندگی سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی جن چیزوں پر لوگ فخر کرتے ہیں یا جن کو اپنی عروج سمجھتے ہیں عابد صاحب نے ان کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ لوگوں سے ہمیشہ خوش گمان رہے اور ان کے غلط کاموں اور باتوں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے رہے وہ دوسروں کی کم ظرفی اور چھوٹی باتوں پر یوں شرمندہ ہوتے جیسے اس میں

ان کا کوئی قصور ہو وہ ان کو بھول جاتے اگر کوئی یاد دلاتا تو کہتے "اونہہ چھوڑیے" ہم جیسے ڈھیٹ پھر بھی نہ مانتے تو ان کو غصہ آجاتا منہ لال ہو جاتا اور وہ جما جما کر ٹھہر ٹھہر کر کہتے "جی بالکل صحیح ہے تو پھر کیا کروں؟"

ان میں تعصب نہیں تھا جس انسان میں چند، بنیادی، قدریں ہوں وہ ان کے لیے قابل قبول تھا چاہے وہ مذہبی ہو یا لامذہب اس کا کوئی بھی سیاسی نظریہ ہو۔ وہ خوشامد سے بہت چڑتے تھے اور ایسے حضرات سے کچھ زیادہ ہی بدگمان ہو جاتے تھے ان کے دل میں لوگوں کے کام آنے کا اتھاہ جذبہ تھا۔ جب کسی کو ان کی ضرورت ہو اور وہ ان کو یاد کرے اور یاد کرنے کی بھی شرط نہیں تھی انھیں معلوم ہو جائے وہ کسی کے لیے کسی طرح بھی کچھ کر سکتے ہیں یا کرا سکتے ہیں وہ اس کی مدد کو تیار ہو جاتے اور اس کے لیے ان کو یاد دلانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ ان کی مدد کا کون مستحق ہے اس کا فیصلہ وہ خود ہی کرتے تھے اس سلسلے میں کسی کی رائے بہت کم مانتے تھے۔ قول و فعل کی یک رنگی کا یہ عالم تھا کہ جس بات کا وعدہ کر لیں اس کو پورا کرنا اپنا فرض جانتے اور جو نہ کرنا چاہتے یا نہ کر سکتے اسی صفائی سے اس کو کرنے سے انکار بھی کر دیتے تھے ایسے لوگ یہ شکایت کرتے چلے جاتے کہ نہ کرتے مگر وعدہ تو کر لیتے وعدہ تو کر لیتے۔

بیماروں کا علاج کرانا ان کی ہوبی تھا۔ خاندان کے افراد دوست شاگرد پڑوسی اور نوکر سب اس میں شامل تھے اور علاج بھی صرف ایلوپیتھک ان کے نزدیک بیماری کو نظر انداز کرنے سے بڑھ کر اور کوئی نادانی نہیں اور اسی پر بھی کوئی ان کی بات نہ سنتا تو وہ ڈاکٹر سے وقت مقرر کرا دیتے۔ ممکن ہوتا تو خود ساتھ بھی ہو لیتے ان کی توجہ حاصل کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ تھا کہ انسان بیمار ہو جائے انھوں نے اپنے جذبات کی تہذیب بہت محنت سے کی تھی وہ زندگی کی طرف سائنٹیفک نقطۂ نظر رکھتے تھے اس لیے ہر پریشانی ہر تکلیف کی توجیہہ کرتے تھے۔ زندگی کی طرف ان کا یہ حقیقت پسندانہ رویہ کبھی کبھی دوسروں کے لیے تکلیف دہ بھی ہو جاتا تھا۔

ان کے نزدیک زندگی جاوداں پیہم دواں ہے اور یہ پیمانہ امروز و فردا سے ناپنے کی چیز

نہیں۔ ان کو کام سے صرف انگریزی جاسوسی ناول اور کرکٹ کی کینٹری روک سکتی تھی جب جاسوسی ناول ہاتھ میں ہو یا کہیں کرکٹ میچ ہو رہا ہوتا تو کام نہ کرنے کے بچوں کی طرح بہانے بنانے لگتے۔

وہ طبیعتاً ظریف اور شگفتہ مزاج انسان تھے مگر حالات کے جبر نے انھیں سنجیدہ اور مقطع بنا دیا تھا لکنت کی وجہ سے کم آمیزی اختیار کرنی پڑی گھر میں بچپن سے بوڑھوں کی صحبت ملی اور اسکول میں طالب علمی کے زمانے سے استادوں کا کام لیا جانے لگا۔ دوست ان کی علمیت اور اصابت رائے معاملہ فہمی سے مرعوب رہے پھر جامعہ ملیہ میں مقصد کی آنچ نے ان کی شگفتگی کو بہت کچھ مضمحل کر دیا لیکن اس کے باوجود بے تکلف محفلوں میں ان کی شخصیت کا یہ پہلو سامنے آتا اور لوگ اس سے محظوظ ہوتے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ان کے ایک جاننے والے اپنے شکار کے قصے بے تکان سنا رہے تھے سب لوگ بہت بور ہو رہے تھے عابد صاحب نے یکایک سوال کیا آپ بڑے بور کی بندوق سے شکار کرتے ہیں چھوٹے بور کی۔ وہ صاحب چڑ کر بولے کیا مطلب؟ عابد صاحب نے کمال سنجیدگی سے جواب دیا کچھ نہیں ذرا بوروں کی قسمیں جاننا چاہتا ہوں۔

جب عابد صاحب ریڈیو پر ساہتیہ صلاح کار تھے تو ان سے ایک مولوی صاحب نے شکایت کی فلاں پروڈیوسر ہمیں اب نہیں بلاتے عابد صاحب نے ان حضرت سے پوچھا بھئی آپ فلاں مولوی صاحب سے کیوں خفا ہیں۔ انھوں نے جواب دیا جی نہیں بالکل خفا نہیں ہوں انھوں نے تو میرا نکاح پڑھایا ہے اچھا تو پھر آپ اسی کا انتقام لے رہے ہیں۔

ایک دفعہ جرمنی میں جب وہ پڑھ رہے تھے ان کے کسی ساتھی نے پوچھا "آپ لکنت سے کسی اسکول میں گئے ہیں" عابد صاحب نے سوکھے منہ سے جواب دیا "جی نہیں، یہ تو میں نے گھر پر ہی سیکھی ہے"

سب کا اور شاید عابد صاحب کا بھی یہ خیال تھا کہ انھوں نے پاسبان عقل کو سدا اپنے پاس رکھا اور دل کو تنہا کبھی نہیں چھوڑا۔ جی ہاں رکھا مگر ہمیشہ نہیں نوجوانی میں ان کے دل پر عقل کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو وہ جامعہ ملیہ پر آ گیا، جس کی چاہت میں انھوں نے

اپنی زندگی کے بہترین دن کاٹ دے جس کے لیے انھوں نے لاکھوں کے بول سہے انھوں نے عشق کیا اپنے مقاصد سے اپنے کاموں سے اپنی زبان اپنی تہذیب اپنے ملک سے اور انھوں نے ایک حسین لڑکی سے بھی عشق کیا ہے جس کا ثبوت ان کی نظم " حسن بے پرواہ " ہے جس کی نشاندہی ان کی بیوی نے ان الفاظ میں کی ہے " یہ نظم کسی مخصوص حسین لڑکی کی شان میں کہی گئی ہے یا عام طور پر صنف لطیف کے حسن وادا سے متاثر ہو کر میں نہیں جانتی " وہ جانے یا نہ جانیں ہم آپ تو جانتے ہیں !

٭٭

ڈاکٹر خلیق انجم

مولانا عبدالسلام نیازی

مولانا عبدالسلام نیازی جید عالم، فلسفی، عربی، فارسی اور اُردو کے ماہر، اور بہ قول جوش ملیح آبادی، قرآن، حدیث، منطق، حکمت، تصوف، عروض، معنی وبیان، علم الکلام، تاریخ، تفسیر، لغت، لسانی قواعد ادب اور شاعری کے امام تھے۔ ان کی شخصیت بہت دلچسپ اور پُراسرار تھی۔ غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے انھیں اپنی زندگی ہی میں ایک پراسرار رنگین داستان کا مرتبہ حاصل ہو گیا تھا۔ پہلے اُن چند خصوصیات کا ذکر کروں، جن کی وجہ سے اُن کی ہستی پراسرار بن گئی تھی۔

مولانا مرحوم کی اصل عمر سے کوئی واقف نہیں تھا۔ لوگوں نے جب بھی مولانا سے اُن کا سنہ ولادت معلوم کیا، وہ ٹال گئے۔ دہلی کے ایک حلقے میں مشہور تھا کہ وفات کے وقت مولانا کی عمر ڈیڑھ سو سال سے زیادہ تھی۔ اُن کے قریب رہنے والوں میں ایک صاحب نے مجھے بتایا کہ ایک سو بیس سال کی عمر میں وفات ہوئی۔

مولانا کے ایک قریبی دوست حکیم عبدالسلام خدا کے فضل سے ابھی تک حیات ہیں، انھوں نے مجھے بتایا کہ مولانا ایک سو آٹھ سال کی عمر میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ صحیح عمر تو بتانا ممکن نہیں ہے، لیکن مختلف شہادتوں کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس جہانِ رنگ وبو

میں ایک صدی سے کچھ اوپر ہی رہے۔

کوئی نہیں جانتا کہ مولانا کہاں کے رہنے والے تھے۔ اس سلسلے میں بھی اُن کے قریبی دوستوں کے مختلف بیانات ہیں۔ ایک صاحب نے مجھے بتایا کہ مرحوم دہلی ہی کے رہنے والے تھے۔ ایک اور صاحب نے اطلاع دی کہ وہ بجنور کے تھے۔ لیکن ان کے قریبی لوگوں میں محمد مرزا صاحب اور حکیم عبدالسلام کا بیان ہے کہ مولانا میرٹھ کے رہنے والے تھے ہاں میرے کرم فرما زید ابوالحسن صاحب کا بھی یہی خیال ہے کہ مولانا کا وطن میرٹھ تھا اور جوانی میں وہ دِلّی آگئے تھے۔

یہ بھی ایک راز ہے کہ مولانا کس خاندان سے تھے۔ ان کے والد کون تھے اور اُن کا کیا نام تھا۔ والد کی بات تو دُور کی ہے۔ مجھے کوئی بھی ایسا شخص نہیں ملا، جس کی مولانا کے کسی رشتے دار سے کبھی ملاقات ہوئی ہو۔ مولانا کے دیکھنے والوں میں ایک صاحب نے چپکے سے میرے کان میں بتایا کہ ایسے بزرگ زمین پر تھوڑی پیدا ہوتے ہیں، جو تم اُن کے وطن کی تلاش کر رہے ہو۔ ایسے بزرگوں کے رشتے دار کہاں سے آئیں گے۔ بھائی، یہ تو خدا کی طرف سے بھیجے جاتے ہیں۔ ہندوستان والوں کی ہدایت کے لیے شاہ سرمد کو بھی اسی طرح زمین پر اتارا گیا تھا۔

مولانا کی آمدنی کا ذریعہ بھی بہت پُراسرار تھا۔ بہ ظاہر ان کی آمدنی کا ذریعہ وہ عطر تھا جو وہ اپنے معتقدوں کے ہاتھ فروخت کرتے تھے۔ قصہ یہ تھا کہ جب کوئی ضرورت مند مولانا سے دعا کرانے آتا، تو مولانا اُسے ایک عطر کی شیشی دے کر یہ ہدایت دیتے کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی یا حضرت نظام الدین اولیا یا کسی اور بزرگ کے مزار کی چادر پر یہ عطر لگا دینا، اللہ تمہاری مراد پوری کرے گا۔ ضرورت مند اس عطر کے معاوضے میں جو کچھ دیتا وہ بہت خاموشی سے، سب کی نظریں بچا کر دیتا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ رقم دو چار روپے ہوتی تھی۔ یہ رقم مولانا کے روزانہ کے اخراجات کے لیے کافی تھی۔

لیکن لوگوں کو حیرت نوٹوں کی اُن گڈیوں پر ہوتی تھی جو مولانا یتیموں، بیواؤں ضرورت مندوں، گانے والیوں اور قوالوں کو دیتے تھے۔ کہتے ہیں کہ گانے کی محفل میں مولانا سے زیادہ روپے دینے والا کوئی اور نہیں ہوتا تھا اسی لئے عوام و خواص دونوں میں یہ مشہور تھا کہ مولانا کو

دستِ غیب ہوتا ہے۔ میرے چچا شفیق احمد مرحوم نے ایک چشم دید واقعہ سنایا تھا کہ ایک دفعہ وہ مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر تھے۔ مولانا کے ایک شناسا آئے۔ لباس سے بہت غریب معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی صاحبزادی کی شادی ہو رہی ہے اور ان کے پاس خرچ کے لئے روپے نہیں ہیں۔ مولانا خاموشی سے اُٹھے۔ ٹرنک کھولا اور اہلِ محفل سے اوٹ کر کے اُن صاحب کو کچھ دیا۔ میرے چچا مرحوم کا بیان تھا کہ میں ایسی جگہ بیٹھا تھا، جہاں سے مجھے دس دس کے نوٹوں کی وہ گڈی نظر آگئی، جو مولانا نے ان صاحب کو دی تھی۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے معقول لوگوں کا بھی خیال تھا کہ مولانا کو دستِ غیب ہوتا تھا۔ لیکن مولانا کے یہاں آنے جانے والے حضرات میں سے ایک صاحب ہیں، جو بالکل ان پڑھ ہیں، میں نے جب اُن سے پوچھا کہ مولانا کو دستِ غیب کیسے ہوتا تھا تو انھوں نے بڑے زور سے قہقہہ لگا کر بتایا کہ میاں، یہ تو ٹھیک ہے کہ ان کے پاس بہت رقم ہوتی تھی۔ لیکن یہ دستِ غیب نہیں تھا۔ بلکہ اس عطر کا فیض تھا، جو مولانا اپنے معتقدوں کو دیتے تھے۔ ان صاحب نے مجھے بتایا کہ ایک دولت مند ہندو خاندان ان کا معتقد تھا۔ اس خاندان کے لوگ مولانا سے اُس وقت ملنے آتے تھے جب مولانا کسی سے نہیں ملتے تھے۔ یہی خاندان مولانا کا دستِ غیب تھا۔

یہ تھے وہ واقعات جنھوں نے مولانا کی شخصیت کو پراسرار بنا رکھا تھا اور لوگ طرح طرح کے حیرت انگیز واقعات ان سے منسوب کرتے تھے۔

مولانا بڑے طرح دار آدمی تھے جوانی میں ان کا حلیہ کچھ اس طرح کا تھا۔ کسرتی جسم، بازوں کی مچھلیاں چڑھی ہوئیں، چوڑا سینہ، پتلی کمر، بھری بھری بانہیں، کشادہ ماتھا، کھڑی ناک متوسط دہانہ، داڑھی، مونچھیں اور سر کے بال صاف ــ حکیم عبد السلام پیر اور جمعرات کو انتہائی پابندی سے مولانا کی حجامت کرتے تھے۔ گھر پر صرف بنیان پہنتے اور سفید رنگ کا تہ بند باندھتے۔ گھر سے کہیں قریب جانا ہوتا تو سفید چادر اوڑھ لیتے، کہیں دور جانا ہوتا، تو آڑا پاجامہ۔ سفید اچکن سلیم شاہی جوتی پہنتے، سر پر منڈی ہوئی، پھولدار، لال ٹوپی ہوتی۔ گلے میں لال رنگ کا حیدرآبادی رومال اور ہاتھ میں آبنوس کی خوب صورت اور نازک چھڑی۔ اور جاڑوں میں سرخ رنگ کی صدری پہنتے تھے۔

مولانا نے جوانی میں شادی کی تھی لیکن بیوی سے تعلقات خراب ہو گئے اور اتنے خراب ہو گئے کہ طلاق تک نوبت پہنچ گئی۔ اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لئے ایک دوست حاجی ابو بکر کی صاحبزادی کو گود لے لیا۔ حاجی جی کا تعلق نیلی برادری سے تھا۔ مولانا اس بچی سے بہت محبت کرتے تھے، اس کی شادی بہت دھوم دھام سے کی اور سارا خرچ خود اٹھایا۔ اس بیٹی کا ایک لڑکا شمس الزماں تھا، جسے چھمی بھی کہتے تھے، مولانا نے اس بچے کو بڑی محبت سے پالا تھا۔ آزادی کے بعد جب چھمی پاکستان چلا گیا تو مولانا کو بہت تکلیف ہوئی۔ کچھ عرصے بعد اپنے ایک اور دوست ممتاز خاں عرف گبو کے صاحبزادے عبد الرحمٰن کو گود لے لیا۔ عبد الرحمٰن کی اس وقت تقریباً پنتالیس سال عمر ہوگی۔ یہی مولانا کے وارث قرار پائے تھے۔ اور مولانا کا جو تھوڑا بہت اثاثہ تھا وہ انہی کو ملا تھا۔ عبد الرحمٰن نے مولانا کے گھر میں پیتل کے زیورات بنانے کا کارخانہ لگا رکھا ہے۔

مولانا نیازی نے کبھی کسی دولت مند کے سامنے دستِ سوال نہیں پھیلایا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کی زندگی بہت سادہ تھی۔ غریبوں اور گانے والوں کے معاملے میں تو شاہ خرچ تھے، لیکن خود اپنی ذات پر بہت کم روپیہ خرچ کرتے تھے۔ صبح کو دو بسکٹ اور ایک کپ چائے اور عصر کے وقت آدھ پاؤ گوشت کا قلیہ اور دو روٹیاں۔ چوبیس گھنٹے میں بس یہی خوراک تھی۔ مولانا کے دوست ممتاز خاں عرف گبو کی بیوی کھانا پکا کر بھیجتی تھیں، جب اُن کا انتقال ہو گیا تو ممتاز خاں کی صاحبزادی یہ فریضہ انجام دینے لگیں۔

مولانا محلہ قبرستان میں بلبلی خانے کی طرف ایک بالاخانے پر رہتے تھے۔ بہت چھوٹا سا گھر ایک چھوٹا کمرہ۔ اس کے آگے دالان اور پھر صحن۔ کمرے میں ایک طرف گدی اور گاؤ تکیہ رکھا رہتا، مولانا اس گدی پر بیٹھتے۔ سامنے ایک چارپائی بچھی رہتی۔ دری کا فرش ہوتا تھا۔ باہر دالان میں ایک طرف ایک اور چارپائی پڑی ہوتی اور اس کے برابر میں ایک الماری رکھی رہتی۔ گھر میں چار پانچ الماریاں تھیں، جن میں سلیقے سے کتابیں رکھی رہتیں ...... ایک سوٹ کیس، جس میں ان کے کپڑے رکھے رہتے اور ایک الماری، جس میں عطر اور تیل رکھا رہتا۔ بس یہ تھا کل اثاثہ اور ان کے منہ بولے بیٹے عبد الرحمٰن کو ورثے میں یہی کچھ ملا تھا۔ عبد الرحمٰن صاحب کو ورثے میں جو کتابیں ملی تھیں انھیں فروخت کرنے کے بجائے تغلق آباد میں قائم انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

کو دے دیں۔ محترم زید ابوالحسن کو مولانا کی کتابیں دیکھنے کا اکثر اتفاق ہوا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ چوں کہ مولانا شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے بہت قائل تھے۔ اس لیے اُن کے پاس، ابن عربی کی آٹھ جلدوں میں فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم وغیرہ جیسی کتابیں تھیں۔ باقی کتابیں فارسی اور عربی کے کلاسیکی ادب اور فلسفے پر تھیں۔

مولانا صبح ساڑھے سات بجے ناشتہ کر کے درس و تدریس میں مصروف ہو جاتے۔ ان کے دوستوں کا بیان ہے کہ طالب علموں کی تعداد ایک دو سے زیادہ کبھی نہیں ہوتی تھی۔ گیارہ بجے کے قریب طالب علم چلے جاتے اور ملنے والے آنا شروع کر دیتے۔ تین بجے تک مولانا دوستوں اور شناساؤں سے گفتگو کرتے اور پھر کچھ دیر کے لیے سو جاتے۔ چار بجے کے قریب کھانا کھاتے۔ ملاقاتی پھر آنا شروع ہو جاتے۔ عشار کی اذان ہوتے ہی سب چلے جاتے اور مولانا گھر کا دروزہ بند کر لیتے رات کو گھر میں ہمیشہ تنہا رہتے۔ اس عادت نے ان کی زندگی کو اور بھی پُراسرار کر دیا تھا بعض لوگ کہتے تھے کہ مولانا اکیلے گھر میں اس طرح کا وظیفہ پڑھتے ہیں کہ جسم کے تمام حصے الگ ہو جاتے ہیں۔ کوئی کہتا کہ مولانا تمام رات نماز پڑھتے تھے، اور نہیں چاہتے تھے کہ لوگوں کو ان کی نماز کا علم ہو۔ ایک بزرگ نے پورے یقین کے ساتھ مجھ سے کہا کہ مولانا رات کو ہوا میں پرواز کرتے تھے حقیقت صرف اتنی ہے کہ انھیں رات کو گھر میں تنہا سونے کی عادت تھی۔

جس طرح کسی کو یہ نہیں معلوم کہ مولانا کہاں کے تھے اور کون تھے؟ اس طرح یہ بھی کسی کو علم نہیں کہ مولانا نے علم کا دریا کہاں سے حاصل کیا تھا اور ان کے استاد کون تھے حکیم عبدالسلام نے مجھے بتایا ہے کہ مولانا نے جامعۂ ازہر میں تعلیم پائی تھی۔ یہ اطلاع صرف حکیم صاحب نے دی ہے، کسی اور ذریعے سے اس کی تصدیق نہیں ہوئی حکیم صاحب نے یہ بھی بتایا کہ مولانا مرحوم کو طب پر بہت مہارت تھی، اور وہ اس فن میں شریف خانی خاندان کے حکیم عبدالمجید کے شاگرد تھے۔ قبلہ زید ابوالحسن نے مجھے بتایا کہ مولانا اکثر درگاہ ابوالخیر کی لائبریری سے کتابیں لے جاتے اور یہ کتابیں عام طور سے منطق اور فلسفے کے موضوعات پر ہوتیں۔

مولانا کو تصوف اور اسلامی فلسفے پر غیر معمولی قدرت تھی۔ اگر کوئی شخص تصوف کا کوئی مسئلہ سمجھنے آتا تو مولانا اس سے دریافت کرتے کہ اسے کس علم کی اصطلاحوں سے واقفیت ہے۔

اور پھر ان اصطلاحوں میں تصوف کے مسائل بیان کرتے یا خدا کا وجود ثابت کرتے۔ یہاں ایک لطیفہ سن لیجئے، جوش ملیح آبادی مولانا کی خدمت میں حاضر تھے۔ خدا کے وجود پر گفتگو ہو رہی تھی، جوش صاحب نے کچھ الٹی سیدھی باتیں کر دیں، مولانا تاؤ کھا کر بولے۔ میاں خدا تم کو خوش رکھے تمہارا دماغ تو شیطان کا بیت الخلاء ہے۔" جوش صاحب نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا تو مولانا نے ذرا تلخ لہجے میں فرمایا آپ کی گفتگو سے ہمارا ناریل چٹخ گیا ہے۔ اس وقت تو اپنی گاڑی بڑھایئے کچھ دن بعد آیئے۔ جوش صاحب مولانا کے مزاج شناس تھے موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے، فوراً رفو چکر ہو گئے۔

ایک واقعہ اور سن لیجیے ایک دفعہ جوش حکیم کامل خاں کے ساتھ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حکیم کامل خاں نے مولانا سے کہا کہ جوش خدا کے قائل نہیں ہیں۔ مولانا نے جوش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ میاں خدا تم کو خوش رکھے۔ جو خدا کو نہیں مانتا وہ وجودی حرامی ہوتا ہے۔

زید ابو الحسن صاحب نے مجھے بتایا کہ مولانا طریقہ چشتیہ نظامیہ میں بیعت تھے اور حضرت نیاز بریلوی کے خلیفہ عزیز میاں کے مرید تھے۔ بہت وسیع المشرب اور وسیع القلب انسان تھے۔

ایک دفعہ ہندو مذہب کے مطالعے کا شوق ہوا۔ اس موضوع پر بہت کتابیں پڑھیں، لیکن تسلی نہیں ہوئی۔ سادھوؤں کا لباس بدل کر دس بارہ سال تک ہری دوار، لکشمی جھولا اور رشی کیش میں رہے۔ ہندو سادھوؤں کی طرح سمادھی لگاتے تھے۔ دلی کے ایک بزرگ نے مجھے واقعہ سنایا تھا میں یہ نہیں کہتا کہ آپ اس پر یقین کریں لیکن یہ قصہ ہے دلچسپ، اس لیے سن لیجئے مولانا ہندوؤں کے کسی مقدس مقام پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک دن خیال آیا کہ مجھے اتنا عرصہ ہو گیا ان لوگوں کے ساتھ رہتے رہتے، اب تک نہیں پہچان سکے کہ میں مسلمان ہوں۔ جب یہ لوگ مجھے ہی نہیں پہچان سکے تو خدا کو کیا پہنچانیں گے۔ اسی دن شام کو مولانا جنگل سے گزر رہے تھے۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ دیکھا کہ ایک سادھو سامنے سے چلا آرہا ہے۔ اس جنگل میں سادھو کو دیکھ کر مولانا حیرت میں پڑ گئے اور ایک درخت کی آڑ میں چھپ گئے۔ جب سادھو آگے نکل گیا تو مولانا اس کے پیچھے چلے تھوڑی دور پر ایک جھونپڑی تھی۔ سادھو اس جھونپڑی میں چلا گیا۔ مولانا باہر چھپے کھڑے رہے۔ انھیں پھر یہ خیال آیا کہ جب یہ لوگ مجھے ہی نہیں پہچانے تو خدا کو کیا

پہچانیں گے۔ اچانک جھونپڑی میں سے سادھو کی آواز آئی۔ عبدالسلام چھپو نہیں آجاؤ۔ مولانا اپنا نام سن کر خائف ہو گئے اور خود بخود اُن کے قدم اُٹھ گئے۔ جھونپڑی میں داخل ہوئے تو سادھو نے کہا کہ تم بے وجہ پریشان ہو رہے ہو ہم نے دس گیارہ سال پہلے جب تمہیں دیکھا تھا، اسی وقت پہچان گئے تھے۔ ہمارا مشورہ ہے کہ تم دہلی واپس چلے جاؤ وہاں خلقِ خدا کی زیادہ خدمت کر سکو گے۔

مولانا دہلی تشریف لے آئے، اُنھوں نے اپنا حلیہ ایسا بنایا کہ نہ سادھوؤں کا تھا اور نہ صوفیائے کرام کا۔ ان کے حلیے کی تفصیل پہلے ہی بیان کی جا چکی ہے۔

مولانا کی عجیب دلچسپ شخصیت تھی۔ بہت اعلا کردار کے انسان تھے۔ ان کے جاننے والوں اور قریبی دوستوں میں ہر شخص کا بیان ہے کہ انھوں نے مولانا کو کبھی کسی کے ساتھ جنسی تعلقات میں ملوث نہیں دیکھا، لیکن تھے زبردست حُسن پرست۔ دہلی کے بازار چتلی قبر میں ایک دکان پر خوب صورت لڑکا بیٹھتا تھا۔ مولانا اُس کے ایسے عاشق ہوئے کہ دُنیا میں اُن کی رسوائی ہوئی۔ لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ حسینوں سے مولانا کا رشتہ صرف ذہنی ہوتا، اس میں جسم کو کبھی دخل نہیں ہوا۔

جے پور کی دو طوائفیں تھیں، ببو اور گوہر۔ مولانا ان دونوں کے گانے کے مداح اور حُسن کے شیدائی تھے۔ جے پور کی ایک اور گانے والی تھیں بے نظیر، مولانا کو اس خاتون سے عشق تھا۔ اکثر مزاروں پر اس محبوبہ کے ساتھ جاتے۔ جوشؔ نے یادوں کی برات میں مولانا کی اسی محبوبہ کا ذکر کیا ہے۔

دہلی میں کالی مسجد کے پیچھے دو مہترانیاں رہتی تھیں۔ سگی بہنیں تھیں۔ غضب کی آواز پائی تھی مولانا ان دونوں کو بلا کر گانا سنتے۔ اور ان کے فن کی وجہ سے دونوں کا بہت ادب اور احترام کرتے تھے۔"

مولانا گانا سنتے سنتے گانے والیوں کا سرِ محفل بوسہ لیا کرتے تھے۔ چوں کہ لوگ اور خود گانے والیاں مولانا کے کردار اور علمی مرتبے سے واقف ہوتے۔ اس لیے کبھی کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا کہ مولانا ایک زندہ داستان تھے۔ ان کے بے شمار واقعات اب تک اہلِ دہلی کے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔ چند دلچسپ قصے آپ بھی سن لیجیے۔

مولانا غصے کے بہت تیز تھے جس سے اختلاف ہو جاتا اس کے خاندان کی قبریں کھود دیا کرتے گالیوں کے فن کے ماہر تھے۔ مغلظات سناتے تھے، لیکن ایسی تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کا استعمال کرتے تھے کہ گالیوں میں شاعری کا مزہ آجاتا۔ لیکن چوں کہ سچے عالم تھے اس لیے منصف مزاج بھی تھے۔

مولانا احمد حسین مدنیؒ سے مولانا کو سخت علمی اور دینی اختلاف تھا دہلی کی بھوجلہ پہاڑی پر مولانا مدنی سیرت پر تقریر کر رہے تھے۔ اتفاق سے مولانا اپنے ایک ایسے دوست سے ملنے گئے ہوئے تھے جو بھوجلہ پہاڑی پر رہتا تھا۔ دوست کے گھر میں بیٹھے بیٹھے مولانا مدنی کی تقریر سنی۔ تقریر ختم ہوتے ہی مولانا اس مسجد کی طرف لپکے جہاں مولانا مدنی تشریف رکھتے تھے۔ جو لوگ مولانا اور مولانا مدنی کے اختلافات سے واقف تھے، وہ ڈر گئے۔ کیوں کہ جانتے تھے کہ مولانا مدنی کی شامت آگئی۔ مولانا مدنی مسجد سے باہر آرہے تھے۔ مولانا نے ان کو گلے سے لگا لیا اور بار بار کہتے رہے " مدنی تم نے سیرت کا حق ادا کر دیا " خدا تم کو خوش رکھے، سیرت کا حق ادا کر دیا۔

ایک صاحب حج سے واپس آئے تو مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کسی صاحب نے مولانا کو پہلے ہی بتایا تھا کہ ان صاحب کی دو کنواری لڑکیاں گھر بیٹھی ہیں۔ بہت کم آمدنی ہے پھر بھی قرض لے کر حج پر گئے ہیں۔ مولانا کو ان کے حج پر جانا پسند نہیں تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ دو جوان لڑکیوں کا گھر پر ہوتے ہوئے قرض لے کر حج پر جانا غیر شرعی عمل ہے۔ بہ ہر حال مولانا نے پوچھا کہ آپ اتنے دن بعد کیوں حج سے واپس آئے۔ ان صاحب نے جواب دیا۔ حضرت جب شمع جل رہی ہو تو پروانہ اندھیرے کی طرف کیسے جائے۔ مولانا کا ناریل چٹخ گیا۔ سالے، یوں نوں کرو اس کا مطلب ہے کہ ہم اندھیرے میں رہتے ہیں تو قرض لے کر روشنی میں گیا تھا۔ نکل یہاں سے تیری.... وہ صاحب جوتیاں چھوڑ کر بھاگے۔

مولانا مرحوم، جوشؔ سے بہت محبت کرتے تھے۔ اسی لیے ان کی بہت سی کوتاہیوں کو نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔ مگر جب مستقل سکونت کے لیے جوشؔ پاکستان گئے تو مولانا کو بہت ناگوار گزرا۔ پاکستان جانے سے قبل جوشؔ، مولانا سے آخری ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ ایک عینی شاہد نے مجھے بتایا کہ جب جوشؔ نے پاکستان جانے کی اطلاع دی تو مولانا کا پارہ چڑھ گیا۔ فرمانے لگے، تم

ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے ساتھ بے وفائی کرکے پاکستان جارہے ہو، خدا تمہارا یہ گناہ معاف نہیں کرے گا۔ اچھا سدھارئیے۔ کہتے ہیں کہ اس موقع پر مولانا نے سیدھے منہ بات بھی نہیں کی۔ اور جوش منہ لٹکا کر آگئے۔

ایک صاحب مولانا کے پاس آئے۔ کچھ دیر گفتگو کے بعد ان صاحب نے مولانا کو بتایا کہ وہ خدا کو نہیں مانتے۔ مولانا کے تن بدن میں آگ لگ گئی فرمانے لگے۔ میاں جن لوگوں نے فلسفہ پڑھا منطق پڑھی۔ فارسی پڑھی عربی پڑھی مختلف علوم حاصل کیے اگر وہ راستے سے بھٹک کر خدا کی ذات سے منکر ہو گئے تو سمجھ میں آتا ہے۔ آپ الف کے نام بے نہیں جانتے۔ ماشاء اللہ جاہلِ مطلق۔ آپ خدا سے منکر ہوئے۔ سدھاریے۔ چوں کہ لوگ جانتے تھے کہ مولانا دو تین دفعہ سدھاریے کہتے ہیں اور پھر گالیوں کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں اس لیے وہ صاحب سر پر پیر رکھ کر بھاگے۔

ایک دفعہ ڈاکٹر فضل حق کامل مولانا سے ملنے گئے۔ زینے پر سے آواز دی۔ مولانا نے کڑکدار آواز میں پوچھا۔ کون؟

میں ہوں فضل حق کامل۔

اگر فضل حق ــــ کامل ہے تو اندر آجائے مولانا نے جواب دیا۔

چوں کہ فضل حق کامل تھے، اس لیے اندر چلے گئے۔

میں پروفیسر احمد فاروقی کی زیر نگرانی حضرت مرزا مظہر جانجاناں پر پی۔ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھ رہا تھا۔ رہنمائی حاصل کرنے مولانا کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔

مولانا نے میرا نام پوچھا۔

عرض کیا۔ خلیق انجم۔

فرمایا۔ لاحول ولاقوۃ۔ یہ کوئی نام ہے۔ میاں خدا تم کو خوش رکھے۔ خلیق کا انجم سے کیا تعلق۔

عرض کیا کہ اصل نام خلیق احمد خاں ہے۔

تو کیا شعر کہتے ہو؟

عرض کیا۔ کہتا تھا لیکن سلسلہ آگے نہیں چلا۔

مسکرا کے فرمانے لگے۔ شعر گوئی کے چکر میں نام خراب کیا اور شعر بھی نہیں کہا گیا۔ اب ٹھیک

کر لو۔ پھر ذرا تیز آواز میں فرمانے لگے۔ صاحبزادے حضرت مرزا مظہر جانجاں پر کام کرنے والوں کے
نام تو ٹھیک ٹھاک ہونے چاہئیں۔ میں اس سلسلے میں بارہا ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مرحوم نے
حضرت مرزا مظہر کے بارے میں مجھے بہت کچھ بتایا۔

مولانا کی زندگی کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ وہ کم علم آدمی کی صحبت سے گریز کرتے تھے۔
اگرچہ مولانا احمد سعید، حضرت خواجہ حسن نظامی، ڈاکٹر سید محمود، جوش ملیح آبادی اور اس طرح کے
دوسرے لوگ ان سے ملنے آتے رہتے تھے۔ لیکن مولانا کے ہر وقت کے ہم نشیں اور دوست بہت
کم علم تھے اور مولانا ان لوگوں میں خوش رہتے تھے۔ یا ان دوستوں کے علاوہ کسی اور کم علم کو وہ
برداشت نہیں کرتے تھے۔ اہل اقتدار اور اہل ثروت سے تو انھیں چڑ تھی۔ اگر کوئی نیا آدمی ملنے
آتا تو کچھ سوال کر کے اس کے مبلغ علم کا اندازہ کر لیتے اس کے علم کے مطابق اُسے وقت دیتے
اگر اس طرح کا کوئی آدمی زیادہ دیر ٹھہر جاتا تو بدمزہ ہو جاتے۔ کوشش کرتے کہ وہ شخص جلد سے جلد
چلا جائے۔ اگر وہ شخص اشارہ نہ سمجھتا اور بے غیرت بنا بیٹھا رہتا تو دو تین دفعہ سدھاریے۔ پھر بھی نہ
جاتا تو گرجدار آواز میں ایسی گالیاں سناتے کہ وہ جوتیاں چھوڑ کر بھاگنے میں مجبور ہو جاتا۔

مولانا کی علمیت کا اس قدر شہرہ تھا کہ بقول نذیر نیازی علامہ اقبال نے انھیں اسرار خودی کا
ایک نسخہ بھیجا تھا۔

"مرتضیٰ ساحل تسلیمی نے نور ڈائجسٹ رامپور میں لکھا تھا کہ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے عربی
کی تعلیم دہلی میں قیام کے زمانے میں حاصل کی۔ ان دنوں ایک بہت مشہور عالم دین تھے۔ مولانا
عبد السلام نیازی صاحب۔ مولانا کے شاگرد بہت کم تھے۔ وہ صرف ان لوگوں کو پڑھاتے جنہیں پڑھنے
کا شوق ہوتا تھا۔ سید مودودی روزانہ فجر کی نماز سے پہلے ان سے پڑھنے جاتے تھے۔ چاہے سردی کا
موسم ہی کیوں نہ ہو"

جب حکیم عبد السلام نے مجھے بتایا کہ مولانا مودودی تہجد کی نماز کے وقت پڑھنے آتے تھے تو
مرتضیٰ ساحل تسلیمی کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔ اب مولانا کی خودداری کے دو تین واقعات سن لیجیے۔
آزادی سے قبل برطانیہ حکومت کو کسی جاسوس کے پاس سے فارسی میں کچھ کاغذات ملے۔
فارسی اس انداز میں لکھی گئی تھی کہ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وزارتِ خارجہ کے سکریٹری کو کسی

نے مولانا نیازی کا نام بتایا۔ اُس نے کئی لوگوں سے سفارش کر کے مولانا کو بلوایا۔ مولانا کو ایک کمرے میں بٹھا کر وہ کاغذات دیے۔ ایک نظر دیکھتے ہی مولانا نے اندازہ لگایا کہ الفاظ آگے پیچھے اس طرح کیے گئے ہیں کہ کوئی سمجھ نہ سکے۔ انھوں نے عبارت درست کی اس کا ترجمہ کر کے جو افسر وہاں بیٹھا تھا۔ اس سے کہا بلوایئے اپنے سکریٹری صاحب کو افسر نے کہا۔ وہ کیسے آسکتے ہیں، آپ چلیے اُن کے پاس۔ مولانا نے وجہ پوچھی تو بتایا کہ وہ بہت بڑے افسر ہیں، مولانا نے اصل کاغذات اس افسر کو دے دیے اور باقی پھاڑ کر ملاحی سناتے ہوئے گھر آگئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا نیازی کی مالی مدد کرنا چاہتے تھے، انھوں نے خواجہ حسن نظامی کی معرفت انھیں بلوایا۔ خواجہ صاحب نے جب مولانا آزاد کا پیغام دیا تو مولانا نیازی آپے سے باہر ہو گئے۔ خواجہ صاحب کو تو کچھ نہیں کہا لیکن مولانا آزاد کی اچھی خاصی خدمت کر دی۔ جن الفاظ میں خدمت کی وہ جوش صاحب نے یادوں کی برأت میں نقل کیے ہیں۔ حیدرآباد کے نواب مہدی یار جنگ کا مولانا سے ملاقات کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ جوش ملیح آبادی نے یادوں کی برأت میں بھی نقل کیا ہے۔ اس لیے اُن کی زبانی ہی سنیئے۔ جوش صاحب لکھتے ہیں:

"ایک دن اُن کے وہاں پہنچا تو میرے دوست نواب مہدی یار جنگ، وزیر تعلیمات حیدرآباد دکن، اُن کے کوٹھے سے، اترتے ملے۔ صاحب سلامت اور معانقے کے بعد میں نے پوچھا۔ خدانخواستہ کیا مزاج ناساز گار ہے۔ انھوں نے کہا، آپ میرے پاس آئیں گے تو بتاؤں گا۔ مجھے افسوس ہے کہ خواجہ حسن نظامی نے مجھ کو مولوی عبدالسلام کے پاس بھیج کر بیٹھے بٹھائے ذلیل کرایا۔ میں اوپر گیا دیکھا کہ مولوی عبدالسلام غصے میں بھرے بیٹھے ہیں۔ میں نے کہا، مولانا کیا بات ہے، انھوں نے کہا، ابھی حیدرآباد دکن کے ایک وزیر صاحب، جن کا خطاب ہے نواب مہدی یار جنگ بہادر، میرے پاس اس غرض سے آئے تھے کہ میں ان کو مسئلہ وحدۃ الوجود سمجھا دوں میں نے اُن سے کہا کہ دنیا کے تمام علوم میں جو علم آپ کو سب سے زیادہ مستحضر ہو، اس کا نام بتایئے۔ میں اُس علم کے مصطلحات میں یہ مسئلہ آپ کو سمجھا دوں گا۔ انھوں نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد کہا، علم معنی و بیان۔ سو جوش میاں اللہ آپ کا بھلا کرے، میں نے علم معنی و بیان ہی کے مصطلحات میں وہ مسئلہ معزز حق کے فضل و کرم سے اُن کو سمجھا دیا۔ وہ اس قدر خوش ہوئے کہ

انھوں نے جھک کر، میرے ہاتھ چوم لئے اور کہنے لگے آپ میرے ساتھ حیدر آباد تشریف لے چلئے، میں نے کہا اب تو کوٹھے سے میں نیچے نہیں اُترتا ہوں۔ اتنا بڑا سفر کیسے کروں گا۔ اس پر انھوں نے جب مجھ سے یہ کہا کہ مولانا میں وہاں لے جا کر آپ کو حضور نظام سے ملاؤں گا، وہ آپ کا اس قدر وظیفہ مقرر فرما دیں گے کہ یہ کمرہ چھوڑ کر آپ دہلی میں ایک کوٹھی تعمیر کرا کے اس میں رہنے لگیں گے، تو میاں جوش، میرا ناریل چٹخ گیا۔ میں نے کہا آپ کے نزدیک کیا یہ بات ممکن ہے کہ میں اس جاہل نظام کے سامنے، اپنی وجاہتِ علمی کی کمر میں ذلت کی پٹی باندھ کر جاؤں اور اس مسخرے کو "خداوند نعمت" اور اپنے کو "فدوی" کہوں۔ اس کے بعد مولانا نے نظام حیدر آبادی کی شان میں جو قصیدہ پڑھا، میں اُسے یہاں نقل نہیں کر سکتا، آپ خود ہی "یادوں کی برات" ملاحظہ کر لیجیے۔

تقسیم ہند کے بعد اُن کے کئی دوست پاکستان چلے گئے۔ ہری بھری دلی اُجڑ گئی۔ فسادات کے واقعات سے مولانا ایسے متاثر ہوئے کہ گھر سے باہر جانا ترک کر دیا۔ مہینوں گھر سے نہ نکلتے۔

ایک دفعہ انہیں بخار چڑھا، کچھ دن صاحبِ فراش دہے اور ۳۰ر جون ۱۹۶۶ء کو اپنے خالق سے جا ملے۔

مولانا کی موت ایک فرد کی نہیں ایک جید عالم، ایک صوفی، ایک کھرے سچے، اور خود دار انسان، ایک روایت اور زندہ داستان کی موت تھی۔ انھیں حضرت نظام الدین میں دفن کیا گیا۔ ہر سال دس ربیع الاول کو ان کا عرس ہوتا ہے۔ خدا انھیں جنت نصیب کرے۔

٭٭

پروفیسر عنوان چشتی

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

دُنیا میں اشخاص کا سیلاب ہے مگر شخصیتیں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ شخص ایک فرد ہوتا ہے، مگر شخصیت ایک انجمن اور ایک تحریک ہوتی ہے اس کو ایک اِدارہ اور ایک عہد بھی کہا جا سکتا ہے۔ شخص اور شخصیت میں وہی نسبت ہوتی ہے، جو قطرے اور گہر میں ہے۔ غالب نے یوں ہی نہیں کہا تھا ع ؎ دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک۔"

جس طرح قطرہ تعمیر اور تطہیر کے مختلف مراحل سے گزر کر گہر بنتا ہے، اسی طرح شخص زندگی کے افق پر بار بار ڈوبتا اور ابھرتا رہتا ہے۔ اپنی خوبیوں اور خرابیوں کے ساتھ لمحہ لمحہ طلوع ہوتا ہے۔ زندگی کے دائرے میں ان گنت حادثوں کے درمیان جیتا اور شخصیت کی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ اور زندگی میں جاں آفرینی اور توانائی کے ایک نئے نظامِ شمسی کی تشکیل کرتا ہے۔ شخصیت اپنے افتادِ مزاج، ردِعمل کے اسلوب، دائرہ کار، اثرات اور مضمرات کے نقطۂ نظر سے جتنی موثر، مفید اور متحرک ہوتی ہے، اتنی ہی پرکشش اور بڑی ہوتی ہے۔

مفکرِ ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمان عثمانی ایک شخص نہیں بلکہ ایک شخصیت تھے۔ جنھوں نے اپنے فکر و عمل سے زندگی کے نگار خانے میں ایسی شمعیں روشن کی ہیں، جن کی روشنی دور تک اور دیر تک باقی رہے گی اور آنے والی نسلوں کو راہ دکھاتی رہے گی۔

مفتی صاحب کی شخصیت سادگی و پرکاری اور علم و عمل کا پیکر تھی۔ جنھوں نے مفتی صاحب کو دیکھا ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان کی وضع قطع وہی تھی، جو ایک عالم کی ہوتی ہے۔ خاص طور پر دار العلوم دیوبند کے علمار کی ہوتی ہے۔ سر پر عام طور پر اونچی باڑھ کی ٹوپی اوڑھتے۔ کرتا اور پاجامہ پہنتے۔ اس پر شیروانی ہوتی۔ جو سادگی اور سنجیدگی کا نشان معلوم ہوتی اور ان کے بدن پر بھلی لگتی۔ چہرے پر اوسط درجہ کی مخروطی انداز کی ڈاڑھی اور بالائی لب پر ہلکی ہلکی موچھیں، جو ان کے بیضوی چہرے پر اچھی لگتی تھیں۔ جوانی میں مفتی صاحب کا رنگ قدرے صاف رہا ہوگا۔ لیکن جب میں نے انھیں دیکھا تو وہ گیہواں ہو چکا تھا۔ ناک نقشہ مردانہ اور خاصا پرکشش تھا۔ کشادہ پیشانی، جس پر سجدے کا نشان چمکتا تھا۔ اوسط درجہ کی آنکھیں، جو تہذیب و شرافت کا گہوارہ معلوم ہوتی تھیں ناک متوسط، جو آگے سے قدرے چوڑی تھی اور ان کے عزائم کی صلابت کو ظاہر کرتی تھی۔ کان حد اوسط سے ذرا بڑے تھے جو اُن کی طویل عمری کے ضامن تھے۔ اوسط درجہ کا قد اور بھرا بھرا بدن تھا۔ جوان کے حوصلوں کی پختگی کی غمازی کرتا تھا۔ مجموعی طور پر مفتی صاحب کا پیکر مردانہ وجاہت کا مظہر تھا۔ مفتی صاحب بولتے تو کانوں میں رس تو نہ گھولتے۔ مگر موتی ضرور رولتے تھے۔ ان کی آواز کا حجم اچھا خاصا تھا۔ وہ ایسے جلی اور گمبھیر سروں پر مشتمل تھی، جو خطابت کے لیے موزوں ہوتی ہے۔ مجمع میں بولتے تو مخاطب کی نفسیات اور علمی استعداد کا خیال رکھتے۔ اپنی بات کو دلیل سے باوزن بناتے اور ایسا پیرایہ اختیار کرتے کہ ان کی بات دل میں اُتر جاتی۔ نجی محفلوں میں سادگی سے باتیں کرتے۔ مگر ان میں پُرکاری اور بلاغت ہوتی۔ مفتی صاحب اگرچہ صاف گو تھے، مگر موقع و محل کی مناسبت، مخاطب کی عمر، مرتبے اور صلاحیت کے پیشِ نظر جواب دیتے۔ جس میں علم کی روشنی اور تجربے کی تازگی ہوتی۔ مفتی صاحب بنیادی طور پر بذلہ سنج اور شگفتہ مزاج تھے۔ مگر آخر عمر میں بہت حساس ہوگئے تھے۔ اور اسی لیے کبھی کبھی ان پر خلافِ مزاج یا غلط بات کا ردِعمل ہوتا۔ اُن کے لہجے میں تلخی آجاتی، اور چہرے پر ناگواری کے اثرات نمایاں ہوجاتے۔ مگر یہ کیفیت دیر تک باقی نہ رہتی بلکہ ان کی فطری خوش طبعی اس پر غالب آجاتی اور وہ پھر اُسی سادگی و پرکاری سے بات کرتے اور مخاطب کے دل میں گھر کر لیتے۔ اگر ثقہ حضرات مجھے معاف کریں تو عرض کروں کہ ان کی شخصیت کا جادو تبیر کے نشے کی طرح دھیرے

اثر کرتا، مگر دیر پا رہتا شراب خانہ ساز کی طرح مخاطب کے حواس کو متاثر نہیں کرتا تھا۔

مفتی صاحب کے تعلقات کا دائرہ بہت وسیع تھا جس میں مذہب، رنگ، نسل یا عمر، طبقے اور علاقے کی کوئی قید نہ تھی۔ وہ صحیح معنی میں پیکرِ مروّت تھے۔ آج کل مسلمانوں نے مسلک کے فروعی اختلافات کو مخالفت کا شاخسانہ بنا رکھا ہے۔ مفتی صاحب اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے دوسرے کے مسلک کا احترام کرتے۔ اور فروعی اختلاف کو بنیادی اصولوں پر اختلاف کو بنیادی اصولوں پر غالب نہ آنے دیتے۔ اکثر احباب واقف ہیں کہ مفتی صاحب اور صاحب زادہ محمد ممتحن فاروقی سجادہ نشین درگاہ حضرت شیخ کلیم اللہ دہلویؒ کے الگ الگ مسلک تھے۔ اور بعض امور میں شدید اختلاف تھا۔ مگر دونوں میں پُر خلوص تعلقات تھے۔ فاروقی صاحب ہمیشہ مفتی صاحب کو عرس کی تقریبات کا دعوت نامہ بھیجتے اور مفتی صاحب اس میں شرکت فرماتے۔ اور خاص طور پر مغرب اور عشا کی نماز پڑھاتے۔ نماز کے بعد قوالی ہوتی۔ ایک موقع پر فاروقی صاحب مفتی صاحب سے نہ جانے کیا سرگوشی کی کہ وہ محفلِ قوالی میں شریک ہو گئے قوال نے اپنے سازوں کی مخصوص مگر شدید دھنوں میں قول کا آغاز کیا۔ مفتی صاحب نے پھر اُٹھنا چاہا مگر فاروقی صاحب نے روک دیا۔ قوال نے اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے مزامیر کے ساتھ قول شروع کیا۔

جو لوگ قوالی کے آداب سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ عموماً تمام صوفیا اور خصوصاً سلسلۂ چشتیہ کے صوفیا اور ارادت مند قول پر بڑھ چڑھ کر نذر پیش کرتے ہیں۔ اور اپنے پیر یا کسی بزرگ کے بزرگ کے توسل سے حضرت علیؓ کے حضور نذر پیش کرنے میں اپنی شدید عقیدت کا اظہار کرنے اور خلوصِ نیت سے کام لیتے ہیں۔ قوالی کے آداب کے مطابق نذر کسی کو پیش کی جائے لیکن آخر میں وہ سجادہ نشین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے۔ چنانچہ نذر کا سلسلہ چلا تو آخر میں اُس کی تان فاروقی صاحب پر ٹوٹتی۔ لیکن فاروقی صاحب اس نذر کو مفتی صاحب کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ اس صورت حال میں مفتی صاحب کے چہرے کا رنگ متغیر تھا۔ مگر کمال متانت سے بیٹھے رہے اور تھوڑی دیر کے بعد فاروقی صاحب سے اجازت لے کر محفلِ قوالی سے اٹھ گئے۔ چند

دن کے بعد میں مفتی صاحب کی خدمت میں پہنچا تو وہ کمال خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر آپ اجازت دیں تو ایک ذاتی معاملے کے بارے میں استفسار کروں؟ مسکراتے ہوئے فرمایا پوچھیے۔ میں نے عرس حضرت شیخ کلیم اللہ کی محفل قوالی اور نذر کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے سوال کیا۔ حضرت آپ کے مسلک میں قوالی مزامیر کے ساتھ جائز نہیں۔ پھر آپ نے اس محفلِ سماع میں کیوں شرکت فرمائی اور نذر قبول کی؟ یہ خالص صوفیوں کا طریقہ ہے۔ بہت متانت سے فرمایا۔

"میاں عنوان! میرا مسلک وہی ہے، جس کی طرف تم نے اشارہ کیا ہے؟ یعنی میں مزامیر کے ساتھ قوالی کو جائز نہیں سمجھتا۔ سماع کے آداب بہت سخت ہیں۔ اکثر لوگ ان کی پابندی نہیں کرتے۔ اس محفلِ سماع میں میری شرکت اختیاری نہیں بلکہ یہ مجبوری تھی۔ اس وقت میرے سامنے دو راستے تھے۔ جن میں سے ایک کو مجھے اختیار کرنا تھا۔ ایک یہ کہ میں محفلِ سماع میں بیٹھوں اور اپنی طبیعت پر جبر کر کے نیز اپنے مسلک کے خلاف سماع سنوں۔ دوسرا یہ کہ میں فاروقی صاحب کی دل شکنی کر کے اپنے مسلک کی حفاظت کی خاطر محفلِ سماع سے اٹھ جاؤں۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ فاروقی صاحب کی دل شکنی سے بہتر اپنی طبیعت پر جبر کرنا ہے رہا میرے مسلک کا معاملہ تو اس محفلِ سماع میں شرکت سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔" انھوں نے نہایت سنجیدہ انداز میں فرمایا۔ "میری نگاہ میں دل شکنی کرنا سماع سننے سے کہیں زیادہ بڑا گناہ ہے۔ پھر مروت بھی تو کوئی چیز ہے۔" میں اس جواب کو سن کر دنگ رہ گیا۔ میرے دل نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ تم نے لغت میں مروّت، اور صلحِ کل کے معنی پڑھے تھے۔ آج ان معانی کا عمل دیکھ لیا۔ سچ ہے لفظ کے ایک معنی ہوتے ہیں اور دوسرا اس کا عمل۔ دراصل وہی لفظ زندگی ہے جو پہلے اپنے معانی کا انکشاف کرتا ہے اور پھر انسان کی زندگی میں عمل بن کر داخل ہو جاتا ہے۔ مفتی صاحب صحیح معنی میں "معنیٔ لفظِ آدمیت تو تھے ہی" وہ پیکرِ معنیٔ آدمیت بھی تھے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

مفتی صاحب، دوسرے بہت سے علماء اور دانش وروں کی طرح فکر و عمل اور دین و دنیا کو الگ الگ تصور نہیں کرتے۔ انھیں دینی بصیرت کے ساتھ سیاسی شعور بھی حاصل تھا۔ ان کی دینی

بصیرت ان کے سیاسی شعور کی رہنمائی کرتی اور ان کا سیاسی یا دنیاوی شعور ان کی مذہبی بصیرت کو مہمیز کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے دوسرے بہت سے علمار کی طرح سیاست کو شجر ممنوعہ نہیں سمجھا یوں تو ان کا جھکاؤ کانگریس کی طرف تھا مگر وہ دوسری سیاسی جماعتوں کو بھی لائق اعتنا سمجھتے۔ میں ان کے یہاں اکثر جاتا، وہاں مختلف موقعوں پر مختلف لوگوں سے ملاقات ہوتی۔ یادش بخیر، ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۰ء تک سیاست کے قومی اسٹیج پر جنتا پارٹی اور کانگریس میں جو آنکھ مچولی ہوتی رہی، اس سے سب لوگ باخبر ہیں۔ اس پس منظر میں صرف یہ کہنا ہے کہ ۱۹۸۰ء میں کانگریس کے برسر اقتدار آنے کے بعد ایک دن میں نے مفتی صاحب سے سوال کیا۔ حضرت! ایک مسلمان کی حیثیت سے آپ نے جنتا سرکار اور کانگریس حکومت میں کیا فرق محسوس کیا۔ انھوں نے برجستہ فرمایا میں تفصیلات اور جزئیات کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ کانگریس کی حکومت میں اگر میں کسی وزارت یا محکمہ میں جاتا تو میرے چہرے کی ریش کے باوجود افسران تہذیب سے پیش آتے اور بیٹھنے کے لیے کہتے۔ لیکن جنتا سرکار میں افسران کا تہذیب و شرافت سے پیش آنا تو در کنار کوئی بیٹھنے کو بھی نہ کہتا۔ انھوں نے بےحد سنجیدہ ہوتے ہوئے فرمایا۔ جنتا سرکار میں ڈاڑھی کی اتنی بھی وقعت نہ تھی، جتنی کانگریس سرکار میں تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مفتی صاحب نے ایک واقعہ کے حوالے سے دونوں پارٹیوں کے رویّوں کی نشان دہی کر دی ہے۔ مفتی صاحب معمولی باتوں اور واقعات سے غیر معمولی کام لینے اور سادگی کے ساتھ بلیغ باتیں کہنے کا ہنر جانتے تھے۔ یہی وہ ذہانت اور فطانت ہے، جس نے مفتی صاحب کو ان کے معاصرین میں ایک منفرد اور ممتاز مقام عطا کیا ہے۔

یہ راز مفتی صاحب کی نگاہِ جوہر شناس پر آشکار تھا کہ اسلام کوئی جامد یا میکانکی مذہب نہیں ہے۔ بلکہ یہ مادّی اور روحانی زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہے اور اس میں ایسے رہنما اصول اور اشارے موجود ہیں جو ابد تک بنی نوعِ انسان کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔ ان کی نگاہ میں اللہ کی زمین اللہ کے احکام، انسانیت اور فطرت کے اصولوں کی روشنی میں زندگی گزارنے کا نام اسلام تھا اس لیے انھوں نے دنیا اور سیاست سے راہبانہ تعلقِ بےتعلقی نہیں رکھا۔ بلکہ انھوں نے خیر و شر کی رزم گاہ میں تماشائی سے زیادہ فریق کا رویہ اختیار کیا۔ ان کا بچپن اور عنفوانِ شباب دارالعلوم دیوبند کی علمی اور انقلابی فضا میں گزرا تھا۔ اس لیے دینی علوم کے ساتھ قومی اور ملّی سیاست بھی

ان کی شخصیت میں رچ بس گئی تھی۔ انھوں نے اپنے عنفوانِ شباب میں تحریکِ خلافت کی آواز پر لبیک کہا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۰۹ء میں جس وقت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کی وفات کی خبر دیوبند پہنچی، اس وقت مفتی صاحب تحریکِ آزادی کے ایک جلسہ کو خطاب کر رہے تھے۔ تحریکِ خلافت سے ان کی وابستگی ایک طرف قومی سیاست سے ان کا ذہنی رشتہ جوڑتی ہے اور دوسری طرف ملی مسائل اور اسلامی ممالک کی سیاست سے گہری دلچسپی کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد قومی زندگی کا عجیب عالم تھا۔ زندگی کے افق پر سینکڑوں رنگ ایکدوسرے کو کاٹتے ہوئے گزر رہے تھے۔ ملک آزاد ہوگیا تھا۔ ذہنیت غلام تھی کچھ ہمارے تساہل اور کچھ خود غرضی نے ملکی سیاست کو بازیچۂ اطفال بنادیا تھا۔ خوشحالی کے خواب کو افلاس نے جھٹلا دیا تھا۔ تعصب اور فرقہ پرستی نے قومی ایکتا کی ردا تار تار کردی تھی۔ تاریکی روشنی کو ڈس رہی تھی۔ جہل علم کو نگل رہا تھا۔ چاروں طرف آگ اور خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی۔ انسانیت سر بگریباں تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد خون کا دریا پار کرکے سرحد پار جاچکی تھی۔ پاکستان سے مظلوم ہندو اگنی پریکشا دے کر ہمارے یہاں "شرنارتھی" بن چکے تھے۔ ایسی صورت حال میں ہندوستانیت اور انسانیت، تہذیب اور شرافت سینکڑوں خنجروں کی زد پر پڑی ہوئی تڑپ رہی تھی اس عالم میں کسی مفکر اور دانشور کا خاموش رہنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ مفتی صاحب نے قومی اور ملی مسائل کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنالیا۔ وہ اس نکتہ سے آگاہ تھے کہ اگر انسانیت کا وجود خطرے میں ہو تو ایک کرمِ کتابی کی نہیں مردِ انقلابی کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ انھوں نے اپنے علم کا رشتہ عمل سے ملالیا۔ ان کا علم ان کے عمل کو اور ان کا عمل ان کے علم کو جلا کرتا رہا۔ اگرچہ مفتی صاحب اوائل عمری ہی سے تحریکِ خلافت اور اس کے بعد جمیعتہ العلمائے ہند سے وابستہ رہے۔ لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد اُن کا سیاسی تدبر زیادہ بروئے کار آیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد تو کہا جاتا تھا کہ مولانا حفظ الرحمان جمیعتہ العلماء کے "بازوئے شمشیر زن" مولانا محمد میاں "لوح و قلم" اور مفتی صاحب "دماغ" ہیں۔ اگرچہ مولانا حفظ الرحمان جمیعتہ العلماء کے اہم ستونوں میں تھے اور مفتی صاحب بظاہر معمولی رکن تھے۔ لیکن ان کی رائے کا احترام کیا جاتا اور ان کا جمیعتہ سے جو تعلق تھا، وہ فعال رشتہ کے ضمن میں آتا ہے۔ مولانا حفظ الرحمان کی وفات کے بعد جمیعتہ العلماء ایک ایسے دوراہے پر آگئی جہاں

شخصی مفادات، اجتماعی مفادات پر اور جذبات عقل پر چھا گئے۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ لیکن وقتی طور پر بعض زعمائے ملت نے یہ راہ نکالی کہ حضرت مولانا فخرالدین کو صدر بنایا گیا اور مفتی صاحب کو ورکنگ صدر کا عہدہ تفویض کیا گیا۔ مگر انسانی نفسیات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا منافقوں کے ہجوم میں مفتی صاحب کے شیشۂ دل میں بال آ چکا تھا۔ کب تک برداشت کرتے۔ اُن کے سامنے دو راستے تھے۔ جمعیتہ کے اندر رہ کر جنگ کرنے کا۔ جس سے جمعیتہ العلماء کمزور ہوتی۔ یا باہر نکل کر اپنی راہ الگ بنانے کا جس میں اپنا ذاتی وجود خطرے میں پڑتا۔ اس دوراہے پر انھوں نے تاریخی فیصلہ کیا۔ انھوں نے اجتماعیت کو کمزور کرنے کے بجائے اپنے وجود کو خطرے میں ڈالنا پسند کیا اور جمعیتہ العلماء کو چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ یہ واقعہ ان کی شخصیت کا ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ انھیں جمعیتہ کو الوداع کہنے میں جو ذہنی کرب اور صدمہ پہنچا، اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں، جنھیں" ذہنی ہجرت "کے تجربوں کے صدموں سے دو چار ہونا پڑا ہے۔

جمعیتہ العلماء ہند سے الگ ہونے کے بعد، مفتی صاحب نے ایک ایسی جماعت کا منصوبہ بنایا، جو زیادہ وسیع بنیادوں پر قائم ہو۔ انھوں نے مسلمانوں کے مختلف مسالک کے علماء سے ربط قائم کیا مختلف سیاسی رہنماؤں سے گفتگو کی مسلمانوں کی متعدد تنظیموں اور اداروں سے رشتہ قائم کیا۔ چنانچہ ۱۹۶۴ء میں لکھنؤ کے اجلاس میں یہ خواب مجلس کی شکل میں شرمندۂ تعبیر ہوا مجلس مشاورات ایک ایسے فورم کی شکل میں نمودار ہوئی۔ جہاں مسلمان اپنے مذہبی اعتقادات اور سیاسی نظریوں سے اوپر اٹھ کر مسلمانوں کے اہم اجتماعی معاملات اور مسائل حل کرنے میں ایک دوسرے سے اشتراک عمل کرتے۔ ابتدا میں ڈاکٹر سید محمود اس کے صدر اور مفتی صاحب نائب صدر مقرر ہوئے۔ چنانچہ مجلسِ مشاورت نے مسلمانوں کے دینی تعلیمی، معاشی اور اجتماعی مسائل کا تجزیہ کیا۔ اور ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی جدید ہندوستان میں مجلسِ مشاورت نے مسلمانوں کے مسائل کو کس حد تک حل کیا' اس کا فیصلہ ہونا باقی ہے۔ ڈاکٹر سید محمود کی وفات کے بعد مجلسِ مشاورت کا قرعۂ فال مفتی صاحب کے نام نکلا۔ اس بات سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ اس دور میں مفتی صاحب کی شخصیت ایک مرکزی حیثیت رکھتی تھی جس پر مسلمانوں کے اکثر فرقے اور سیاسی جماعتیں نیز ادارے اور تنظیمیں متفق تھیں انھیں سرکار کے علاوہ غیر سرکاری تنظیموں اور اداروں کا اعتماد بھی حاصل تھا۔ یہ ایسی خصوصیت ہے، جو ان کی شخصیت کو عہد حاضر

میں ایک ممتاز درجہ عطا کرتی ہے۔ مفتی صاحب مختلف عناصر کو یک جا کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ مختلف المزاج افراد، اداروں اور جماعتوں کو ساتھ لے کر چلنے کا فن جانتے تھے۔ مگر اس کا وہی حشر ہوا جو مسلمانوں کی عام جماعتوں اور تنظیموں کا ہوتا ہے۔ مفتی صاحب اندھوں کی نگری میں کب تک آئینے بیچتے۔ خود مجلس کے عناصر کی منافقتوں اور رقابتوں نے اس تنظیم کو کمزور کر دیا۔ مفتی صاحب، اس بات سے مغموم تھے، مگر مایوس نہ تھے۔ انھیں اُمید تھی کہ لوگ ذاتی اختلافات، جماعتی مفادات اور فروعی خرافات سے بلند ہو کر مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کو حل کرنے میں ایک دوسرے سے اشتراک و تعاون کریں گے۔ ان کی شخصیت کا یہ رجائی پہلو بیحد اہم ہے دراصل ان کی شخصیت ایک ایسی قوس و قزح تھی، جس پر علم و عمل، ذہانت و بصیرت، تدبر اور روشن خیالی کے رنگ رقص کرتے تھے۔ ان کی شخصیت اسلامی اور قومی تہذیب کی روشن علامت تھی۔

جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں، مفتی صاحب نے ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ اُس دور میں مسلمان دانش وروں کے سامنے یہ سوال تھا کہ ہندوستان کے بدلے ہوئے نقشہ پر مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہو۔ یہ مسئلہ کمان نہ تھا۔ مسلمانوں کی جان، مال اور آبرو کا مسئلہ تھا۔ اس سوال کے ساتھ دوسرے بہت سے ضمنی اور ذیلی سوالات بھی وابستہ تھے۔ یعنی یہ کہ بدلے ہوئے حالات میں خود مسلمانوں کا کیا رویہ ہو؟ برادرانِ وطن کے دل سے کس طرح شک و شبہ کی گرد دور ہو۔ یہ اور اِس طرح کے دوسرے بہت سے سوالات سامنے تھے۔ اِس مرحلہ پر مفتی صاحب نے ایک بار پھر اپنے تدبر کا ثبوت دیا۔ انھوں نے برادرانِ وطن کی غلط فہمیوں کو دور کرنے اور مسلمانوں میں حوصلہ اور بیداری پیدا کرنے کے لیے اپنے رفقاء کے ساتھ ملک گیر دورے کا پروگرام مرتب کیا۔ چنانچہ مفتی صاحب نے ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر عبد الجلیل مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ابراہیم سلیمان سیٹھ، مولوی محمد اسماعیل، مولانا منظور النبی اور پنڈت سندرلال کے ہمراہ لگ بھگ ۲۴ ہزار میل کا سفر کیا۔ ملک کے کونے کونے میں پہنچ کر ملک کے بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کو خاص طور پر، اور برادرانِ وطن کو عام طور پر ان کے فرائض یاد دلائے قومی اتحاد، بقائے باہم اور مل جل کر رہنے پر زور دیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو ذہنی انتشار سے نکال کر جینے کا حوصلہ بخشا۔ برادرانِ وطن کے دلوں سے شبہات کو دور کرنے کی کوشش کی۔

اور تمام ہندوستانیوں کو ایک ذہنی رویے ایک نئے مگر تعمیری نظریہ حیات اور نئی روش حیات کی طرف مائل کیا۔ جو لوگ سیاست کے آتار چڑھاؤ پر گہری نظر رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ مسلمانوں کے لیے خاص طور پر پر آشوب تھا۔ مفتی صاحب نے اِس بحرانی دور میں اپنی خوش بیانی، سحرِ خطابت اور تدبر سے دلوں کو جوڑنے کا کام انجام دیا۔ سچ یہ ہے کہ ؎ جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتحِ زمانہ

مفتی صاحب کو سماجی اور تہذیبی کاموں سے جو لگاؤ تھا، اس کو واضح کرنا اور اُس کے اثرات و نتائج کی نشاندہی کرنا، ان کے سوانح نگار کا کام ہے، یوں بھی چاول پر قل ھو اللہ احد لکھنا آسان کام نہیں۔ لیکن ان کے تعلیمی تہذیبی اور سماجی خدمات کا ہلکا سا خاکہ پیش کرنا ضروری ہے۔ تاکہ مفتی صاحب کی شخصیت کا سماجی پہلو بھی سامنے آجائے۔ اُنھوں نے اینگلو عربک اِسکول کی مینیجنگ کمیٹی کے صدر، مسلم یونیورسٹی کورٹ کے رکن، جامعہ ملیہ اسلامیہ کورٹ کے رکن کی حیثیت سے نہ صرف یہ کہ اعلیٰ تعلیمی اداروں سے فعّال رشتہ قائم رکھا بلکہ جدید تعلیمی نظریات کے فروغ میں خاموش خدمات انجام دیں۔ یہ تعلق ایک طرف مفتی صاحب کی روشن خیالی اور وسیع النظری کا ثبوت فراہم کرتا ہے اور دوسری طرف اُن علمار کو دعوتِ فکر و نظر دیتا ہے، جو اب بھی جدید تعلیم کو کلّی طور پر مضر اور مہلک خیال کرتے ہیں۔ اِن اداروں سے مفتی صاحب کا تعلق رسمی نہیں تھا بلکہ وہ اداروں کے ہر نشیب و فراز سے آگاہ رہتے تھے۔ اور صحیح معنی میں اِنھیں انسانوں کی تربیت گاہ بنانا چاہتے تھے دراصل ان کا یہ طرز عمل اس حدیث شریف کے مطابق تھا، جس میں رسول اکرم ؐ نے فرمایا ہے کہ "حکمت" مسلمانوں کی کھوئی ہوئی میراث ہے، اِسے جہاں سے ملے، حاصل کرلو یا۔ علم حاصل کرنا مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دینی تعلیم کے ساتھ مفتی صاحب نے جدید تعلیم کا فراخ دلی سے خیر مقدم کیا ہے۔ جہاں تک مذہبی اور دینی تعلیم کا تعلق ہے، اِس میدان میں اُن کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ انھوں نے مدرسہ عبدالرب کے صدر، مسلم کلچرل اینڈ ایجوکیشنل سوسائٹی کے صدر کی حیثیت سے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ موخرالذکر سوسائٹی کے تحت ایک نسوانی اسکول بنام مدرسۃ البنات دہلی میں بہت اہم خدمات انجام دے رہا ہے اس کے علاوہ مفتی صاحب ہندوستان کے عظیم دینی تعلیم کے اداروں کے سرگرم اور فعال کارکن کی حیثیت سے اس میدان میں

ایک امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے اسلامک انسٹی ٹیوٹ حیدر آباد کے رکن، ندوۃ العلماء اعظم گڈھ کی مجلسِ انتظامیہ کے رکن اور دارالعلوم دیو بند کی مجلس شوریٰ کے رکن کی حیثیت سے ایک طرف اِن اداروں کے انتظامی معاملات کو مفید اور معتدل بنانے کی کوشش کی اور دوسری طرف دینی تعلیم کے فروغ میں حصہ لیا۔ مفتی صاحب ایک خالص مذہبی عالم ہونے کے ساتھ، مخصوص جدید تعلیمی حسیت سے بہرہ مند بھی تھے۔ یہی وصف ان کو دورِ جدید کے اعلیٰ ممتاز عالموں اور مفکروں میں شامل کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مفتی صاحب کے تعلیمی نظریہ کے وسیع کینوس پر دینی اور دنیاوی ہر قسم کی تعلیم کے رنگ کھلتے اور کھلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مفتی صاحب نے اگرچہ خالص سیاسی عہدوں کو قبول نہیں کیا۔ مگر وہ اس سے یکسر بے نیاز بھی نہیں رہے۔ انھوں نے ایسے سرکاری اور نیم سرکاری عہدوں کو ضرور قبول کیا جن کے ذریعہ خاص طور پر مسلمانوں کی اور عام طور پر تمام اہلِ وطن کی خدمت انجام دی جا سکتی تھی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اسلامی شعائر اور مسلمانوں کے مسائل کو پیشِ نگاہ رکھا۔ ارکانِ اسلام میں حج کو جو فضیلت حاصل ہے، اس سے ایک عام مسلمان بھی واقف ہے۔ حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ حجِ مبرور کے بعد انسان اتنا پاک اور صاف ہوتا ہے، جتنا پیدائش کے فوراً بعد ایک بچہ۔ اس لیے مفتی صاحب نے سنٹرل حج کمیٹی کی تین بار صدارت قبول کر کے مسلمانوں کو فریضۂ حج کی ادائیگی میں خاموش خدمات انجام دیں۔ ہندوستان میں مسلم اوقاف کا معاملہ پہلے بھی پیچیدہ تھا اور اب بھی پیچیدہ ہے۔ اوقاف کے مسائل حل کرنے کے لیے دینی شعور کے ساتھ جس نیک نیتی، تدبر اور دردمندی کی ضرورت ہے، وہ مفتی صاحب کی شخصیت میں موجود تھی۔ مفتی صاحب نے دہلی وقف بورڈ کے صدر اور اس کی مالیاتی کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دیں۔ اگرچہ اس سلسلے میں ان کے بعض فیصلوں پر نکتہ چینی بھی کی گئی۔ اور بعض حلقوں سے سنگِ ملامت بھی برسائے گئے، لیکن ان کے بے رحم نقاد بھی مفتی صاحب کے حسنِ تدبیر کے قائل رہے۔ مفتی صاحب سنٹرل وقف کاونسل کے رکن بھی رہے۔ انھوں نے جناب حافظ محمد ابراہیم مرحوم کے دورِ وزارت اور سید اظہر حسین صاحب کے دورِ نظامت (سیکریٹری شپ) میں وقف ایکٹ بنوا کر اوقاف کے معاملات کو صحیح سمت و جہت عطا کرنے کی کوشش کی۔ اس دور میں یہ بات لوگوں کے ذہن سے محو ہوتی جا رہی ہے

کہ مسجد عبدالنبی کے سلسلہ میں سرکار نے جو کمیٹی تشکیل دی تھی، اس کے صدر مفتی صاحب تھے۔ مفتی صاحب اور ان کی کمیٹی کی جدوجہد سے ہی مسجد عبدالنبی محکمہ آثار قدیمہ سے واگذار ہوئی تھی۔ اسی مسجد میں آج کل جمعیۃ العلماء ہند کا صدر دفتر ہے۔

اگرچہ مفتی صاحب نے اپنا مذہبی سفر علمی اور عملی نیز تحریری اور تقریری دونوں سطحوں پر شروع کیا تھا، لیکن حالات کے تغیر کے ساتھ، ان کی تقریر غالب ہوتی گئی اور ان کے تصنیفی پہلو پر ان کا عملی پہلو حاوی ہوتا گیا۔ مفتی صاحب نے اپنا علمی سفر "فتویٰ نویسی" سے شروع کیا تھا۔ یہ کام دیوبند کے بعد ڈابھیل میں بھی جاری رہا۔ اس کے بعد فتویٰ نویسی کے کام میں تسلسل نہیں رہا۔ لیکن وہ ضرورت مندوں کے سوالوں کے شرعی اور فقہی جوابات لکھتے رہے۔ اس مختصر سے عرصے میں انھوں نے جتنے استفسارات پر فتوے صادر فرمائے ہیں، اگر ان کو "فتاوائے عتیقی" کے نام سے مرتب کر لیا جاتا تو ایک اچھا خاصا علمی اور دینی ذخیرہ مہیا ہو جاتا۔ ان فتووں کے ذریعہ مفتی صاحب کی دینی فہم اور اجتہادی بصیرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۲ء تک ڈابھیل میں "بیضاوی شریف" اور "جلالین شریف" کا جو درس دیا اور اس سلسلے میں جو علمی نکات بیان فرمائے، اگر انھیں کو مرتب کر لیا جاتا تو ایک بڑا کام ہو جاتا۔ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۷ء تک مفتی صاحب نے کلکتہ میں قرآن کریم کے درس کا جو حکیمانہ سلسلہ شروع کیا تھا، اگر اس کا ریکارڈ ہوتا تو ایک ایسی تفسیر ہاتھ آجاتی، جو جدید ذہن کو متاثر کرتی۔ ۱۹۳۸ء میں ندوۃ المصنفین کے قیام کے بعد مفتی صاحب نے دو اہم علمی کارنامے انجام دیے انھوں نے علامہ ابن تیمیہ کی کتاب "الکلم الطیب" اور علامہ ابن جوزی کی کتاب "صید الخاطر" کا ترجمہ کر کے اُردو کے علمی اور دینی ذخیرے میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ ترجمہ کا فن کتنا مشکل ہے، اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں، جو اس فن کی اہمیت اور دقتوں سے عملی طور پر واقف ہیں۔ لیکن ملکی اور ملی مسائل کی عقدہ کشائی نیز ندوۃ المصنفین کی انتظامی ذمہ داریوں نے انھیں اس کام کو آگے بڑھانے کی مہلت نہ دی۔ اس کے باوجود مفتی صاحب وقتاً فوقتاً لکھتے رہے ان کے بعض مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ ممکن ہے بعض مقالات غیر مطبوعہ بھی ہوں۔ مفتی صاحب نے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۸۰ء تک ریڈیو کی درخواست پر دینی، مذہبی اور علمی مسائل اور اشخاص پر بہت سی ریڈیو تقریریں نشر کیں۔ انھوں نے نشری تقریروں کا ایک ایسا انبار لگا دیا، جس سے آئندہ نسلیں خوشہ چینی کرتی رہیں گی۔ یہیں نے

مفتی صاحب کی چند تقریروں کو جمع کر کے ۱۹۸۰ء میں "منارِ صدا" کے نام سے شائع کر دیا تھا۔ یہ تقریریں ایک طرف مفتی صاحب کے علمی و دینی شعور کی آئینہ دار ہیں، اور دوسری طرف ان کے اسلوب تحریر کا بہترین نمونہ ہیں۔ میں نے "پیش رس" میں لکھا تھا۔

"ان کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کو ریڈیو تقریر کے فنی اور تکنیکی تقاضوں کا بھرپور ادراک ہے۔ حضرت مفتی عتیق الرحمان عثمانی نے قدم قدم پر اس کا ثبوت زیر نظر کتاب میں فراہم کیا ہے ریڈیو تقریر کا فن چاول پر قل ہو اللہ " لکھنے یا ساگر کو گاگر میں بند کرنے کا فن ہے۔ ریڈیو تقریر میں موضوع کے تعین کے ساتھ وقت کی حدود کا تعین بھی ہوتا ہے۔ یعنی کم سے کم وقت میں جامع مگر واضح انداز میں بات کی جاتی ہے۔ ریڈیو تقریر متعین موضوع پر معین وقت میں پڑھی جانے والی ایک ایسی تحریر ہے، جو بیک وقت تحریر اور تقریر دونوں کی خصوصیات کی حامل ہو اور جس مقصد کے لیے لکھی گئی ہو، پوری طرح اس کا حصول کرتی ہو۔"

مفتی صاحب نے ان نشری تقریروں میں ایک طرف نشری تقاضوں اور دوسری طرف علمی و دینی مطالبوں کو پورا کیا ہے انھوں نے اسلامی عقائد، افکار، ارکان، تہذیب و ثقافت نیز اسلامی شخصیات پر جو نشری تقریریں سپرد قلم کی ہیں، وہ بہترین سرمایہ ہے۔ ان کے اسلوب میں پختگی، سادگی اور روانی کے ساتھ، جو عالمانہ وقار ہے، وہ انھیں کا حصہ ہے۔ اگر اس بات کو صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ اسلوب پر شخصیت کی گہری چھاپ ہوتی ہے، تو بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ مفتی صاحب کی نشری تقریروں اور ان کی تحریروں پر ان کا شخصیت کا نقش مرتسم ہے۔

مفتی صاحب کا وطن قصبہ دیوبند ہے جو دنیا کے نقشہ پر دینی تعلیم کا ایک روشن نشان ہے۔ اور کئی علمی اور دینی خانوادوں کا گہوارہ ہے۔ انھیں خانوادوں میں سے ایک خانوادہ عثمانی خاندان بھی ہے۔ جو اپنی علمی و دینی فضیلت اور شرافت کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مفتی صاحب کا تعلق اسی عثمانی خاندان سے ہے۔ ان کے دادا حضرت مولانا فضل الرحمان عثمانیؒ ایک جلیل القدر عالم اور روشن دل صوفی بزرگ تھے۔ مرحوم کا شمار ان چند بزرگوں میں ہوتا ہے۔ جو دارالعلوم دیوبند کے بانی کہلاتے ہیں۔ مفتی صاحب کے پدر بزرگوار حضرت مولانا عزیز الرحمان عثمانی بھی اپنی

جگہ جید عالم اور شیخ طریقت تھے۔ بقول مولانا سعید احمد اکبرآبادی انھیں کشف قبور کے علم میں مہارت حاصل تھی۔ مرحوم دارالعلوم دیوبند میں مفتی اعظم کے منصب پر فائز تھے۔ اور اخلاق کریمانہ کا پیکر تھے۔ اسی گھرانے میں ۱۹ اکتوبر ۱۹۰۱ء کو ایک چراغ روشن ہوا، جس کا نام عتیق الرحمان رکھا گیا۔ خاندان کے دستور کے مطابق عتیق الرحمان عثمانی نے دینی تعلیم حاصل کی۔ ان کا ذہنی نشو ونما دیوبند کی علم پرور فضا میں ہوا۔ اور یہیں سے انھیں سند فراغت اور دستار فضیلت حاصل ہوئی۔ انھوں نے طالب علمی کے دوران اپنے اساتذہ کو اپنی لیاقت، ذہانت اور محنت سے متاثر کر لیا تھا۔ اس لیے وہیں معین المدرس کے عہدہ پر مامور ہو گئے۔ اس دوران انھوں نے درس و تدریس کے ساتھ نائب مفتی کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ اور دنیا کے دینی نقشہ پر مفتی عتیق الرحمان عثمانی کے نام نامی سے جانے پہچانے گئے۔ مفتی صاحب نے فتوی نویسی کی تربیت اپنے والد محترم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمان عثمانیؒ مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند کے زیر سایہ حاصل کی تھی اور اس فن پر وہ عبور حاصل کیا کہ ان کا لوہا بڑے بڑے علماء نے مانا۔

مفتی صاحب ایک فعّال اور انقلابی ذہن کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں جمعیتہ الطلبا قائم کی۔ اور "مہاجر" اخبار نکالا جس کے ایڈیٹر حضرت مولانا عبدالوحید صدیقی غازی پوری مقرر ہوئے۔ مفتی صاحب نے جمعیتہ اور مہاجر کے ذریعہ اپنے فکر و عمل کا مظاہرہ کیا۔ مفتی صاحب کے ان اقدام کی اہمیت کا اندازہ اس پس منظر میں ہو سکتا ہے کہ اس دور میں مفتی صاحب کے والد محترم دیوبند کے مفتی اعظم اور عم محترم حضرت مولانا حبیب الرحمان عثمانی مہتمم تھے۔ مفتی صاحب نے دارالعلوم کے انتظام اور مطبخ کے اہتمام نیز دیگر امور میں اپنے بزرگوں اور ارباب حل و عقد سے اختلاف کیا۔ یہ ایک نوجوان عالم کی ضد نہیں تھی۔ بلکہ ایک اصول پسند، حق گو اور راست باز انسان کا اخلاقی اقدام تھا۔

مفتی صاحب کے معین المدرس مقرر ہونے کے بعد، دیوبند کے اکابر کے مابین اختلافات گہرے ہو گئے۔ اختلاف رائے اور مخالفت بے جا میں جو نازک فرق ہے، اگر اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو نتیجہ بہت برا نکلتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس شکر رنجی کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس وقت کے صدر المدرسین اور شیخ الحدیث حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ اور مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمان عثمانیؒ کو دارالعلوم دیوبند کو خیرباد کہنا پڑا۔ ان علماء اور دانش وروں کے ساتھ

مولانا بدرِ عالم میرٹھی، مولانا حفظ الرحمان اور مفتی عتیق الرحمان عثمانی بھی باہر نکل آئے۔ اس قافلے نے ڈابھیل (گجرات) کو اپنا مستقر بنایا۔ یہاں "تعلیم الدین" کے نام سے ایک چھوٹا سا مدرسہ تھا۔ یہ قافلہ اس مدرسہ سے اس طرح وابستہ ہوا کہ اس کا نام جامعۂ اسلامیہ ہو گیا۔ مفتی صاحب اس مدرسہ میں مدرس اور مفتی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ کچھ دن بعد مفتی صاحب کلکتے چلے گئے اور کولوٹولہ اسٹریٹ کی مسجد میں خطیب اور مفتی کی حیثیت سے دینی خدمات انجام دینے لگے۔

مفتی صاحب کی زندگی میں پہلا اہم موڑ دارالعلوم دیوبند کو خیرباد کہنا تھا۔ دوسرا اہم موڑ کلکتہ سے دہلی کی مراجعت ہے۔ مفتی صاحب نے ۱۹۳۸ء میں مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے مشورہ سے دہلی میں ایک دینی ادارے کے قیام کا فیصلہ کیا اور اس کا نام ندوۃ المصنفین رکھا۔ مولانا حفظ الرحمان اس ادارے کے مشیر و مربی، مفتی صاحب ناظم اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی اس ادارے کے مجلہ "برہان" کے مدیر قرار پائے۔ ۱۹۳۸ء میں اس ادارہ کا دفتر قرول باغ (دہلی) میں تھا لیکن ۱۹۴۷ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ساتھ ندوۃ المصنفین کا دفتر بھی نذرِ آتش ہو گیا۔ اس تباہی کے بعد مفتی صاحب اس ادارہ کو جامع مسجد کے علاقے میں لے آئے اس ادارے نے کئی سو کتابیں مختلف علوم و فنون پر شائع کر کے ذہن انسانی کو سیراب کیا ہے۔ اور برہان کے دینی اور علمی مقالوں نے زبردست علمی شعور بیدار کیا ہے یہ مفتی صاحب ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر آئندہ نسلیں فخر کریں گی۔

مفتی صاحب کی زندگی کے آخری چند برس بہت اذیت میں گزرے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں جن میں سے ایک دیوبند کا قضیۂ نامرضیہ بھی ہے جس نے مفتی صاحب کے دل و دماغ کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ اس قضیے میں ایک طرف حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے صاحبزادے مولوی اسعد مدنی اور ان کے ہم نوا تھے۔ دوسری طرف مولانا قاری محمد طیبؒ کے صاحبزادے مولوی محمد سالم صاحب تھے۔ دونوں طرف سے دارالعلوم دیوبند پر تسلط جمانے کے لیے جو کچھ ہوا، چشمِ فلک نے ایسے تماشے کم دیکھے ہوں گے۔ اس مسئلہ پر مفتی صاحب کا عجیب عالم تھا۔ میں جب بھی اس ذکر کو چھیڑتا ان کا رنگ متغیر ہو جاتا۔ گویا زبان حال سے کہہ رہے ہوں۔

اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

مفتی صاحب کی یہ کیفیت دیکھ کر میں اپنے سوالوں کو لبِ اظہار تک نہ آنے دیتا۔ اس ہنگامۂ دار و گیر پر مفتی صاحب نے ایک دن اتنا کہا کہ دونوں حلقے جزوی طور پر حق پر اور جزوی طور پر ناحق پر ہیں۔ انھوں نے اس اجمال کی تفصیل بیان فرماتے ہوئے کہا کہ اگر ایک طرف مولوی اسعد مدنی اور دوسری طرف مولوی محمد سالم بہ رضا و رغبت دارالعلوم سے الگ ہو جائیں تو یہ معاملہ بہ آسانی ختم ہو سکتا ہے لیکن نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ برسات کی ایک سیاہ رات میں نوجوان مولویوں کے ایک ہراول دستے نے دارالعلوم پر سیاسی نوعیت کا وہ شب خوں مارا کہ علم و دانش اور تہذیب و شرافت کا سر نگوں ہو گیا۔ علمار کی اس محاذ آرائی نے مفتی صاحب کو اندر ہی اندر کاٹ دیا تھا۔ اُن کا احساس خون ہو چکا تھا۔ موت اور زندگی خدا کی طرف سے ہے۔ لیکن حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اور مفتی صاحب کی وفات حسرت آیات کا ایک سبب دارالعلوم دیوبند پر نوجوان مولویوں کے ہراول دستہ کا شب خون بھی ہے جس کو بعض معتبر علمار کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔

کچھ عمر کے تقاضوں اور کچھ حالات کی ستم ظریفی نے مفتی صاحب کے اعصاب کو کمزور کر دیا تھا پھر بھی وہ ملت کے کاموں میں دلچسپی لیتے رہے۔ غالباً فروری ۱۹۸۲ء میں ندوۃ العلمار اعظم گڈھ نے اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر ایک بین الاقوامی سمی نار کا انعقاد کیا۔ مفتی صاحب اس سمینار میں شرکت کے بعد واپس دہلی آ رہے تھے۔ اچانک ریل میں دریاآباد کے قریب ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ اور وہ خانہ نشین ہو کر رہ گئے۔ اس کیفیت میں بھی علم، دین اور وطن سے ان کا رشتہ کمزور نہیں ہوا۔ مفتی صاحب مضبوط ارادوں کے انسان تھے۔ لیکن آخری دنوں میں بہت رقیق القلب ہو گئے تھے۔ میں نے انھیں پہاڑ کی طرح اٹل دیکھا تھا لیکن آخری دنوں میں شمع کی طرح پگھلتے بھی دیکھا۔ اور ان کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے۔ واقعہ یہ ہے کہ "ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں"۔ ۱۲ مئی ۱۹۸۵ء کو بعد نماز ظہر مفتی صاحب کا وصال ہو گیا۔ ۱۳ مئی ۸۵ء کو شاہی امام حضرت مولانا سید عبداللہ بخاری نے نماز جنازہ ادا کی۔ جس میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ کہتے ہیں کہ جس شخص کی نمازِ جنازہ میں ۴۰ افراد سے زیادہ شریک ہوں تو اس پر رحمت کو پیار آ جاتا ہے۔ اس اعتبار سے مفتی صاحب کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ بندوں کے پیارے تو تھے ہی تھے، اللہ کے پیارے بھی

قرار پائے۔ مفتی صاحب کی تدفین قبرستان مہندیان میں ہوئی، جہاں حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، حضرت شاہ رفیع الدینؒ حضرت شاہ عبدالقادرؒ اور دوسرے بہت سے جلیل القدر علما، صوفیا اور دانش ور آسودۂ خواب ہیں۔ اس طرح ایک جاگتی ہوئی شخصیت سوگئی۔ سچ ہے اللہ باقی مِن کُلِّ فانی مفتی صاحبؒ نے اپنے فکر و عمل سے ثابت کر دیا کہ

یارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
کام کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

ھو

محمد سلیمان صابر

مولانا محمد عثمان فارقلیط

زباں پہ بارِ خدا یہ کس کا نام آیا
کہ میری نطق نے بوسے میری زباں کے لیے

برصغیر ہند پاکستان کے معروف صحافی مولانا محمد عثمان فارقلیطؒ جنہیں اُردو کی برادری نے "بزرگ صحافی" کے خطاب سے نوازا ، ۱۸۹۷ء میں عالم وجود میں آئے اور زندگی کی ۹۰ بہاریں دیکھ کر ۱۲ مئی ۱۹۷۶ء کو ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہو گئے۔ مولانا کا آبائی وطن اگرچہ دہلی سے ۲۹ میل دور غازی آباد ضلع میں پلکھوہ کا صنعتی اور تاریخی قصبہ تھا جہاں کہ انھیں ان کے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا لیکن وہ یہیں دہلی میں پیدا ہوئے اور یہیں کی گلیوں میں پلے بڑھے۔ ان کے والد محمد احمد مرحوم ایک صنعت کار تھے اور معمولی ٹھیکے بھی لیتے تھے رہائش کوچہ استاد داغ میں تھی خود مولانا مرحوم فرماتے ہیں :

"چاندنی چوک میں ایک محلہ ہے جس کا نام نیچے بندان ہے۔ آزادی کے بعد اسے کوچہ اُستاد داغ کا نام دیدیا گیا ہے۔ اسی کوچہ میں ایک نیم والا مکان ہے جو میرا زادبوم قرار پایا"

مولانا کو اپنے اس پیدائشی مکان سے بڑا لگاؤ تھا کبھی کبھی کوچہ اُستاد داغ میں جاتے اور کھڑے

ہو کر نیم والے مکان کو دیکھتے رہتے۔ اس وقت ان کی زندگی کی پوری تاریخ ان کے سامنے ہوتی تھی۔

مولانا کی ایک مختصر سی شخصیت تھی، پستہ قد لیکن جس پر بڑی بڑی قد آور شخصیتیں رشک کرتی تھیں، گندمی کھلتا ہوا رنگ اور ہنس مکھ چہرہ جو زمانہ کے تھپیڑوں سے متاثر نہیں ہو سکا تھا اور اس پر مٹھی بھر داڑھی جس سے شخصیت کسی قدر ابھر گئی تھی لیکن سادگی اور منکسر المزاجی ایسی کہ لوگ یقین نہیں کرتے تھے کہ وہ جس بزرگ کو دیکھ رہے ہیں وہ برصغیر کا وہی معروف صحافی ہے جس کے جوان قلم نے خوف و دہشت کے مارے لوگوں کو حالات سے مقابلہ کرنے کے لیے نیا حوصلہ اور نئی ہمت دی ہے۔

سر کے بالوں سے جوانی ہی میں نجات پالی تھی اور اسے وہ قدرت کی طرف سے ایک عطیہ سمجھتے تھے۔ مذاحاً کہا کرتے کہ میرے سر کے بال اس لیے اڑ گئے ہیں تاکہ وقت کی نزاکتوں کو محسوس کرنے اور سمجھنے میں دماغ کی راہ میں بال مزاحم نہ ہوں۔

ڈاڑھی اور سر کے بچے کھچے بالوں میں سفیدی آئی تو بزرگی کا پردہ رکھنے کے لیے خضاب کا سہارا لیا لیکن وہ جلد ہی اس ناپائیدار رنگ سے دست بردار ہو گئے۔ بڑی رازداری سے کہا کرتے "میاں اب آخری عمر میں کیا خاک مسلمان ہونا" پتہ نہیں چلا کہ جوانی کب آئی اور کب چلی گئی۔ میں لکھنے میں مصروف رہا اور اب

وقت پیری شباب کی باتیں ۔۔۔ ایسی ہیں جیسے کہ خواب کی باتیں

مولانا کی سادگی اور انکساری کا اظہار ان کے ہر عمل سے ہوتا تھا دفتری زندگی سے گھر کی زندگی تک۔ وہ اکثر اپنے کام خود کر لیتے تھے اور کسی کو تکلیف دینا پسند نہ کرتے تھے، دفتر میں کبھی ملنے والے زیادہ تعداد میں آجاتے تو برابر کے کمرے میں کرسی لینے خود آجاتے۔ چپراسی سے پینے کے لیے پانی کبھی نہ مانگا خود اٹھ کر جاتے تھے۔ کبھی کبھی انہیں راشن لینے والوں کی قطار میں کھڑے ہوتے دیکھا گیا۔ مولانا کی یہ سادگی ان کی پوشاک اور خوراک میں بھی نمایاں تھی۔ معمولی کپڑے کی قمیض لٹھے کا پاجامہ۔ اور کپڑے کی ٹوپی اور کبھی کبھی شیروانی، ـــــ یہ تھی ان کی پوشاک، کھانے کے معاملہ میں بڑی سادہ طبیعت پائی تھی جو مل گیا صبر و شکر کے ساتھ کھا لیا۔ ناشتہ میں صرف ایک پیالی چائے پیتے اور اسی لیے دوپہر کو جلد کھانا کھانے کی عادت تھی۔ پھلوں میں آم کے علاوہ تربوز اور خربوزے سے

رغبت تھی۔ وفات سے ایک روز قبل جب ان کی قوت گویائی باقی نہ رہی تھی تو بچوں کی طرح کاغذ پر کچھ حروف لکھے جنھیں ملا کر پڑھا گیا تو تربوز سمجھنے میں آیا۔ انھیں تربوز کا پانی دیا گیا لیکن اب ان کی خوراک بند ہونے کا وقت آچکا تھا۔

مولانا کو تعلیم کا شوق بچپن سے رہا سات آٹھ سال کی عمر میں خود ہی زینت محل کے مدرسہ میں پہونچ گئے اسی اسکول میں ان کی پرائمری تعلیم کی بسم اللہ ہوئی اور یہیں انھوں نے قاعدہ پڑھا اور تختی لکھی۔ مولانا فرماتے ہیں "استاد میری خوش خطی کی تعریف کرتے تھے لیکن بعد میں خوشخطی کی یہ رعایت نہ کر سکا"

عبدالحلیم شرر کے ناولوں خاص کر فلورا فلورنڈا ناول سے متاثر ہوئے اور اسلامی تعلیم سے رغبت ہوئی اور پھر شوق ایسا جاگا کہ تحصیل علم مکمل کر کے چھوڑی۔ مدرسہ و مسجد حاجی علی جان کوچہ خانچند اور مسجد فتحپوری ان کی درسگاہیں تھیں۔ پرائیویٹ اساتذہ میں نواب ضمیر مرزا کا نام خصوصیت سے لیا جاسکتا ہے جو نواب لوہارو کے چچا تھے۔ وہ کسی کو شاگرد نہ بناتے تھے لیکن مولانا کے شوق کو دیکھ کر وہ انکار نہ کر سکے۔ ترمذی شریف کا نصف حصہ ان ہی سے پورا کیا۔

انگریزی سے بھی غافل نہ رہے اور پرائیویٹ طور پر اتنی استعداد حاصل کر لی کہ اچھے اچھے مترجم ان سے اصلاح لیتے تھے۔ ہندی اور سنسکرت بھی سیکھی اور علم کے سب ہتھیاروں سے مسلح ہو کر مناظروں کے میدان میں کود پڑے۔ اس زمانہ میں دلچسپی کا کوئی اور سامان بھی نہ تھا۔ نہ ریڈیو نہ ٹی وی، نہ فلم اور نہ کرکٹ۔ آج کی دلچسپیاں اور ہیں اور اسی برس پہلے کی دلچسپیاں اور تھیں ــــ آج دلچسپ علمی بحثوں کے لیے نوجوانوں کے پاس وقت نہیں ہے لیکن اس وقت وقت ہی وقت تھا۔ مولانا فارقلیط ان مذہبی رہنماؤں کی تقریریں پابندی سے سنتے تھے جو فوارہ پر اپنی اپنی باری پر بولا کرتے تھے یہ مقررین نہ صرف اپنے اپنے مذہب کی بڑائی بیان کرتے بلکہ دوسرے مذاہب پر اعتراضات بھی کرتے تھے جس سے کبھی کبھی دلچسپ بحثیں شروع ہو جاتیں۔ اس وقت کے مقررین میں مولانا احمد سعید، پنڈت رام چندر اور احمد مسیح کے نام خاص طور سے لئے جاسکتے ہیں۔ یہ اسلام، آریائی اور مسیحی مذاہب کے نمائندے تھے مناظرے کرتے تھے لیکن باہم دوست بھی تھے۔ بعد میں مولانا فارقلیط نے بھی مناظروں میں حصہ لیا اور دیکھا گیا کہ احمد مسیح

آخر وقت تک مولانائے مرحوم سے ملنے آتے رہے۔ مناظرہ کے اپنے دور کو یاد کر کے وہ خوب لطف لیتے تھے۔ یہ مذہبی مناظرے اگر آج کی فضا میں ہوں تو شاید خطرناک شکل اختیار کر لیں لیکن اس زمانہ میں انہیں مذہبی معلومات میں اضافہ کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ مقررین اور سامعین دونوں پڑھ پڑھ کر آتے تھے اور تقریروں کی مشقیں ہوتی تھیں۔ مولانا احمد سعید نے تو اسی مقصد سے ایک انجمن اصلاح الکلام بھی قائم کی تھی جس کے ہفتہ وار اجتماعات شہری مسجد میں ہوتے تھے۔ انگریزی حکومت خوش تھی کہ لوگوں کی توجہ اس کی طرف سے ہٹی ہوئی ہے اس لیے تعرض نہ کرتی تھی۔

یہی مذہبی تقریریں اور مناظرے مولانا فارقلیط کے لیے مضامین نویسی کا باعث بنے۔ جو اس وقت کے مشہور مناظر مولانا ثناء اللہ امرتسری کے اخبار اہل حدیث میں شائع ہوئے۔ ان مضامین کی اشاعت سے ان کی حوصلہ افزائی ہوئی اور ان کا رجحان صحافت کی طرف ہوا۔ پہلی بار وہ صحافی میدان میں ۱۹۲۶ء میں آئے۔ جب کراچی سے نکلنے والے اخبار الوحید سے وابستہ ہوئے وہاں وہ عربی سے اُردو میں ترجمہ کرتے تھے جسے سندھی قالب میں ڈھال لیا جاتا تھا۔ مولانا کا مشاہرہ ۶۰ روپیے تھا جو اس وقت کی ارزانی کی مناسبت سے کافی زیادہ تھا۔ صرف دس پندرہ میں خرچ چل جاتا تھا اور باقی رقم سے مولانا کتابیں خریدتے۔ کتابیں خریدنے کا ان کا ایک مشغلہ بن گیا تھا۔

دہلی ملنے آئے تو مولانا احمد سعید نے انہیں روک لیا۔ اور اپنی باتوں سے انہیں ایسا متاثر کیا کہ انھوں نے واپس جانے کا خیال ترک کر دیا۔ اور الجمعیۃ سے منسلک ہو گئے۔ اس وقت الجمعیۃ سہ روزہ تھا اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بانی جماعت اسلامی اس کے چیف ایڈیٹر تھے انھوں نے مولانا فارقلیط کی بڑی حوصلہ افزائی کی اور پیشگوئی کی کہ ایک روز تمہارے قلم کی شہرت ہوگی۔ یہ مولانا ابوالاعلیٰ کی یہ پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی اور مولانا فارقلیط نے اپنے قلم کا ایسا سکہ بٹھایا کہ برصغیر کے بہترین صحافیوں میں ان کا شمار ہوا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے حیدرآباد چلے جانے کے بعد مولانا فارقلیط اخبار کے چیف ایڈیٹر بنے اور ایک معیاری اخبار کی حیثیت سے اسے نکالا۔ لیکن ہر جماعت میں گروپ بندی ہوتی ہے جمعیۃ علماء بھی اس کا شکار بنی اور اس سے بچ کر مولانا فارقلیط بجنور

چلے گئے تھے جہاں سے اخبار مدینہ کے مالک مولوی مجیدؔن کی طرف سے پہلے سے ان کو پیش کش تھی۔ مولانا نے پہلے رسالہ فاران کو اور پھر مدینہ سہ روزہ کو سنبھالا لیکن ابھی ایک ہی سال گذرا تھا کہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رح بجنور پہونچے اور مولوی مجید حسن سے کہا کہ "میں تم سے ایک بھیک مانگنے آیا ہوں کہ آپ فارقلیط کو واپس کردیں الجمعیۃ کو ان کی ضرورت ہے"۔ مولوی مجید حسن گھبرائے لیکن حضرت شیخ کے حکم کو نہ ٹال سکے۔ مولانا کو اجازت مل گئی اور انھوں نے پھر الجمعیۃ کی ادارت سنبھال لی۔ مولانا نورالدین بہاری اس کے نگراں بنے۔ لیکن یہ گاڑی زیادہ نہ چل سکی اور ایک مرتبہ پھر مولانا سبکدوشی کے لیے مجبور ہو گئے — اور کچھ دن بعد ایسے حالات پیش آئے جن کی لمبی کہانی ہے کہ خود الجمعیۃ بھی بند ہو گیا۔

۱۹۳۹ء میں مولانا لاہور چلے گئے جہاں زمزم کی ادارت سنبھالی کچھ دن بعد دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی اور اخبارات کا دائرہ تنگ کردیا گیا لیکن احتیاط کے باوجود مولانا نے حکومت کو تنقید سے معاف نہیں کیا۔ ان کے تیرونشتر سے حکومت پریشان تھی کئی بار پریس افسر کے دفتر میں طلب کر کے تنبیہ کی گئی لیکن مولانا فارقلیط کسی کا اثر لینے والے نہ تھے بالآخر ایک سال کے لیے زمزم بند کردیا گیا یہ مدت مولانا نے اپنے وطن مالوف میں گذاری۔

ایک سال بعد وہ پھر لاہور پہونچے اور پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ لکھنا شروع کردیا۔ زمزم میں مولانا کی تحریریں حقیقت میں آگ بگولا ہوا کرتی تھیں حالات سے سمجھوتہ کرنے کی بات انھوں نے سوچی ہی نہ تھی ان کا قلم یوں سمجھئے دودھاری تلوار تھا جس سے انگریز حکومت ہی نہیں بلکہ بعض اوقات اپنے بھی پناہ مانگتے تھے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ مولانا کو یقین ہو گیا کہ اب آزادی کے خواب کی تعبیر پوری ہونے والی ہے لیکن عبوری حکومت ہی کے دوران اندازہ ہو گیا تھا کہ ہوا کا رُخ کدھر ہے اور آزاد ہندوستان کا کیا نقشہ بننے والا ہے۔ آزادی سے تین ماہ قبل جب کہ ملک گیر فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا لاہور سے بچوں کو لینے کے خیال سے آئے جنہیں کچھ دن قبل چھوڑ گئے تھے اور پھر واپس نہ جا سکے۔ کسی وقت کراچی سے آئے تھے تو انہیں جمعیۃ علماء کے اس وقت کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا احمد سعید نے روکا تھا اور اس مرتبہ جماعت کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا

حفظ الرحمانؒ انہیں روکنے کے لیے موجود تھے۔

مولانا نے الجمیعۃ کی ادارت سنبھالی۔ ۱۹۴۷ء میں ایسے وقت جب کہ شاہ جہاں کی بسائی دلّی کی تہذیب اور دلّی کی پرانی قدریں ہچکیاں لیتی نظر آرہی تھی۔ قوم کی نیا کھینے کا دعویٰ کرنے والے بڑے بڑے ممتاز رہنما راہ فرار اختیار کر رہے تھے اور پوری ملت اپنے آپ کو بے سہارا محسوس کر رہی تھی مولانا کو اپنا مفاد عزیز ہوتا تو وہ واپس جا سکتے تھے لیکن انھوں نے ملّت کے مفاد پر اپنے مفاد کو قربان کر دیا اور اسے بھنور سے نکالنے میں لگ گئے۔ تقریباً نو سال کی غیر حاضری کے بعد الجمیعۃ اس بار ۲۴ دسمبر ۱۹۴۷ء کو روزنامہ کی شکل میں منصۂ شہود پر آیا۔

مولانا نے اپنے پہلے ہی اداریہ میں اعلان کیا کہ وہ خوف و دہشت کے ماحول کو بدلنے میں اپنا کردار ادا کریں گے۔ انھوں نے تقسیم کے نتیجہ میں مسلمانوں پر چھائی ہوئی خوف و دہشت کو اسلامی نفسیات کا سب سے بڑا حادثہ" قرار دیا اور اعلان کیا کہ" الجمیعۃ کا اولین فرض ہوگا کہ سب سے پہلے مسلمانوں کے ذہنی مزاج کو درست کرے اور ان کے حوصلوں کو بلند کرنے کی تدابیر عمل میں لائے۔"

انھوں نے مایوس و ناامید افراد ملت کو کردار کی پختگی اور حوصلہ مندی کا پیغام دیا اور لکھا کہ

"آج بھی میدان کارزار موجود ہیں لیکن ان کی نوعیت بدل چکی ہے اس وقت ہمیں غیروں سے لڑنا تھا آج اپنوں کی تربیت کرنی ہے۔ وہ وقت خون بہانے کا تھا آج گھڑی خون کا ایک ایک قطرہ خشک کرنے کی آ چکی ہے کردار کی پختگی اس وقت بھی درکار تھی یہ پختگی آج بھی درکار ہے عمل اور حوصلہ مندی کی جب بھی ضرورت تھی اور آج بھی ہے موم بتی کی طرح اپنے جگر کا خون اور اپنی ہڈیوں کا روغن جلاکر اس وقت بھی آپ نے اپنا فرض انجام دیا تھا اور آج بھی فرض کا یہ احساس اسی مشت استخواں اور خون جگر کا مطالبہ کر رہا ہے۔

مولانا کے اس پیغام میں مایوس دلوں کو اُمید کی نئی کرن نظر آئی، ان کی ڈھارس بندھی اور انھیں اطمینان ہوا کہ قدرت نے ان کا مقدمہ پیش کرنے کے لیے مرد مجاہد کو ان کے درمیان بھیج دیا ہے۔ مولانا نے نتائج سے بے پروا ہو کر مظلوموں کی حمایت میں آزادانہ طور پر لکھنا شروع کر دیا اور ان کے قلم سے نکلنے والے شعلہ بلند ہونے لگے اس وقت مولانا نے مسلمانوں کو اپنی جان بچانے کا نہیں اپنے تحفظ کے لیے اپنی جان دے دینے کا سبق دیا۔ نتیجہ میں بھاگتے لوگوں کے

قدم رک گئے اور سینکڑوں نہیں ہزاروں نے اپنے بندھے بستر کھول دیئے ۔ ایک نحیف سے اور ہلکے پھلکے پستہ قد فارقلیط نے ان کے اندر جرأت وہمت پیدا کردی تھی کہ مولانا کا جدھر سے گذر ہوتا لوگ ان کے ہاتھ چومتے اور اس بات کے لیے ان کا شکریہ ادا کرتے کہ انھوں نے ان کو آگ سے کھیلنے اور طوفان سے ٹکرا جانے کی ہمت عطا کی ۔ انہیں یہ احساس ہوگیا کہ اس جہان رنگ وبو میں وہ اکیلے نہیں بلکہ ان کی طرف سے بولنے والا کوئی نہ کوئی موجود ہے ۔

مولانا کا قلم شعلے اگلتا رہا اور مسلم مسائل کو وہ بڑی شدت کے ساتھ پیش کرتے لیکن خوف ودہشت کی فضا میں جو اس وقت چھائی ہوئی تھی اس وقت کی انتظامی مشنری کو ایک قلندر کی مداخلت بے جا پسند نہ آئی اور اخبار ایک ماہ کے لیے بند کردیا گیا ۔ لیکن مولانائے مرحوم ایسے بہت سے مرحلوں سے گذر چکے تھے ۔ ایک ماہ کی جبری بندی کے باوجود ان کا قلم زنگ آلود نہیں ہوا بلکہ اس میں اور تیزی آگئی ۔ انھوں نے اپنے خون جگر کو اپنے قلم کی سیاہی بنا کر ایک مردہ قوم کو زندہ کرنے اور ایک پریشان حال طبقہ کو نئی زندگی دینے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو وہ کرسکتے تھے ۔

مولانا کو کئی محاذوں پر لڑنا پڑھ رہا تھا ایک محاذ فرقہ پرست پریس کا بھی تھا جس کا خاص مقصد اس پرامن ماحول کو بگاڑنا تھا جو اس وقت قومی حلقے اور ذمہ دار سیاسی رہنما بنانے کی کوششوں میں مصروف تھے ۔ مولانا بے شک کسی حد تک جذباتی تھے لیکن ایسے نہیں کہ ہوش وحواس کھو بیٹھیں ۔ وہ جب دس بار دیکھتے کہ کوئی نام نہاد صحافی مسلسل اسلامی کلچر اور اسلامی قدروں کا دل آزار انداز میں تمسخر اڑا کر فرقہ وارانہ منافرت کو ہوا دئے چلا جارہا ہے تو ایک بار جواب دیتے اور دندان شکن جواب دیتے بقول ایک شاعر

اس نے جب سو تیر چلائے
میں نے ایک غزل چپکادی

لوگ مولانا کے بچے تلے الفاظ اور بے لاگ و پروقار انداز بیان کے عاشق تھے ہر روز تعریف کے خطوط آتے اور مولانا محسوس کرتے کہ ان کی محنت رائگاں نہ گئی ایک صاحب نے لکھا:

"اگر شاہجہاں نے ہمارے وطن عزیز کو تاج محل دیا تو جمیعۃ علمار ہند نے صحافی دنیا کو ایک بہترین صحافی ملا جسے سب مولانا محمد عثمان فارقلیط کے نام سے جانتے ہیں۔"

دار المصنفین اعظم گڈھ کے جناب معین الدین صاحب نے حضرت مولانا کو لکھا:

"اس زمانہ میں جس دلیری سے آپ لکھتے ہیں وہ بڑا جہاد ہے آپ کے ادارے اور نوٹ

الجمیعۃ کی جان ہوتے ہیں وہ آپکے ہی قلم سے زندہ ہے ان کو پڑھے بغیر بڑی کمی محسوس ہوتی ہے۔"

لیکن یہی تحریریں جن کی تعریف میں روز خطوط آتے تھے سرکاری مشنری کے کچھ کارندوں کو پسند نہ آئیں اور انہیں تقریباً ایک درجن مقدمات میں ملوث کیا گیا زیادہ تر مقدمات ان مضامین پر چلے جن میں انھوں نے بعض غیر مسلم فرقہ پرست اخبارات کی فرقہ پرستی اور دل آزار مضامین کی نشاندہی کی تھی اور ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔ مولانا نے بڑی خندہ پیشانی سے ان مقدمات کی تکلیف کو برداشت کیا اور تین مقدمات میں سزا ملنے پر دو چار روز پرنٹر پبلشر حکیم عبدالجلیل کے ساتھ جیل میں گذارے جس پر پورا اُردو پریس چیخ پڑا اور حکومت پرنٹ لے دے کی لیکن بالآخر تمام مقدمات میں مولانا بری ہو گئے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک مشہور غیر مسلم وکیل ہی نے جن کا کبھی لاہور میں طوطی بولتا تھا اور مولانا کا بڑا مداح تھا ان کی طرف سے مقدمات کی پیروی کی اور ان کو عدالت میں بے گناہ ثابت کیا۔

مئی ۱۹۷۳ء میں جب بہت کمزور ہو چکے تھے۔ الجمیعۃ کی ادارت سے مستعفی ہو گئے۔ سبکدوشی کے زیرعنوان ایک اثر انگیز مقالہ سپرد قلم کیا

"میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ اس پُر آشوب اور صبر آزما زمانے میں راقم الحروف نے ملت، انسانیت اور ملک کی کیا خدمت انجام دی اور قارئین کرام کو کس حد تک رہنمائی ملی لیکن میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے کبھی خود داری اور غیرت کا سودا اور دانش فروشی کا مشغلہ اختیار نہیں کیا۔ نفس مطمئنہ کا یہی وہ ایک تحفہ ہے جو قدرت کی طرف سے مجھے عطا ہوا ہے۔"

مولانا ریٹائر ہو کر گھر بیٹھ رہے لیکن ان کی قلم کی پرواز برابر جاری رہی مختلف اخبارات و رسائل کا مضامین کے لیے ان پر تقاضا رہتا تھا اور وہ حتی المقدور لکھ دیتے تھے۔ ان کے مضامین کا جن میں بیشتر اصلاحی و اخلاقی ہوتے تھے سلسلہ عرصہ تک نئی دنیا ہفتہ وار میں چلتا رہا۔ اس کا اداریہ بھی جب تک حیات رہے لکھتے رہے۔ دراصل نئی دنیا کے اجرا میں ان کا مشورہ شامل تھا اس کے

بانی مولانا عبدالوحید صدیقی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا فارقلیطؒ کی بڑی پرانی دوستی تھی دونوں نے ایک دوسرے کی دوستی کو آخر وقت تک نبھایا مولانا فارقلیط کے بعض مضامین ان کی وفات کے بعد نئی دنیا میں شائع ہوئے۔

مولانا کی کتابوں میں ان کا ناول "ازبلا" کافی مقبول ہوا اور اب بھی مقبول ہے۔ نفسیات کی کلید خود شناسی جیسی متعدد کتابیں تصنیف کیں اس موضوع سے انھیں خاص دلچسپی تھی وہ نفسیات پر ایک مخصوص کالم عرصہ تک لکھتے رہے:

ایسی شخصیتیں بہ مشکل ہی پیدا ہوتی ہیں۔ وہ ایک مخلص انسان تھا، حق گو انسان، نڈر و بے باک محب وطن اور مونس مظلومین بے زبان اور بے نفس، ایسا انسان ہم کہاں سے لائیں گے۔

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

٭٭

عظیم اختر

مولانا علیم اختر

صاحبو، آپ میں سے تو بیشتر حضرات نے جناب علیم اختر کو خالص مولویانہ وضع قطع میں دیکھا ہوگا، مشاعروں میں شاعرانہ ترنم سے کلام سناتے دیکھا ہوگا یا نجی محفلوں میں سگار یا پائپ پیتے ہوئے ان کی بذلہ سنجی کے مظاہرے دیکھے ہوں گے، لیکن جب میں تصور کی آنکھ سے اپنے گم گشتہ بچپن کو دیکھتا ہوں تو ایک اجڑے ہوئے زمیندار گھرانے کی چہار دیواری میں ان کی ایک دوسری شخصیت ابھرتی ہے جو یکسر مختلف ہے۔ بھرا بھرا جسم، خوب صورت آنکھیں، لمبا قد، چھتاری کٹ مونچھیں، سر پر ہیٹ، ہاتھ میں کیپسٹن کاٹن، گلے میں بو یا پھول اور جسم پر جدید طرز کا انگریزی لباس ـــ خوش پوشی کا یہ عالم کہ دن میں دو دو بار لباس تبدیل کرتے اور ہمہ وقت لاٹ صاحب بنے نظر آتے ـــ لیکن زمانے میں کس چیز کو ثبات حاصل ہے، ایک مردِ کامل کی ذرا سی نظر نے ان کی زندگی کا دھرا بدل دیا اور کایا پلٹ کر دی۔ ۱۹۴۴ء میں عزیز و اقارب سے ملنے کے لیے دیوبند گئے۔ میرے نانا حضرت مولانا حسین احمد مدنی رح کے مقربِ خاص تھے اور روزانہ شام کے وقت حضرت شیخ کی خدمت میں حاضری دیتے ـــ اباجی مرحوم کو روزے نماز اور مذہب سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ ایک نہایت ہی دیندار گھرانے اور قاضیوں کے خاندان سے ہونے کے باوجود علماء کرام کا مذاق اڑانے سے نہیں چوکتے، نہ جانے کیوں نانا مرحوم سے حضرت مدنی رح

سے ملنے کی خواہش کا اظہار کر بیٹھے۔ نانا مرحوم شام کو اپنے ہمراہ حضرت شیخ کی قیامگاہ پر لے گئے۔ ابھی قیام گاہ کے قریب پہنچے بھی نہ تھے کہ سامنے سے حضرت کا خادم آیا اور نانا مرحوم سے کہا ہے کہ آپ کے ساتھ جو بے داڑھی والے صاحب آرہے ہیں اُن کو داخلے کی اجازت نہیں ہے۔" اباجی مرحوم ایک لمحہ کے لئے رُکے، مُسکرائے اور خادم سے کہا کہ جاؤ حضرت جی سے کہہ دینا کہ اب ہم داڑھی رکھ کر ہی آپ کے پاس آئیں گے، اس وقت کوئی اور بہانا نہ بنائیے گا۔"

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی اس ذرا سی بات نے ان کی زندگی کی کایا پلٹ دی، انگریزی لباس یکسر اُتر گیا اور اب جسم پر شیروانی اور کرتا اور پاجامہ آگیا ــــ چند ماہ کے بعد جب وہ چہرے پر ایک خوب صورت سی داڑھی کے ساتھ حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے نہ صرف مسکرا کر استقبال کیا بلکہ بیعت کا شرف بھی بخشا ــــ خدا کے نیک، صالح اور برگزیدہ بندوں کی نگاہیں اس طرح دلوں کو مسخر کر کے زندگیوں میں انقلاب لاتی ہیں حضرت شیخ کی نگاہ خاص نے بھی ان کی زندگی کے صبح و شام کو یکسر بدل ڈالا، اب وہ ایک الٹرا ماڈرن ہندوستانی کی جگہ ایک نہایت ہی دیندار، متقی، صوم وصلوٰۃ کے پابند پرہیزگار انسان کے روپ میں نظر آتے ہیں مسٹر کی جگہ مولانا نام کا ایک لازم وملزوم جز بن جاتا ہے۔

مولانا نے محترم دسمبر ۱۹۱۴ء میں مظفر نگر کے ایک نہایت ہی دیندار علم دوست اور متوسط زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بعض نامساعد حالات کی بنا پر میرے دادا جناب محمد عمر صاحب مرحوم نے معلمی کا پیشہ اختیار کیا اور کم وبیش پچاس سال تک اسکولوں میں صدر مدرس کے فرائض انجام دیتے رہے ــــ اردو کے نامور شاعر احسان دانش مرحوم نے بھی ابتدائی تعلیم اُن ہی سے حاصل کی۔ والد مرحوم نے ابتدائی تعلیم دادا مرحوم کے زیرِ نگرانی حاصل کی اور ۱۹۲۶ء میں ایف۔ اے کا امتحان دے کر سرکاری نوکری کو ذریعۂ معاش بنایا۔ ۱۹۴۷ء تک سرکاری اور نیم سرکاری دفاتر میں کلیدی عہدوں پر فائز رہے ــــ تقسیم وطن کے وقت سرحد کے اس پار ایک بہت زیادہ بہتر ملازمت کے آفر کے باوجود اپنے شیخ کے ایماء پر ہندوستان میں رہنے کو ترجیح دی اور ۱۹۴۸ء میں ماہنامہ شمع میں ملازمت اختیار کرلی۔ ماہنامہ شمع کی موجودہ ترقی میں جہاں مالکان شمع کی قسمت کو بڑا دخل حاصل ہے، وہیں مولانا علیم اختر کی دیانتداری لگن، خلوص اور انتظامی

صلاحیتوں نے بھی بنیادی اور اہم رول ادا کیا ہے۔

ان کو شاعری کا شوق ورثہ میں ملا، ابتدا میں حضرت آلم مظفر نگری مرحوم سے استفادہ کیا اور پھر حضرت آلم کے ایما پر حضرت سیماب اکبر آبادی کو غزلیں دکھانے لگے ــــ حضرت آلم مظفر نگری اور حضرت سیماب کے تعلق سے مولانا علیم اختر داغ اسکول سے وابستہ نظر آتے ہیں لیکن سچ پوچھئے تو وہ درویش صفت و یگانہ روزگار اور قلندرانہ مزاج رکھنے والے شاعر حضرت حسرت موہانی مرحوم کی فقیرانہ زندگی اور رنگ کلام سے ذہنی طور پر بہت متاثر تھے۔ حسرت کی ذات اور شاعری سے والہانہ عقیدت تھی۔ اسی عقیدت کی وجہ سے حسرت کے رنگ سخن کو مشعل راہ سمجھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ہندوستان کا آئین بن رہا تھا اور حسرت موہانی اسمبلی کے ممبر ہونے کے ناطے دہلی میں قیام پذیر تھے ــــ مولانا اباجی مرحوم سے نہایت شفقت فرماتے، کبھی کبھی از خود ہمارے گھر تشریف لے آتے۔ شاید ٹاون ہال میں مشاعرہ تھا، جس کی صدارت برجموہن دتاتریہ کیفی مرحوم کر رہے تھے مولانا حسرت اور اباجی مرحوم بھی مشاعرے میں شریک تھے، چونکہ حسرت موہانی کو اور اباجی مرحوم کو ساڑھے دس بجے کہیں جانا تھا اس لیے دس بجے کے قریب ناظم مشاعرہ نے اعلان کیا کہ پہلے مولانا علیم اختر غزل سنائیں گے اور اس کے بعد حسرت موہانی کو زحمتِ کلام دی جائے گی۔ اباجی مرحوم نے غزل شروع کی اور مقطع تک ہی پہنچے تھے کہ مولانا حسرت موہانی بے تابانہ مائیک پر پہنچ گئے اور ان کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے کہا کہ "علیم اختر، تیری غزل کے نقوش لے کر اٹھا ہوں"۔

مولانا حسرت موہانی کی طرح اباجی مرحوم کو جگر مرادآبادی سے بھی نہایت عقیدت تھی جگر صاحب جب بھی تشریف لاتے، ایک شام ہمارے یہاں ضرور آتے ــــ حسرت اور جگر سے عقیدت اور قربِ خاص کے نتیجے میں مولانا کی شاعری میں دونوں بزرگوں کے رنگ سخن کی دھیمی دھیمی آنچ اور خوب صورت امتزاج ملتا ہے۔

مولانا کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ اُن کے مشرب میں منافقت اور دل آزاری کفر تھی۔ وہ جس سے ملتے خلوص اور نہایت محبت سے ملتے یہی وجہ تھی کہ ہمارے یہاں اُردو کے چھوٹے بڑے نامور شاعروں اور ادیبوں کی آئے دن آمد و رفت جاری رہتی۔

حضرات، میں اگر والدِ محترم کی شاعری کے بارے میں کچھ عرض کروں تو شاید اُسے

میری سعادت مندانہ عقیدت پر محمول کیا جائے گا۔ لیکن اس کے باوجود میں اس حقیقت کا اظہار کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ آج کے پُر آشوب دور میں جب جماعتی گروہ بندی اور تعلقات کی بیساکھیوں کے سہارے دنیائے ادب میں شہرت حاصل کرنا عام رواج بن گیا ہے، کسی بھی "ازم" کے تئیں وفاداری یا وابستگی کی بنیادوں پر ہر شاعر اور متشاعر کو معتبر فنکار تسلیم کیا جانے لگا ہے، سرکاری یا غیر سرکاری نوکریوں اور سماجی مرتبے کے پس منظر میں تخلیقات کی پذیرائی اور شاعری کی تعریف و توصیف ہی تنقید کا معیار بن گیا ہے، مولانا علیم اختر جماعتی گروہ بندی سے دور، خود تشہیری سے بے نیاز، زندگی کے آخری لمحوں تک انتہائی خلوص کے ساتھ اُردو شعر و ادب کی خاموش خدمت کرتے رہے۔ شمع جیسے کثیر الاشاعت ماہنامے میں کلیدی عہدے پر فائز رہتے ہوئے وہ اگر چاہتے تو انگنت معاشی و مادی فوائد حاصل کر سکتے تھے۔ دفتری حیثیت کا استعمال کرتے ہوئے وہ بھی اپنے بعض دیگر ہم عصر شعرا کی طرح اپنے شعری مجموعوں کا انبار لگا سکتے تھے، لیکن اُردو شاعری کا یہ گوشہ نشین مغنی ہر قسم کی ادبی سیاست اور جوڑ توڑ سے بے نیاز ایک عجب شانِ قلندری سے زندگی گذارتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۵۷ء میں پہلے مجموعۂ کلام "نکہتِ گل" کی اشاعت کے بعد ان کا کوئی دوسرا مجموعہ کلام منظر عام پر نہ آسکا۔ اس کی ایک وجہ اگر اُن کی کم گوئی تھی تو دوسری بنیادی اور اہم وجہ یہ بھی تھی کہ شاعری اُن کا نہ کبھی ذریعۂ معاش بنی اور نہ اسے انھوں نے حصولِ شہرت کا ذریعہ بنانا چاہا بلکہ شاعری اُن کے ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرتی تھی۔

وہ نہ صرف ایک صاحب طرز غزل گو شاعر تھے بلکہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ ان کی شاعری کی طرح ان کا کردار بھی بڑا متاثر کن تھا۔ وہ انسانیت کی اعلیٰ اور ارفع قدروں کے حامل نہایت ہی نیک سیرت، مشفق اور پاکباز انسان تھے۔ اس میکانکی دور میں جب کہ وضعداری پرانی معاشرتی اقدار اور ان کے نقوش مدھم پڑتے جا رہے ہیں، وہ اس پرانی تہذیب اور ان قدروں کی شمع روشن کیے رہے۔ انھوں نے زندگی کے تقاضوں، ان کی ذمہ داریوں پر بھی شاعرانہ لاابالی پن کو غالب نہیں آنے دیا، یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں سنجیدگی ہے، احساسات کی پاکیزگی ہے، جذبے کی توانائی اور خیالات کی پختگی ہے۔ ذرا اندازہ لگایئے

خانگی اور دفتری ذمہ داریوں کا اس قدر شدید احساس کہ ناسازیٔ طبع کے باوجود ۲ اپریل ۶۲ء
کو حسب معمول دفتر تشریف لے گئے۔ دفتر پہنچکر سینے میں درد محسوس ہوا اور چٹ پٹ میں
اللہ کو پیارے ہو گئے۔

انھوں نے ایسے اشعار کہے ہیں جن کو اُردو ادب میں اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً :

سنّاٹے سے ابھر تو رہی ہے کوئی صدا
یہ اور بات ہے کہ سنو تو سُنا نہ جائے

تھی جس میں ترکِ رسم تعلق کی التجا
اے جانِ احتیاط وہ خط مل گیا مجھے

اللہ رے یہ کیفیتِ احتیاطِ عشق
خط میں بھی حرفِ شوق لکھو تو لکھا نہ جائے

یہ جو رہ رہ کے مجھے خون کی بو آتی ہے
کہیں تم میں کوئی قاتل تو نہیں ہے یارو

چھین لو مجھ سے مرے شوق کی تپتی ہوئی دھوپ
یاد کا سایۂ دیوار مجھے دے جاؤ

خود فریبی کا بُرا ہو کہ خود اپنی تحریر
ایسے لگتا ہے کہ یہ خط مرے نام آیا ہے

میں نے ایک نامۂ پُر شوق جو لکھا تھا کبھی
لکھ کے اس خط پہ میرا نام مجھے لوٹا دو

چاندنی رات کی ناگن سے نہ ڈسواؤ مجھے
میری قسمت کی یہ شام مجھے لوٹا دو

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

مولانا محمد حسین آزاد

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد، آپ کہیں گے بھلا انہیں کون نہیں جانتا، ہمارے ادب کی کوئی تنقید اور ہماری زبان کی کوئی تاریخ مشکل ہی سے ایسی ہوگی جو مولانا کے ذکر خیر سے خالی ہو۔ دلی والے تھے مولوی محمد باقر کے بیٹے اور میاں ذوق کے چہیتے شاگرد قدیم دلی کالج میں مولوی نذیر احمد اور مولوی ذکاءاللہ کے ہم سبق رہے، اور جب لاہور پہنچے تو گورنمنٹ کالج کے عربی پروفیسر اور انجمن پنجاب کے ادبی سیکرٹری بنے عجیب و غریب ذہن پایا تھا جو ادب و علم کی جدید روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔

دہلی کے محاورہ اور ادبی زبان کو جن تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ انھوں نے برتا وہ کچھ انہیں کا حصہ ہے اسی لیے تو مہدی افادی نے انہیں اُردوئے معلّٰی کا ہیرو کہا ہے جسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ غدر سنہ ۵۷ سے قریب قریب ایک ربع صدی پہلے کشمیری دروازے کے قریب گذر اعتقاد میں ان کی پیدائش ہوئی یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی علم و فن کا بڑا مرکز تھا اور ایسے اہل کمال جمع ہوگئے تھے جنہیں دیکھ کر عہد اکبری و شاہجہانی کے جلسے یاد آتے تھے ان کے والد مولوی محمد باقر اور دادا مولوی محمد اکبر انہیں اہل کمال میں سے تھے جن کے مذہبی کتب خانے کی بڑی شہرت تھی۔

مولوی محمد باقر میاں ذوق کے جگری دوست اور بچپن کے ساتھی تھے اور ساری عمر یہ دوستی

اس طرح تھی جیسے دو آنکھیں ایک ساتھ دیکھتی اور دو کان ایک ساتھ سنتے ہیں. مولینا کہتے تھے کیسا مبارک زمانہ ہوگا جب شیخ مرحوم (میاں ذوق) اور میرے والد مغفور ہم عمر ہوں گے تحصیل علمی ان کی عمر کی طرح حالت طفولیت میں ہوگی صرف ونحو کی کتابیں ہاتھوں میں اور ایک اُستاد کے دامن شفقت میں تعلیم پاتے ہوں گے۔

اسی پس منظر میں ہم مولینا کے عالم طفولیت اور ابتدائی تعلیم کے ماحول کا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔

دہلی کالج اس وقت محض ایک عام تعلیمی ادارہ ہی نہ تھا نئے تعلیمی تقاضوں اور نئے تہذیبی انداز نظر ایک نشان منزل تھا استادوں پر نظر ڈالیے تو مولوی رشید الدین خاں مولوی مملوک العلی اور ماسٹر رامچندر جیسے قابل ملیں گے اور طلبا کی طرف دیکھئے تو مولوی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد منشی دھرم نرائن ماسٹر بھیروں پرشاد اور ماسٹر پیارے لال آشوب جیسے ذہین لوگوں سے ملاقات ہوگی۔

مولوی کریم الدین اور منشی فیض پارسا کے قایم کردہ تاریخی مشاعرے یہیں ہوتے تھے، غالب و مومن کو یہیں تو فارسی کا پروفیسر بنانے کی کوشش کی گئی جس جگہ پر بالآخر مولوی امام بخش جیسے فارسی کے استاد کا تقرر ہوا مولینا کا ذہن اسی دہلی کالج کی علمی اور ادبی فضا میں بنا اور جب لاہور پہنچے تو گویا دلّی کالج اور دلّی کی حدیں لاہور تک وسیع ہوگئیں۔

اس صدی کی پہلی دہائی ختم ہورہی تھی کہ مولینا ہم سے رخصت ہوگئے۔ مگر آج ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے اور ان کے مابین ایک صدی کا تین چوتھائی حصہ پلک جھپکنے کی فرصت سے زیادہ نہیں وقت کی یہ دراڑ پردۂ سیمیں کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ جیسے ہی لبوں پر ان کا نام آتا ہے ان کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔

روشن چہرہ کشادہ پیشانی اس پر پیچ دار پگڑی نیم خمیدہ ابرو چمکدار آنکھیں، جن سے ذہانت ٹپکی پڑتی ہے ستواں ناک کھلتا ہوا رنگ، مسکراتے ہوئے لب، آفتابی چہرہ اس پر گول ڈاڑھی کچھ کچھ گھنگھریالے بال، کشیدہ گردن، چوڑا چکلا سینہ بھرے بھرے بازو نکلتا ہوا سا قد کلا بتونی ڈوریوں سے آراستہ شمس العلمائی جبہ —— قدیم رئیسانہ وضع کی خوب صورت کرسی، عالمانہ انداز نشست قریب ہی میں آبنوسی رنگ کی گول میز قدموں میں ایرانی طرز کا قالین۔

کہنے کو تصویر ہے مگر پڑی منہ سے بولتی ہے گویا ہوبہو شمس العلما مولینا محمد حسین آزاد بیٹھے ہیں

باتیں کرتے ہیں تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں کوئی علمی موضوع ہو ادبی مسئلہ ہو بات ہیں سے بات اور نکتہ میں سے نکتہ پیدا کرنا کوئی ان سے سیکھے ہنسوڑ نہ سہی مگر بہت دیر سنجیدہ بھی نہیں رہ سکتے کوئی شگفتہ چٹکلہ کوئی دلچسپ حکایت کوئی خوب صورت فقرہ اور خوب صورت لطیفہ بے اختیار زبان پر آجاتا ہے۔

اپنے اُستاد میاں ذوقؔ سے والہانہ عقیدت تھی، اُستاد مرحوم اور شیخ علیہ الرحمۃ کہہ کر انہیں یاد کرتے تھے، بیس برس تک شرف حضوری حاصل رہا، چاہتے یہ تھے کہ کوئی حرف اس گراں بہا داستان کا نہ چھوٹے، استاد کی زندگی میں شعر نہ کہتے تھے مگر بقول منشی دھرم نرائن استاد کے سینکڑوں شعر یاد تھے۔ سنی سنائی باتوں کو بھی ایسے بیان کرتے تھے جیسے آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہے ہوں، طبیعت میں شوخی بلا کی تھی آداب شاگردانہ کے باوجود استاد سے بھی گاہ گاہ کوئی آزادانہ لطیفہ ہو جاتا تھا۔

میاں ذوقؔ کے مرض الموت اور ان سے آخری ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"قریب شام میں بھی موجود تھا ...... انھوں نے کھسک کر آگے بڑھنا چاہا طاقت نے یاری نہ دی تو کہا آہ ناتوانی خلیفہ صاحب نے فرمایا شاعروں ہی کا سا ضعف ہوگا حافظ ویران بھی بیٹھے تھے وہ بولے کہ آپ نے بھی ضعف کے بڑے بڑے مضمون باندھے ہیں مسکرا کر فرمایا اب تو کچھ اس سے بھی زیادہ ہے میں نے کہا سبحان اللہ اس عالم میں بھی مبالغہ قایم ہے خدا اسی مبالغہ کے ساتھ صحت دے۔"

آب حیات تو ادبی لطائف اور دل آویز چٹکلوں کا ایک نہایت حسین انمول مرقع ہے مختلف زمانے کے شعر اور ان کے ادبی ماحول کے جو مرقعے مولٰنا نے پیش کیے ان کا جھوٹ بھی سچ معلوم ہوتا ہے مولٰنا چٹکی لینے کے تو خیر عادی تھے موقع موقع سے ان کے قلم کی شوخی اور ان کے مزاج کی شگفتگی مزہ دے جاتی ہے اس پر اُن کی زندگی میں اور ان کے بعد بہت کچھ کہا اور لکھا گیا مگر اب اس کا کیا کیا جائے کہ مولٰنا جہاں الفاظ کے طوطا مینا اڑاتے ہیں وہ بات بھی وحی معلوم ہوتی ہے یہ تو گفتگو کا طریقہ اور بات کرنے کا سلیقہ ہے جو سب کو نہیں آتا۔

مومن کا ذکر آب حیات کے پہلے ایڈیشن میں نہ تھا مولٰنا نے یہ عذر بھی پیش کیا کہ حالات

نہ مل سکے۔ مگر بات کچھ اور ہی تھی جسے نہ کہہ کر بھی مولینا شاید کہہ گئے کہ وہ مومن کے کچھ زیادہ قائل نہ تھے۔ کیوں؟ اب یہ تو وہی جانتے ہیں..... دور پنجم جس سے ان کا تعلق ہے بلکہ دور سوم و چہارم کو بھی اہل نظر دیکھیں کہ جو اہل کمال اس میں بیٹھے ہیں کس لباس وسامان کے ساتھ ہیں کسی مجلس میں بیٹھا ہوا انسان تبھی زیب دیتا ہے کہ اُسی سامان وشان اور وضع ولباس کے ساتھ ہو جو اہل محفل کے لئے حاصل ہے نہ ہو تو ناموزوں معلوم ہوتا ہے۔ خاں موصوف کے کمال سے مجھے انکار نہیں اپنے وطن کے اہل کمال کا شمار بڑھا کر اور ان کے کمالات دکھا کر ضرور چہرہ فخر کا رنگ چمکاتا........

یہ کہہ کر مولینا بات وہاں لے آئے جہاں حالات کی نایابی کا شکوہ باقی رہتا ہے اور بس میں تو انہیں سے الفاظ مستعار لے کر یہ کہوں گا کہ مضمون کو کم و بیش اور الفاظ کو پس و پیش کر کے کچھ ایسا رکھ دیا ہے کہ جو حق استاد؟ کا ہے ادا ہو گیا ہے۔

ان کا خاندان ایرانی النسل تھا اور ہمدان سے آکر کشمیر جنت نظیر میں بس گیا تھا وہاں سے دلّی آیا اور ہندوستان کے دل میں سما گیا اور اس کی گنگا جمنی تہذیب کا ایک بے مثال مرقع نظر کے سامنا آیا۔

مولوی محمد باقر نے دہلی اُردو اخبار نکالا جو اُردو ہندوستانی صحافت کا پہلا عہد نامہ تھا۔ ان کے اُستاد میاں ذوق دہلی کی گلیاں چھوڑ کر دکن نہیں گئے جہاں بڑی قدر سخن تھی تو خود دلّی کو کیوں چھوڑتے وہ نوراج گھاٹ سے لے کر جامع مسجد کی سیڑھیوں تک دِلّی کی اک اک نشانی سے اپنے استاد ہی کی طرح محبت کرتے تھے لیکن وہ وقت بھی آیا جب دِلّی کالے اور گورے لشکروں کے ہاتھوں ایک بار پھر آباد ہونے کے لیے اُجڑنے لگی، اپنے گھر سے نکلنے اور دلّی چھوڑنے کی کیسی دردانگیز تصویر پیش کی ہے۔

"میرا یہ حال ہوا کہ فتحیاب لشکر کے بہادر دفعتاً گھر میں گھس آئے اور بندوقیں دکھائیں کہ جلد یہاں سے نکلو دُنیا آنکھوں میں اندھیر تھی بھرا ہوا گھر سامنے تھا اور میں حیران کھڑا تھا کہ کیا کچھ اُٹھا کے لے چلوں۔ اُستاد کی غزلوں کے جنگ پر نظر پڑی یہی خیال آیا کہ محمد حسین اگر خدا نے کرم کیا اور زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائے گا مگر استاد کہاں سے پیدا ہوں گے جو یہ غزلیں پھر آکر کہیں گے۔ اب اُن کے نام کی زندگی ہے یہ ہیں تو وہ

مر کر بھی زندہ ہیں یہ نہیں تو نام بھی نہ رہیگا۔ وہی جنگ اُٹھا بغل میں مارا سجے سجائے گھر کو چھوڑ کر ۲۲ نیم جانوں کو ساتھ لے گھر سے بلکہ شہر سے نکلا ساتھ ہی زبان سے نکلا کہ حضرت آدم بہشت سے نکلے تھے دِلّی بھی ایک بہشت ہے انہیں کا پوتا ہوں دلی سے کیوں نہ نکلوں۔ (آب حیات ۴۸۲)

نہ جانے دِلّی سے نکل کر کہاں کہاں گئے، کس کس در کی خاک چھانی بالآخر لاہور پہنچے اور وہیں جاکر قسمت کے دن پھرے۔

گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر بنے انجمن پنجاب کے جدید طرز کے مشاعرے قایم کیے اُردو کے نئے ادبی ذہن اور زبان کی نئی ترقی کا خاکہ مرتب کیا، اور اُردو ادب کو خیال کی باریکیوں اور تاریکیوں سے نکالنے کی سعی کی۔ نئے طرز کی ادبی و تہذیبی قدروں کی شناخت کے پیمانے وضع کیے۔ "نیرنگ خیال" لکھ کر مغرب کے طرز تمثیل نگاری کو مشرقی روایت کے آب و رنگ سے آشنا کیا، دریاے زندگی کی سیر کرائی شہرت عام و بقائے دوام کا دربار سجایا۔ بچوں کے لیے ریڈریں ترتیب دیں اور ان میں معصوم بچوں کی بولی بولنے اور ان کے ذہن سے سوچنے سمجھنے میں اتنی کاوش کی کہ بوڑھے ہو گئے اسی اثنا میں حکومت کے ایما پر ایران کا سفر کیا اور نگارستان فارس جیسا ادبی و لسانی مرقع ترتیب دیا جس کے شبلی بھی فکرمند تھے آب حیات اُردو شاعری کی بے مثال تاریخ ہے ان کے قلم اعجاز رقم نے اُردو شاعروں کی پژمردہ روحوں پر آب حیات چھڑکا۔ جس کا ذکر جس انداز سے آزاد کی زبانِ قلم پر آگیا اسے حیات جاوداں مل گئی اب دربار اکبری کی کشش نے دامن دل کو بے اختیار اپنی طرف کھینچنا چاہا تو انہیں اپنے استاد مرحوم کے دیوان کی یاد آئی جن کا دیوان ہنوز غیر مرتب پڑا تھا۔

عمر کے پچپن برس سے گذرے تھے رجسٹرار یونی ورسٹی نے کاغذات پنشن مرتب کیے تو ان کے اختلال ذہنی کی طرف بھی اشارہ کیا اسی شیریں دیوانگی کے عالم میں انھوں نے والہانہ انداز سے اپنے مرحوم اُستاد کا دیوان مرتب کیا جو ان کے زمانے کی دہلی کی ادبی زندگی کی ایک تاریخی دستاویز ہے اسے انہیں کی زبان سے سنیئے:

" یہ علم معنی کی روحیں ہیں کہ الفاظ کی دُنیا میں اتری تھیں ذوق و شوق کے وعدے

تھے کہ دلوں کو آگاہ کریں گے استاد مرحوم یہ حسرت ساتھ لے گئے والد میرے شہید آرزو ہوئے اب خطرہ ہے کہ امانت رہے اور آزاد کو مسافرخانہ سے کوچ کا حکم آجائے۔"

مولینا آزاد کو معلوم نہیں کیوں یہ احساس ہو چلا تھا کہ اب ان کے اُستاد مرحوم کے کلام میں موجود، قدیم محاورہ کولونی لگنا شروع ہوگئی ہے اس لیے انھوں نے اپنی ترتیب محاورۂ ذوق کو جگہ جگہ بدل دیا اور اپنی طرف سے بھی بظاہر بہت شعر کہہ کر داخل کر دیے۔

یہ سب کچھ تو ہوا مگر مولینا کو اس کا احساس ضرور تھا کہ بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے اسی لیے بطور دفع دخل مقدر یہ لکھا اور بڑی خوبصورتی سے اپنا دامن بچا گئے۔

"ان کے کلام کی ترتیب آسان کام نہیں صدہا شعر ہیں کہ لوگوں کے پاس کچھ لکھے تھے دیوان مروجہ میں کچھ چھپے اور اُن کی زبان سے کبھی کچھ سنے کبھی کچھ سنے۔ پھٹے پرانے مسودے لڑکپن سے بڑھاپے تک کی یادگار ہیں والد مرحوم کے ہاتھ کی بہت تحریریں بہت کچھ مری قسمت کے نوشتے ہیں کہ حاضر و غائب لکھتا اور جمع کرتا تھا کٹے پھٹے اشعار کا پڑھنا مٹے حرفوں کا اُجالنا اس زمانے کے خیالات کو سمیٹنا، کا تصور باندھنا بھولے بسرے الفاظ و مطالب کو سوچ سوچ کر نکالنا میرا کام نہ تھا خدا کی مدد اور پاک روحوں کی برکت شامل تھی میں حاضر اور خدا ناظر تھا راتیں صبح ہو گئیں دن اندھیرے ہو گئے جب یہ مہم سرانجام ہوئی۔"

یہ تو دیوان ذوق کے ساتھ شغف کا عالم تھا دربار اکبری کے ذوق و شوق کا ذکر سنئے۔

"پرسوں اتوار کو یہاں ایک بڑا جلسہ تھا وہاں کوئی بولا آزاد کہاں ہے اس سے پوچھو وہیں کسی نے کہا۔ اس نے کھیلوں کو بالکل استعفیٰ دیدیا ہے وہ اب تو تصانیف میں غرق رہتا ہے کسی نے یہ بھی کہا کہ آج کل وہ دربار اکبری لکھ رہا ہے مگر اکیلا ہے کوئی رفیق و مددگار نہیں۔ کئی شخصوں نے کہا پھر وہ کس طرح کی مدد چاہتا ہے جو ہم سے ہو سکتی ہے ہم بھی کریں میں درماندۂ تائید و تدبیر کیا کیوں کہ میرا کام سوائے خدا و مولا کے مددپذیر ہیں یا علی مدد چار بجے ہیں صبح قریب ہے۔"

اب یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ دیوانِ ذوق کے سامنے آنے کے بعد بہت لے دے ہوئی، اور کیوں ہوئی۔ آبِ حیات کے بعض نگارشوں اور فروگذاشتوں پر یہی ہوا تھا اور رہونا ہوگا ظفر کے

کے سارے کلام کو بقول شخصے اپنے استاد کی جھولی میں ڈال دیا، چٹکلے چھوڑے فقرے تراشے، کہیں کہیں پھبتی کستے۔ الفاظ کے طوطا مینا اُڑانے بات میں سے بات اور نکتہ میں سے نکتہ پیدا کرنے میں مولانا کو جو کمال حاصل ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔

ایک بار پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کی محفل میں آزاد پر قاضی عبدالودود کے اعتراضات کا ذکر آیا کہنے لگے ٹھیک ہے آپ ایک سو قاضی عبدالودود اور پیدا کریں بات آزاد ہی کی صحیح سمجھی جائے گی۔ کوئی کچھ بھی کہے آزاد کا سا دلنشیں انداز بیاں کہاں سے لائے گا جس کا جھوٹ بھی سچ معلوم ہوتا ہے اور سب کچھ جھوٹ بھی تو نہیں اب یہ بھی ثابت ہو چکا ہے۔

اب یہ کون کہے کہ آزاد کی وہ کون سی ذہنی محنت اور حادثہ حیات تھا جس نے انہیں توازن ذہنی سے محروم کر دیا اور رفتہ رفتہ ان پر عالم دیوانگی طاری ہو گیا اس عالم میں بھی گل افشانی گفتار قائم تھی ناصر نذیر فراق نے جو آزاد کے شاگرد اور حد بھر عقیدت مند تھے ان کے عالم دیوانگی کا یہ الم انگیز مرقع پیش کیا ہے۔

"ایک میلی سی اچکن گلے میں تھی جس کی چولی میں بٹن بھی پورے نہ تھے ایسا ہی میلا کچیلا ڈبل زین کا پاجامہ سر پر مغلئی مرقع کی چکٹ ٹوپی اور پاؤں میں بہت ہی بوسیدہ سی جوتی ــــ ایک بوریئے پر بیٹھے تھے ایک مٹی کی رکابی میں شوربا تھا اور ایک چنگیر میں چپاتیاں نوالا شوربے میں ڈبوتے منہ میں رکھ کر دیر تک چباتے اور مشکل سے نگلتے اِدھر اُدھر راکھ کے کچھ ڈھیر پڑے تھے اور اس کوڑے کے درمیان اُستاد مرحوم امام باڑے کے برآمدے میں بیٹھے تھے۔"

اِسی عالم میں بالآخر ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو اُردو کا یہ بے مثال ادیب نامور مورخ، عظیم نقاد، انداز گل افشانیٔ گفتار کا عدیم النظر نمونہ اس جہان گذراں کو عالم ہوش و بیہوشی کو چشم عبرت سے دیکھتا ہوا ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا ــــ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

ہم سب اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف جانے والے ہیں

ﷺ

صالحہ عابد حسین

ڈاکٹر مختار احمدؐ انصاری

جیسے پہلی نظر میں دور سے سرمئی پہاڑوں کی چوٹیوں کو دیکھ کر آدمی حیران ہو جائے ، جیسے نشانت سمندر کو پہلی بار دیکھے اور رعب و حسن سے گنگ ہو جائے ۔ ایسا ہی تاثر پہلی بار ڈاکٹر انصاری کو دیکھ کر ہوا تھا بڑی بڑی بے حد ذہین آنکھیں جن پر بہت موٹی گھنی جھکی بھویں جن میں سیاہی سے زیادہ سفیدی اسی سے بھی گھنی اور موٹی مونچھیں جو ہونٹوں پر چھجے کی طرح چھائی محسوس تی تھیں بچپن میں ان سے ڈر سا لگا رہتا تھا مگر جوانی میں ، جب علاج کے سلسلے میں ان سے بار بار ملاقات ہوئی تو اس شخص کی غیر معمولی شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کی غیر معمولی صورت کا بھی دل پر گہرا اثر پڑا ۔ آواز میں رعب ، صورت میں رعب ، انداز میں خوش مزاجی اور مونچھوں سے ڈھکے ہونٹوں کی مسکراہٹ کی دل نشینی اور پُر ظرافت فقرے ...... یا اللہ کتنی بڑی ہستی ہیں یہ ؟

ہاں یہ تھے مختار احمد انصاری جنھیں ساری دُنیا صرف ڈاکٹر انصاری کے نام سے پہچانتی تھی اب بھی بہت سے لوگ باقی ہیں جو اسی نام سے آشنا ہیں ۔

ڈاکٹر انصاری کا سلسلہ نسب ۔ میرے بزرگوں کی طرح ــــ حضرت ابو ایوبؓ انصاری سے ملتا تھا ــــ جن کا نام ہر مسلمان جانتا ہے ۔ آنحضرتؐ کے جاں نثار صحابی ، مدینے میں ان کے پہلے میزبان ، بڑے بہادر ، رسولؐ کے ساتھ جہاد میں پیش پیش ــــــــ

کسی جنگ میں جنرل کی حیثیت سے ترکی گئے اور وہاں شہید ہوئے اور قسطنطینہ میں ان کا مزار مبارک بنا۔
ابو ایوب انصاری کی نسل کے چند لوگ سات سو سال پہلے ہندوستان آئے۔ ان میں سے ایک شاخ
پانی پت میں بس گئی جس کی نسل سے حالی جیسا قوم کا خادم اور طبیب پیدا ہوا اور دوسری شاخ
سے ڈاکٹر انصاری جیسا بے مثل ڈاکٹر، خادمِ قوم، آزادی کا مجاہد اور انسان دوست شخصیت نے
جنم لیا۔

مختار احمد انصاری ۲۵ دسمبر ۱۸۸۰ء کو یوسف پور میں پیدا ہوئے جو ان کے بزرگوں نے
بسائی تھی۔ اس وقت ان کے والد حاجی عبدالرحمٰن اور والدہ شمس انسا رکیا جانتی تھیں کہ یہ بچہ بڑا
ہو کر نہ صرف ان کا، ان کی بستی کا بلکہ پورے خاندان کا، پورے ہندوستان کا نام دنیا میں روشن کریگا!

دستور کے مطابق پہلے مکتب میں بٹھایا گیا۔ پھر مڈل اسکول یوسف پور سے مڈل کر کے غازی پور
کے اسکول میں داخل ہوئے اور وہاں سے میٹرک پاس کیا۔ ایم۔ سی۔ کالج الٰہ آباد سے ایف۔ ایس
سی کیا اور ہر جگہ فرسٹ کلاس آئے اور وظیفے ملتے رہے ان کی قابلیت اور ذہانت دیکھتے ہوئے
ریاست حیدر آباد نے لندن جا کر ڈاکٹری کی تعلیم کے لیے وظیفہ دیا۔ ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۸ء تک وہاں
انھوں نے اڈنبرا یونیورسٹی میں پڑھا اور میڈیسن اور ماسٹر آف سرجری کی ڈگری لی۔ ان کی قابلیت،
ذہانت اور صلاحیتوں کے ان کے انگریز استاد تک بہت قائل تھے اور اسی بنا پر ان کو چیرنگ
کراس ہاسپٹل میں ہاؤس سرجن اور رجسٹرار مقرر کیا گیا۔ انگریزوں کو یہ بات بہت ناگوار گزری کہ ایک
غلام ملک کا (اور وہ بھی ان کا غلام ملک) ایک فرد کسی انگلش اسپتال میں اسی عہدے پر
فائز ہو۔ مگر اس قوم کی خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ اس میں حق پرست اور حق گو لوگ بھی رہے ہیں۔
اعتراضوں کا جواب یہ دیا گیا کہ وہ دن ہمارے اسپتالوں کے لیے سخت بدنصیبی کا ہوگا جب ڈاکٹروں
کا انتخاب بجائے قابلیت کے قوم یا نسل کی بنا پر کیا جائے گا اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے
کہ ڈاکٹر انصاری میں کتنی غیر معمولی طبی قابلیت ہوگی کہ اسی نوجوانی ہی میں انھوں نے ایسی سخت گیر
قوم سے خراجِ تحسین وصول کر لیا۔

دو برس وہاں کام کرنے کے بعد ہندوستان واپس آ کر انھوں نے دہلی میں اپنا مطب قائم کیا
اور اس وقت سے وفات تک وہ دہلی میں رہے اور دِلی والوں کی خدمت کرتے رہے۔

ڈاکٹر انصاری ایک شش جہت شخصیت کے مالک تھے۔ اس مختصر سے مضمون میں ان کی شخصیت کے کسی پہلو پر بھی اس تفصیل سے روشنی نہیں ڈالی جا سکتی۔ ہاں چند جملوں میں اس کی طرف اشارے کیے جا سکتے ہیں۔ اس شخصیت کے ہیرے کی چھوٹ جس سمت پڑی اسے تابناک اور روشن کر گئی!

۱۔ وہ ایک بہترین طبیب یا ڈاکٹر تھے اور خدا نے ان کے ہاتھ میں ایسی شفا دی تھی کہ تقریباً ہر مریض ان کے علاج سے شفایاب ہو جاتا تھا۔

۲۔ وہ ایک سچے مسلمان تھے جن کے دل میں صرف اپنے ملک ہی کے نہیں ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے محبت اور درد تھا۔

۳۔ وہ ایک سچے اور پکے ہندوستانی تھے۔ نیشلسٹ مسلم جو اپنے ملک اور قوم کا خادم، خیر خواہ، ہندو مسلم اتحاد کا دل و جان سے حامی اور اسی کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے ہر وقت موجود۔

۴۔ وہ آزادی کے مجاہد بھی تھے۔ اور آزادی کی جدوجہد میں درمے، قدمے سخنے مدد کرتے۔

۵۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سرپرست، مددگار، بزرگ دوست اور اس کی سوکھی رگوں میں تازہ خون دوڑانے والے ایک ایسے فرد تھے جو ہر جامعہ والے کو، ڈاکٹر ذاکر حسین سے لے کر ننھے بچے تک کو چاہتے تھے اور جامعہ کا ہر فرد دل و جان سے انھیں اپنا سمجھتا اور چاہتا تھا۔ وہ مسیح کی پیدائش کے دن پیدا ہوئے تھے اور اپنی ہر حیثیت سے مسیح کے پیرو تھے جس کام، جس چیز کو ہاتھ میں لیتے اُسے نئی زندگی بخش دیتے تھے!

۶۔ اور پھر وہ ایک بڑے انسان تھے۔ ایسے انسان جو نہایت خاموشی سے، نہایت خلوص سے ہر دکھی، بیمار، غریب کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے اور اس طرح کہ جیسے وہ اس کی مدد نہ کر رہے ہیں بلکہ فریق مقابل ان پر احسان کر رہا ہوں! تو اس شش جہت ہیرے کی سی ہستی کے بارے میں کیا کہوں اور کیا نہ کہوں؟

جہاں تک طبی صلاحیتوں کا تعلق ہے کچھ تو ورثے میں ملی تھیں۔ حکیموں کے خاندان سے تعلق حکیم نابینا جیسے حاذق طبیب کے بھائی، حکیم اجمل خاں کے دوست اور ساتھی عقیدتمند۔ اور پھر قدرت نے خود انھیں جو بے نظیر صلاحیت بخشی اس سے کام لے کر انھوں نے امیر، غریب، عورت، مرد، بچہ جوان کس کس کے کیسے کیسے علاج نہ کیے اور کیسے مریض موت کے منہ سے نکل کر

اس خدا کے آتارے مسیحی النفس کے ہاتھ سے شفایاب نہ ہوئے۔ کیوں کہ جیسے جسم ہی نہیں روح کا بھی علاج ہو جاتا۔ اور اس ضمن میں ضرورت مندوں، غریبوں، عزیزوں اور دوستوں کا نہ صرف بے پیسے کے علاج کرنا بلکہ ضرورت مندوں کی الٹی مدد کرنا۔ ان کی وہ خصوصیت تھی جو شاذونادر ڈاکٹروں میں پائی جاتی ہے اور اس دور میں تو اس کا نام لینا بھی شاید کوئی نہ جانتا ہو جو کچھ اور نہ ہوتے صرف ڈاکٹر ہی ہوتے تو دلّی والے کبھی ان کے احسانوں سے سر نہ اٹھا سکتے۔ چند سال میں وہ دلّی کے معالجوں کے بادشاہ بن چکے تھے۔ وہ کسی مریض کو پون گھنٹے سے کم نہ دیکھتے۔ جس کو جس معائنہ کی ضرورت ہوتی ان کے حکم سے دلّی کے ڈاکٹر بغیر کسی فیس کے کرا دیتے وہ کئی بڑے بڑے رئیسوں کے معالج بھی تھے ان سے بھرپور فیس لیتے اور ان کا زیادہ حصہ غریبوں پر صرف کر دیتے ان کے اخراجات بہت تھے۔ دل فیاض، ہاتھ کھلا ہوا مگر آمدنی میں وہ برکت کہ قومی کاموں میں، سیاسی مہمان داری میں، ملک اور قوم کی فلاح کے لیے ہزاروں خرچ کرتے۔ یہ کہاں سے آتے تھے؟ گھر میں آمدنی اور خرچ کو بیگم صاحب جو بہت سلیقہ مند، عقل مند اور منتظم بیوی تھیں صرف وہی جانتی تھیں یا ان کے بھائی غالب جو ڈاکٹر صاحب کے منیجر بھی تھے۔ مگر یہ صرف ان دونوں کا دل جانتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی بے پناہ فیاضی اور اخراجات کی خاطر گھر کا خرچ کیسے چلتا تھا۔

آزادی کی تحریک میں انھوں نے قید و بند کی مصیبتیں بھی جھیلیں۔ کانگریس کے جنرل سیکریٹری اور ۱۹۲۷ء میں صدر بنے ان کے گھر کے اور دل کے دروازے ہر آزادی کے مجاہد اور سپاہی کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے تھے اور سچ مچ ان کا گھر ایک مہمان خانہ تھا بلکہ خانۂ بے تکلف!

ان کے قومی، ملی، سیاسی کاموں کے علاوہ ان کا ایک محبوب کام، کام نہیں دل کی مسرت اور خوشی کا ذریعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ تھا جس کے وہ یوں تو پہلے سے بھی ہمدرد مددگار تھے مگر حکیم اجمل خاں کے انتقال کے بعد جب وہ امیر جامعہ بنے ـــــ اور یہ وہ زمانہ تھا جب میں جامعہ آچکی تھی۔ تو سارا جامعہ ان کا محبوب خاندان بن چکا تھا۔ جامعہ کے کارکن خادم گویا ان کے سگے بھائی اور بیٹے تھے اور جامعہ کے بچے ان کے بچے جن سے ملنے آنا، ان میں ہنس بول کر خوش ہونا، ان کا علاج کرنا، روح اور دل جسم سب کو شفا پہنچانا ان کا دل پسند مشغلہ تھا۔ اور جامعہ کے کڑے وقتوں میں ـــــ اسی کی مالی مدد کرنا، دوسروں سے کرانا، چندے فراہم

کرنا بھی ان کے فرائض میں ایک تھا! ۱۹۳۶ء میں جب او کھلے میں جامعہ ملیہ کی عمارت کی بنیاد پڑی تو ایک زمین کا ٹکڑا ڈاکٹر انصاری نے اپنے گھر کے لیے پسند کیا کہ میں اپنا گھر بنا کر یہاں جامعہ کے بچوں میں رہوں گا!

اگر ڈاکٹر انصاری زندہ رہتے تو وہ کیا کچھ کرتے یہ صرف قیاس کیا جا سکتا ہے لیکن قوم کا خادم انسانیت کا پجاری، آزادی کا مجاہد اور خادم، جامعہ کا باپ، دلی کا بے تاج کا بادشاہ مرتے مریضوں کو شفا دینے والا، ایک دن۔ ۱۰ رمئی ۱۹۳۶ء کے منحوس دن سوری سے دلی آتے ہوئے ٹرین میں خدا کو پیارا ہوگیا ــــ وہ ان ہستیوں میں سے تھے جن کے لیے سچے دل سے کہا جا سکتا ہے کہ سینکڑوں سال کی گردش میں ایسا انسان پیدا ہوتا ہے!

وہ زمین جو انھوں نے اپنا گھر بنانے کے لیے پسند کی تھی وہاں اب ان کی آخری آرام گاہ ہے جس کے چاروں طرف ان کی محبوب جامعہ کی عمارت پھیلی ہوئی ہے!

دِلّی والے تو بہت ہوئے اور ہیں مگر ان میں کہیں ڈاکٹر انصاری بھی ملے گا؟

"خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را" یہی وہ روشنی کے مینار ہیں جن سے نئی نسل اس گھپ اندھیرے میں روشنی حاصل کر سکتی ہے۔

؎و

نورجہاں ثروت

مرزا محمود بیگ

دہلی کی قدیمی روایات کی پاسداری کم ہی لوگوں کے حصے میں آسکی۔ دہلی جس نے ہزاروں آشوب جھیلے، جس کی مٹی میں وضعداری اور ہوا میں وفاداری کے جراثیم آج بھی پائے جاتے ہیں۔ شاید اسی لیے یہاں بسنے والا ہر شخص خود کو دلّی والا کہلانے میں فخر محسوس کرتا ہے پہلے تو دو چار پشتوں کے بعد یہ خواہش سر ابھارتی تھی لیکن اب تو چند برسوں ہی میں صفتِ نسبتی بدل جاتی ہے۔

دلّی کے تعلق سے بیگ صاحب کا نام اس لیے نہیں لیا جاتا کہ ان کے آبا و اجداد تین سو برس پہلے دلّی آ بسے تھے؛ بلکہ اس لیے لیا جاتا ہے کہ بیگ صاحب کا رکھ رکھاؤ، ضبط و صبر، انکساری و ملنساری وعدہ کی پابندی، جاں نثاری و غم خواری، دوسروں کے کام آنے کا جذبہ، چھوٹوں سے شفقت، بڑوں کا ادب اور دوستوں سے وفاداری ہے۔ اور یہ وہ اقدار ہیں جو مرحوم دہلی کی تہذیب کی کسوٹی تھیں۔ اور اگر کسی میں یہ صفات آج بھی ہوں تو اسے دلّی والا کہنے میں عار نہیں۔

مرزا محمود بیگ کو میں نے خاصے ڈھلتے وقت میں دیکھا تھا اپنے زمانے میں دلوں کی دھڑکن رہے ہوں گے۔ کشادہ پیشانی گھونگریالے بال، گھنے ابروؤں کے بوجھ تلے دبی ذہین آنکھیں پتلے پتلے ہونٹ، سرخی مائل گورا رنگ، چوڑے شانے، فربہ جسم جس نے ان کی گردن کو خاصا کوتاہ کر دیا تھا سفید پینٹ بشرٹ میں ملبوس، شانِ بے نیازی سے چلتے ہوئے ان کی متحرک آنکھیں

معمولی وغیر معمولی چیزوں پر گہرائی سے پڑتیں۔

بیگ صاحب سے میرا تعلق نہ تو درباری ہے اور نہ امدادی۔ بلکہ دلی کالج کے ناطے سے ہے کہ بیگ صاحب اور دلی کالج ایک جان اور دو قالب تھے۔ آج بھی دلی کالج کا طالب علم (بھلے ہی وہ اب ذاکر حسین کالج ہو گیا ہے) بغیر بیگ صاحب کو جانے اپنے کالج کی تاریخ اور روایات سے روشناس نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ ہمارے زمانے میں وہ مشیر تعلیم ہو کر کشمیر چلے گئے تھے لیکن ایک بار ان کے دفتر میں جانے کا اتفاق ضرور ہوا تھا اور یہ اتفاق بھی کچھ ایسے حالات میں رونما ہو کہ جان ہی سوکھ گئی۔ ہوا یوں کہ گرلز کامن روم کے پچھلے کمرے میں جس کا دروازہ کینٹین کی طرف کھلتا تھا، موتی نام کا بیرا اپنی آسانی کے لیے پودینے کی چٹنی کا مرتبان رکھ جاتا تھا اور پکوڑوں، سموسوں کے ساتھ چٹنی وہیں سے سپلائی کرتا تھا۔ پتہ نہیں میرے گروپ کی پاس کورس کی لڑکیوں کو کیا سوجھی کہ صبح ہی صبح چٹنی کے مرتبان پر ٹوٹ پڑیں اس زمانے میں کینٹین کی حالت آج جیسی نہیں تھی سامان سستا اچھا اور لذیذ ہوتا تھا کیونکہ بیگ صاحب خود تمام چیزیں چکھتے تھے۔ انٹرول ہوا موتی آرڈر لے کر آیا مرتبان کھولتا ہے تو چٹنی آدھی اس نے شور مچایا تو قلعی جلدی کھل گئی بعض لڑکیوں نے چٹنی خوروں کی نشان دہی بھی کر دی بس پھر کیا تھا موتی شیر ہو گیا اور چلا پرنسپل صاحب سے شکایت کرنے اتنے میں میں کامن روم میں داخل ہوئی لڑکیوں نے مجھے گھیر لیا۔ "دیکھو یہ ہماری شکایت کرنے پرنسپل صاحب کے پاس جا رہا ہے"۔ میں نے پوچھا، ہوا کیا؟ انھوں نے پورا ماجرا کہہ سنایا میں معاملہ رفع دفع کرنے کے لیے موتی سے کہا، شکایت کی کیا ضرورت ہے تم چٹنی کے پیسے لے لو۔ ویسے غلطی تمہاری ہے لڑکیوں کے کامن روم میں چٹنی رکھی کیوں؟ وہ قائل تو ہوا مگر اپنی بات پر اڑا رہا۔ عاجز آکر میں نے کہہ دیا "جاؤ کہہ دو"۔ پندرہ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ پرنسپل صاحب کا چپراسی آیا "فرسٹ ایر کی اردو والی لڑکیوں کو صاحب بلا رہے ہیں ——" جو خطاوار نہیں ان کے چہرے فق ہو گئے۔ میں نے سنا تھا بیگ صاحب لڑکیوں کو ڈانتے نہیں بلکہ لاڈ کرتے ہیں۔ سوچا بھگت لیں گے دس بارہ لڑکیوں کا گروپ جن میں پاس کورس کی لڑکیاں بھی تھیں اور آنرز کی بھی، ڈرتے ڈرتے پرنسپل صاحب کے کمرے کے آگے پہنچے۔ فوراً بلا لیا گیا بیگ صاحب

کی میز کے ارد گرد پڑی کرسیوں پر ہم سب بیٹھ گئے۔ بیگ صاحب نے طائرانہ نظر سب پر ڈالی۔ جس میں غصہ یا راضگی کا شائبہ بھی نہ تھا اور ایک کتاب جس کا مخصوص صفحہ انھوں نے کھول رکھا تھا دائیں ہاتھ کی پہلی لڑکی کو دی اور کہا جس پیراگراف پر نشان ہے، پڑھو۔ یک بارگی ہم سب نے ایک دوسرے کو دیکھا اور سوچا چٹنی کھانے کی سزا ریڈنگ تجویز کی گئی ہے ہماری ساتھی نے پڑھنا شروع کیا۔ بیگ صاحب آنکھیں بند کیے، الفاظ پر یا شاید آواز پر کان لگائے سنتے رہے۔ باری باری سب نے پڑھا۔ بہتوں نے ایسے غچے کھائے کہ پوچھئے مت کہ وہ فسانۂ عجائب تھا، جس کا صحیح پڑھ لینا استادوں کو بھی آسان نہیں۔ بیگ صاحب نے چار لڑکیوں سے ان کے نام پوچھے، جن میں، سے تین نے چٹنی چکھی بھی نہیں تھی۔ اور کہا ایک لیڈی ریسرچ اسکالر (مجھے اس وقت یاد نہیں کہ وہ کس ملک کی تھیں) اسپوکن اُردو ریکارڈ کرنا چاہتی ہیں آپ لوگ کل دس بجے میرے گھر چلیں وہ وہیں ریکارڈنگ کر لیں گی میں حیران تھی کہ بیگ صاحب نے کسی کو غلط پڑھنے پر ٹوکا نہیں۔ ہم لوگ وقت مقررہ پر کالج پہنچے۔ بیگ صاحب اپنی گاڑی میں ہمیں رودگران لے گئے اجمیری گیٹ سے لال کنواں تک ٹریفک کے سیلاب میں گاڑی چلانا بیگ صاحب ہی کا حصہ تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ ریسرچ اسکالر بھی آگئیں۔ بیگ صاحب نے ہمیں ان کے حوالے کیا اور خود شاید کھانے پینے کے اہتمام میں مصروف ہو گئے ریکارڈنگ ہو چکی تو کمرے میں آئے اور ٹیپ سنا۔ ٹیپ سنتے وقت بھی ان کے چہرے پر وہی آثار چڑھاؤ تھے جو فسانہ عجائب کا پیراگراف سنتے وقت تھے۔ ایک آواز پر انھوں نے آنکھیں کھولیں اور ایک آنکھ دبا کر، ایک ابرو چڑھا کر پوچھا۔ یہ کس کی آواز ہے ——؟ میں نے منمنا کر کہا،

”جی میری۔“ بولے کبھی ریڈیو پر جانے کا ارادہ ہو تو مجھ سے ملنا۔“ ہم سب کو پرتکلف کھانا کھلانے کے بعد، ہمارا منورنجن کیا۔ اپنی پسند کے ریکارڈ سنوائے۔ زہرہ نگاہ کے ترنم کی تعریف کرتے ہوئے کہا، آپ لوگوں نے سنا ہے۔ ہم نے نفی میں گردن ہلائی تو ان کا ریکارڈ لگا دیا —— اس پورے عرصہ میں انھوں نے محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ پرنسپل ہیں اور ہم محض فرسٹ ایر کے طلبا، —— وہ سب کے دوست بن گئے تھے۔

میں بی اے فائنل میں تھی کہ ایک صاحبہ، پرانی دلی کے گلی کوچوں سے جن کی شناسائی نہ تھی، میرے پاس آئیں اور بولیں آج کل بیگ صاحب کشمیر سے آئے ہوئے ہیں مجھے ان سے ضروری کام ہے، میری رہنمائی کرو۔ ہم بیگ صاحب کے ہاں پہنچے بیگ صاحب صحن میں بیٹھے تھے۔ ان محترمہ نے اپنا نام بتایا۔ اچھا اچھا! کہتے ہوئے بھویں چڑھا کر پوچھا، یہ صاحبزادی؟ انھوں نے نام بتاتے ہوئے کہا دلی کالج کی طالبہ ہیں۔ بیگ صاحب نے چہرے پر نظر۔یں گاڑتے ہوئے پوچھا۔ کہاں کی رہنے والی ہو۔؟ میرے جواب سے پہلے ہی وہ صاحبہ بول اٹھیں "دلی والی ہیں نــــ" اچھا تو تم دلی والی ہو ـــــ قورمہ پکانا آتا ہے؟ میرے منہ سے بیساختہ نکلا "گھر سے اسکول گئی ہوں" بیگ صاحب نے ملازم کو آواز دی اور کہا "بی بی جو چیزیں مانگیں دیدو ـــ آج قورمہ یہ پکائیں گی" میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی بیگ صاحب کے ذوق اور شئے لطیف کے بارے میں بہت سے لوگوں سے سن چکی تھی۔ انکار کا تو خیر موقع ہی نہ تھا کہ قورمہ پکا کر دلی والی ہونے کا ثبوت دینا تھا۔ جھنجلاہٹ اور بیزاری کے ملے جلے جذبے کے ساتھ اٹھی دوسروں کے کچن میں جانے سے مجھے آج بھی وحشت ہوتی ہے ـــ تو صاحب قورمہ پکا۔ ٹیبل لگی بیگ صاحب نے بیٹھتے ہی قاب کا ڈھکنا اٹھایا گہرا سانس لے کر خوشبو کا اندازہ کیا اور ایک نوالہ لیتے ہی بولے" پاس" میں اب تک خوف زدہ سی ان کی تمام حرکات کو بغور دیکھ رہی تھی کہ انھوں نے کہا ـــــ گھی مصالحہ مناسب ـــ نہ کم نہ زیادہ ـــ اور ذائقہ دلی کا۔ میں حواس باختہ ہوئی کہ شکریہ کے الفاظ منہ کے منہ میں ہی رہ گئے۔ آج سوچتی ہوں تو لگتا ہے بیگ صاحب کو دل رکھنے کا کیسا ہنر آتا تھا اور لطف کی بات یہ کہ جب ہم چلنے لگے تو مجھ سے پوچھا، کچھ ریڈیو کا ارادہ ہوا ـــــ حالانکہ میں سمجھ رہی تھی کہ وہ پہلی ملاقات بھول چکے ہیں۔ میں نے کہا۔ ایم۔ اے کا ارادہ ہے ویسے میں مختلف یونٹ سے ٹاک دے رہی ہوں۔ خوش ہوئے۔

ایم۔ اے فائنل کا امتحان ہو چکا تھا۔ اُردو مجلس میں اسکرپٹ رائٹر کی آسامی نکلی۔ میں جلد سے جلد نوکری کرنا چاہتی تھی اور چونکہ دلی والی تھی اس لیے دلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی پوری پالیسی میرے سامنے تھی۔ درخواست دینے کا خیال ہوا تو بیگ صاحب کی بات یاد آئی میں فوراً

کورسپونڈس کورس گئی۔ نام کی پرچی بھیجی۔ طلبی ہوئی میں نے سابقہ حوالہ کے ساتھ مدعا بیان کیا۔ بیگ صاحب آنکھ دبا، ابرو چڑھا، گویا ہوئے ــ بھئی ایک تجربہ کے بعد ریڈیو پر لڑکیوں کی ملازمت کے حق میں نہیں رہا۔ ایک طرف ضرورت، دوسری طرف بیگ صاحب کا تجربہ میں مخمصے میں پڑ گئی۔ یہ بھی جان گئی تھی کہ تمام نوکریوں کی طرح ریڈیو کی ملازمت میں بھی، سفارش، اہلیت پر سبقت لے جاتی ہے۔ مگر بیگ صاحب کے لہجے میں اتنی سچائی تھی کہ میں نے پروڈیوسر صاحب کے کہنے پر بھی درخواست نہیں دی اور صرف ٹاکر ہونے پر ہی اکتفا کیا خودداری نے زبان کھولنے نہ دی ورنہ شاید اوروں کی طرح میری ملازمت کے لیے بھی سر دھڑ کی بازی لگا دیتے کیونکہ دلی کالج کے طلبا اور خاص طور سے ضرورت مند طلبا کی حاجت روائی اُن کے اصولوں میں شامل تھی۔ خود غربت دیکھی تھی۔ ضرورتوں اور خواہشوں کا گلا گھونٹا تھا، محنت اور جدوجہد سے اپنا مقام بنایا تھا اس لیے ہونہار طالب علموں کی سرپرستی مرتے دم تک کرتے رہے۔ یہ ان کی قلندرانہ شان تھی کہ جو ایک بار ان کے پاس گیا ناکام نہیں لوٹا۔ انہیں کام لینے اور کام کرنے کا سلیقہ آتا تھا مشکل سے مشکل کام، بڑے سے بڑا مسئلہ بیگ صاحب کی زیرلب مسکراہٹ کے سامنے کافور ہو جاتا۔ وہ لوگ جنھوں نے جی بھر کے ان سے فائدے اٹھائے۔ وہ لوگ جوان کے ساتھی اور مشیرکار رہے بیگ صاحب کی شرافت اور اعلا اقدار کے دل سے معترف ہوں گے ویسے ع ــ ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں۔

بیگ صاحب اچھے اُستاد اور اعلا منتظم تھے اپنی عمر میں مختلف اداروں کے مشیر خاص اور مختلف انجمنوں کے روح رواں رہے ۱۹۳۲ء میں بحیثیت فلسفہ کے لکچرار دلی کالج آئے، ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد اسی کالج کے پرنسپل ہوئے اور چشمۂ فیض بنے رہے۔ ۱۹۶۲ء میں محکمہ تعلیم کی جانب سے غیر ممالک کا دورہ کیا جس کی تفصیل اپنے ایک مضمون میں انھوں نے خود لکھی ہے ۱۹۶۴ء میں ریاست کشمیر کے مشیر تعلیم کی حیثیت سے کشمیر گئے۔ ۱۹۶۶ء کے آخیر میں کشمیر یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر ہوئے اور ۱۹۶۸ء میں کورس پونڈس کورسز کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ ان انتظامی عہدوں سے قطع نظر اس غضب کے مقرر تھے کہ گویا کانوں میں رس انڈیل رہے ہوں یوں بھی دلی والا اپنے لب و لہجے سے ہی پہچانا جاتا ہے اور بیگ صاحب کا لہجہ تو جادوئی تھا

بڑی سے بڑی بات اتنے سادہ الفاظ اور سہل پیرائے میں کہتے کہ سننے والے کے دل میں اتر جاتی۔ ان کی اس صفت سے ریڈیو والوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور ۱۹۴۶ء سے ان کی ٹاکس برابر نشر ہوتی رہیں۔ اگر انہیں انتظامی امور اور دلی کالج کی فکر سے مہلت ملتی تو یقیناً پائے کے ادیب ہوتے۔ دلی کالج سے ان کا والہانہ عشق، اور کالج کے طلبا سے ان کا پیار کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ان کے زمانے میں کالج کے کسی طلبا کے ایم۔ اے میں فرسٹ کلاس لانا اس کی نوکری کی ضمانت تھا۔ اس کے لیے وہ ایکسپرٹ سے حجت کرتے تھے۔ اور ہر حال میں اوّلیت اپنے کالج کے اُمیدوار کو ہی دیتے تھے۔ دہلی کالج میں لاتعداد ایسے لکچرار ہیں جن کا تقرر بیگ صاحب کا مرہون منت ہے وہ چونکہ اسی کالج کے طالب علم تھے اس لیے انہیں کالج سے لگاؤ تھا۔ بیگ صاحب کے بعد کالج کے طالب علموں کے لیے برائی لینے والا کوئی نہ رہا۔ البتہ اگر کبھی یہیں کا طالب علم پرنسپل ہوا اور اسے بیگ صاحب کا کردار یاد رہا تو کالج ایک بار پھر اسی اخوت و یگانگت کا منظر ہوگا جس کے زیج بیگ صاحب عمر بھر بوتے رہے —— وہ جیے تو دلی کالج کے لیے اور مرے تو دلی کالج کے نام پر۔

⁂

پروفیسر عبدالودود اظہر دہلوی

منظور حسین موسوی

آوازۂ خلیل ز بنیاد کعبہ نیست
مشہور شد از آں کہ در آتش نکو نشست

تقسیم ملک کے بعد دلّی کالج کا احیاء یا اینگلو عربک کالج کو قومیانے کا اہم کام تقریباً علی گڑھ یونیورسٹی کی تحریک کے مانند ہے۔ بس میدان کے چھوٹے بڑے ہونے کا فرق ہے لیکن مشکلات اور دقتوں کو اگر معیار قرار دیا جائے تو معاملہ برابر سرابر ہی ہوگا۔

سرسید مرحوم کو بھی دو ساتھی اور جاں نثار ایسے مل گئے تھے کہ انھوں نے تن من دھن سے مدد کی اور اس کشتی کو کھینے میں ان کے دائیں اور بائیں بازو بن گئے۔ اگر ۱۸۵۷ء دلّی کے لیے قیامت کبریٰ تھی تو ۱۹۴۷ء قیامت صغریٰ۔ میدان چھوٹا ضرور مگر مشکلات کا انبار۔ مخالفتوں کا سامنا۔ خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے مرزا محمود بیگ کو کہ اپنے پورے خاندان کو چھوڑ دیا اور دلّی میں تعلیم کا بیڑا اٹھایا۔ تثلیث میں مرحوم موسوی صاحب اور خدا سلامت رکھے ہری شنکر صاحب کو کہ یہ بیگ صاحب کے دائیں اور بائیں بازو بن گئے۔ اس تثلیث میں روح القدس شنکر صاحب رہے ہیں، موسوی صاحب کا نام منظور حسین تھا کالج اسٹاف اور طلبا میں سے جس کا بھی واسطہ ایک دفعہ ان سے پڑ جاتا تھا (اور یہ حادثہ اکثر لوگوں کے ساتھ پیش آیا کرتا تھا کیونکہ وہ کالج کے وائس پرنسپل اور

برسر یعنی مالیات کے نگراں بھی تھے) وہ یہ تجویز پیش کیا کرتا تھا کہ ان کے نام سے قبل اگر ایک "نا" کا اضافہ کر دیا جائے یا اس کو بدل کر اگر "انکار" ہو تو ان کے مزاج کی پوری عکاسی ہو۔

ایک دفعہ طلبار کی ایک الوداعی دعوت میں موسوی صاحب مرحوم کے ایک شاگرد کی بیٹی نے جو بعد میں ان کی شاگرد ہو گئی تھی اور اپنے باپ کے تعلق کی وجہ سے ان کی منہ چڑھی تھی مختلف استادوں کو کچھ خطاب اس نے تجویز کیے۔ موسوی صاحب کے لیے جو پرچی کھولی گئی تو اس میں لکھا ہوا تھا۔ Handle with Care

آبگینوں اور نازک مزاج لوگوں کے ساتھ بڑی ہی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

کلیلہ و دمنہ میں دوستوں کے انتخاب کے بارے میں ایک امیر زادے کی داستان نقل کی گئی ہے جو ہر روز پیسے کے بل پر کسی کو دوست بناتا تھا اور یہ دوست اس کے جھوٹ کی تصدیق کیا کرتے تھے، باپ نے اپنی ساری عمر کی کمائی ڈیڑھ دوست بنائی اور پھر ایک بکرے کو ذبح کر کے آدھی رات کو ایک بوری میں خون آلود گوشت کو کمر پر لاد آدھی رات کو اپنے آدھے دوست کا دروازہ جا کھٹکھٹایا اور اس سے کہا کہ شہر کا نامی بدمعاش میرے بیٹے سے الجھ گیا۔ ہم دونوں باپ بیٹوں نے مل کر اس کو قتل کر دیا ہے۔ میں بوڑھا آدمی ہوں۔ مجھے اپنی جان کی فکر نہیں۔ آپ فقط اس لڑکے اور لاش کو چھپا لیں۔ آدھے دوست نے کہا۔ میرا گھر چھوٹا ہے صرف ایک کو رکھ سکتا ہوں، بوڑھے نے کہا اچھا میرا ایک اور دوست بھی ہے اس کا گھر بڑا ہے اس کے گھر جا کر دیکھتا ہوں اگر وہاں پناہ نہ ملی تو پلٹ کر تمہارے یہاں آؤں گا۔ اور یہ کہہ کر اب پورے دوست کے گھر گیا۔ وہی کہانی اس کو سنائی اس نے کہا کوئی مضائقہ نہیں۔ گھر حاضر ہے آپ کو اختیار ہے جیسے چاہیں اس کو برتیں۔ اور فوراً اپنی بیوی کو حکم دیا کہ گھر خالی کر دیا جائے اور وہ دوسری جگہ منتقل ہو جائیں گے اور لگا گڑھا کھودنے لاش کو چھپانے کے لیے۔ دوست نے اصل واقعہ بتایا کہ آپ کا امتحان مقصود نہیں تھا بلکہ اس لڑکے کی تربیت منظور تھی۔ بیٹے کو بتایا کہ یہ میرا پورا دوست ہے۔

موسوی صاحب کے حلقۂ احباب میں شاید بیگ صاحب۔ ہری شنکر صاحب کے علاوہ کسی اور کا داخلہ ممکن نہیں تھا۔ ان کے بچپن کے ساتھیوں میں نواب بشن صاحب تھے جو کبھی کبھی ان

سے ملنے الہ آباد سے دلی آیا کرتے تھے۔

ایک موقعہ پر کالج کی گورننگ باڈی میں دس سال سے زیادہ مدت کی ملازمت والے حضرات کو لیا جانا تھا۔ یہ شرط صرف بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی یعنی شنکر صاحب اور موسوی صاحب ہی پوری کرتے تھے۔ دونوں میں اس پر بحث ہوتی رہی کہ اس میں ہری شنکر صاحب کو جانا چاہیے اور شنکر صاحب اصرار کرتے رہے کہ موسوی تم کو جانا چاہیے۔ آخر میں فیصلہ یہ ہوا کہ "حرف میم" سے اس مسئلہ کو طے کیا جائے اور شنکر صاحب کا نام "ٹاس" سے نکل آیا۔ بیگ صاحب نے موسوی صاحب کو دوسری کیٹا گری سے گورننگ باڈی میں لیا۔

فرشتوں کا جو حلیہ بیان کیا جاتا ہے اس میں ذرا سی ترمیم ہو یعنی وہ یقیناً اکہرے بدن کے ہی ہوتے ہوں گے۔ پنڈت ہری شنکر بھٹ صاحب ذرا دوہرے بدن کے ہیں۔ خدا نے ان کو جمال اور جلال دونوں سے نوازا ہے۔ طمانیت اور قناعت کا اظہار ان کے چہرہ سے ہوتا رہتا ہے۔ صورت پر نور اور پرکشش۔ ان کے مقابلہ میں چھوٹے بھائی گندمی رنگ۔ برص کے نشان چہرہ پر۔ قد نکلتا ہوا، بدن متناسب۔ ان کا لباس سفید براق، ان کا کریمی رنگ کا سوٹ یا سردیوں میں گہرے براؤن رنگ کا سوٹ۔ پتلون کی مہریاں سدا چوڑی۔ وہ فیشن کے ساتھ نہ سکڑتیں نہ پھیلتیں سر پر سفید بال بہت ہی کم دن میں بارہ مہینہ چھتری ہاتھ میں رہتی اور رات کو بیت لے کر چلتے۔

کھانے پینے میں حد سے زیادہ محتاط۔ کم کھاتے لیکن نفیس اور عمدہ۔ موسوی صاحب کی زندگی بندھے ٹکے اصولوں کے ماتحت گھڑی کی سوئیوں کی طرح چلتی تھی۔ ہر چیز کا ایک وقت مقرر تھا۔ اس میں تبدیلی ان کو بہت گراں گزرتی تھی، بناوٹ اور تصنع سے ان کو نفرت تھی، خوشامد نہ وہ کسی کی کرتے تھے اور نہ کسی کو اپنی کرنے دیتے تھے۔ نماز کے پابند مجلسوں میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ روزہ کبھی کبھار رکھا کرتے تھے، وہ اکل حلال اور محنت کی کمائی پر اتنا زور دیتے تھے کہ بہت سے محراب و منبر کے جلوہ آرا واعظوں پر ان کی یہ پند و نصیحت گراں گزرتی تھی۔ روزانہ کی زندگی انتہائی سادہ اور صاف ستھری،

موسوی صاحب مرحوم کا اصول یہ تھا کہ جو کچھ وہ کہتے تھے اس پر عمل بھی کرتے تھے اور ایسی کوئی بات نہیں کہا کرتے تھے جس پر عمل نہ کرتے ہوں۔

بر سیرت لطیف تو گفتار تو دلیل
بر نسبت شریف تو کردار تو گواہ

ان کی کلاس میں زبان و بیان کی گتھیاں سلجھائی جاتی تھیں، ادب اور خاص طور سے شعر و شاعری پر بحثیں ہوتی تھیں۔ وہ اپنے شاگردوں میں غور و فکر کا وہ ملکہ پیدا کر دیا کرتے تھے جس سے ان میں خود بُرا بھلا پرکھنے کا مادہ پیدا ہو جاتا۔ ہم سے دو سال آگے والی کلاس میں ایک صاحب تھے جو اصطلاحات تلمیحات اور معانی کے سمجھنے میں ذرا دیر لگاتے تھے جب کلاس مشترکہ ہوتی تھی۔ ہم لوگوں کو الجھن ہوتی تھی۔ اور کبھی کبھی موسوی صاحب مرحوم عاجز آکر ان سے فرماتے۔

"میاں جاؤ! تم تو دوستوں کی مجلس میں نہیں بیٹھے۔ اس کے معانی بھی نہیں آتے۔ سامنے لائبریری میں جاؤ۔ لغت اٹھا کر اس کے معانی دیکھو اور پھر بھی سمجھ میں نہ آئیں تو میرے پاس آجانا۔"

موسوی صاحب مرحوم یوں تو ہر درس پوری تیاری کر کے پڑھایا کرتے تھے بلکہ جب مجھے بعد میں ان کے ساتھ ہمکاری کا شرف حاصل ہوا تو انھوں نے چار نصیحتیں فرمائیں وہ آپ بھی سن لیجئے۔ یہ ان کے مزاج کی آئینہ دار بھی ہیں اور شاید ہم میں سے بہتوں کے کام آئیں۔

۱۔ کبھی بھی بغیر تیاری کے کلاس میں نہ جانا۔
۲۔ ہر کام پوری دیانتداری، ایمانداری اور لگن سے کرنا۔ کبھی کام سے جی نہ چرانا۔
۳۔ کبھی اپنے علم پر مغرور نہ ہونا بلکہ ہمیشہ طالبِ علم رہنا۔ سیکھنے کی عمر کبھی بھی ختم نہیں ہوتی ہے۔
۴۔ معلم کو اپنے کردار اور گفتار میں یکسانیت رکھنی چاہیے۔ ورنہ جلد ہی وہ اپنا مقام کھو دیتا ہے۔

موسوی صاحب کے پسندیدہ شاعر دو تھے۔ خاقانی اور عرفی۔ خاقانی کا قصیدہ

ہاں ای دل عبرت بین از دیدہ نظر کن ہاں
ایوان مدائن را آئینہ عبرت داں

اتنے ذوق و شوق سے پڑھاتے تھے کہ طلباء کے سامنے مدائن کے کھنڈرات مجسم ہو کر آجاتے تھے اتفاق سے ان کے کلاس میں جوان کا دفتر بھی تھا ایک ہی تصویر لگی ہوئی تھی اور وہ بھی ایوان مدائن کے کھنڈرات کی۔ ایک طرف خاقانی کھڑا ہوا ہے اور پورا قصیدہ لکھا ہوا ہے وہ اصل میں

ایران کی قدیم عظمت اور شان و شوکت کا مرثیہ ہے۔ اور اس میں وہی جوش و جذبہ پایا جاتا ہے۔
عرفی کے یہاں عام فارسی قصیدہ گو شاعروں کے برخلاف خودی اور خود داری کا عنصر پایا جاتا ہے۔
اس کی انانیت کھلتی نہیں ہے بلکہ پڑھ کر اور سن کر دماغ کو بصیرت حاصل ہوتی ہے اس کو یہ احساس ہے کہ
میں حالات سے مجبور ہوں کہ قصیدہ لکھ رہا ہوں لیکن آپ یہ نہ بھولئے کہ میں کون ہوں۔
موسوی صاحب عرفی کو پڑھاتے وقت جھوم جھوم جاتے تھے اور وہ باریکیاں اشعار کی توضیح و تشریح
میں کرتے تھے کہ اچھے اچھے فارسی داں کا ذہن اس طرف نہیں جاتا۔ عرفی کے کلام سے موسوی
صاحب کی پسندیدگی کی وجہ ایک گونہ مناسبت یا کہئے مماثلت تھی۔ وہی خودداری علم و ادب
کی فوقیت۔ قناعت پسندی اور عزلت نشینی۔

بیا بہ ملک قناعت کہ درد سر نہ کشی
زقصہ ہا کہ بہ ہمت فروش طی بستند

ان کی کلاس کا دوسرا پہلو بہت ہی اہم ہے یعنی تربیت۔ وہ اس پر اتنا زور دیتے
تھے کہ وہ طالب علم جو فارسی کو ایک آسان اور عشق و عاشقی کا مضمون سمجھ کر نام لکھوالیا کرتے
تھے وہیں سے کھسک جاتے۔ کردار سازی اور تربیت کا کام وہ اس طرح انجام دیتے تھے کہ تربیت
حاصل کرنے والے کو ذرا بھی احساس نہیں ہوتا تھا۔ ان کی شخصیت کا دوسرا اہم پہلو ان کی تربیت
کا انداز تھا وہ اپنے شاگردوں کو اکھاڑہ کے پٹھوں کی طرح پوری طرح سے تمام داؤ پیچ سکھا
دیا کرتے تھے۔ سب ہی گروں سے آشنا کر دیا۔ میدان عمل میں اتارنے سے پہلے ٹھوک بجا کر دیکھ
لیا۔ آزمائش اور امتحان بہت سخت لیا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ زندگی کے تاریک پہلو بہت
ہی اہم ہیں ان پر اچھی طرح نظر ڈال لی جائے بلکہ جدوجہد کو اگر صفر سے شروع کیا جائے تو مایوسی
بالکل نہیں ہوتی جو کچھ انسان کو حاصل ہوتا ہے وہ اس پر خدا کا شکر گزار ہوتا ہے اور بڑی
کامیابی سے مغرور نہیں ہوتا۔ اس کو بہت سے لوگ ان کی قنوطیت پسندی سے تعبیر کیا کرتے
تھے۔ لیکن میری رائے میں یہ ان کا حقیقت پسندانہ رویہ تھا۔ بہر صورت زندگی دونوں ہی پہلوؤں
سے عبارت ہے تاریک بھی روشن بھی۔ اور کسی ایک کو بھی نظر انداز کرنا حقیقت سے منہ موڑنے
کے مترادف ہے۔

موسوی صاحب کو بیالیس سال کے تعلیمی وتدریسی تجربے نے قیافہ شناسی اور مردم شناسی کا عجیب وغریب ملکہ بخش دیا تھا، اگر دلی کی زبان میں کہا جائے تو وہ اڑتی چڑیا کے پر گن لیا کرتے تھے۔ اور اکثر معاملات میں اہل غرض کے حرف مدعا بیان کرنے سے قبل ہی ان کے مقصد کی تہ تک پہنچ جاتے تھے ان کا طریقہ تدریس بھی بڑا ہی دلچسپ تھا مسلسل دو گھنٹے بیچ میں پانچ یا دس منٹ کا وقفہ۔ وہ پان کے رسیا۔ منہ میں پان رکھا۔ تمباکو کھایا اور دوبارہ آمادہ، عام طور پر یہی وقت مرزا محمود بیگ صاحب کے آنے کا ہوتا تھا اور موسوی صاحب کے کمرہ کی ایک کھڑکی بیگ صاحب کی کار کے گیرج میں کھلتی تھی۔ مجھے یہ نہیں معلوم یہ کھڑکی عمداً کھلوائی گئی تھی یا اتفاقیہ طور پر رہ گئی تھی لیکن اس کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ البتہ جب بیگ صاحب کشمیر چلے گئے اور کافی مدت تک موسوی صاحب اپنے اسی پرانے کمرہ میں تشریف رکھتے تھے تو اس کھڑکی کے پٹ نہیں کھولے جاتے تھے۔

مرحوم بیگ صاحب سے علیگ سلیگ کے بعد کالج کے اہم امور پر اشاروں کنایوں میں یہیں گفتگو ہو جاتی تھی۔ جو کچھ اس طرح کی ہوتی تھی۔

کہیے مرزا صاحب! وہ آپ نے U G C کو جو خط لکھوایا ہے اس سے کام نہیں چلے گا آپ کو جانا ہوگا۔

جی ہاں! موسوی صاحب! میں جاؤں گا اور ملوں گا۔ تب ہی وہاں سے پیسہ آسکتا ہے مرزا صاحب! اگر چیک نہ ملا تو تنخواہیں نہیں دی جا سکتی ہیں۔

بیگ صاحب ایک خاص ادا سے مسکراتے ہوئے اللہ مالک ہے، موسوی صاحب ان کے جانے کے بعد موسوی صاحب کا تبصرہ شروع ہوتا۔ مغلیہ دربار لگ جائے گا مغل اعظم بھول جائیں گے آخر کب تک گائیں کا بھینس تلے اور بھینس کا گائے تلے کرتے رہیں گے۔ پراویڈنٹ فنڈ سے نکال نکال کر کب تک تنخواہیں دی جائیں گی۔ شام کا کالج اور شروع کر دیا ہے۔ وہ بھی ایک دردسر ہے۔ مرزا صاحب کی جوتی کی نوک پر۔ کالج جائے چولھے بھاڑ میں۔

اور پھر ایک دم ان کو خیال آتا کہ یہ تو کلاس ہے اور وہ دوسرا پان منہ میں دباتے اور پھر

خاقانی یا عرفی کی طرف متوجہ ہوجاتے۔ کسی بھی ایک نکتہ کو دوبارہ بیان نہیں کرتے تھے۔ تکرار بالکل نہیں ہوتی تھی اس سے درس میں پوری دلچسپی قائم رہتی تھی۔

موسوی صاحب اپنے گھر چھتہ نواب صاحب یا سابقہ چوسیا میم فراشخانہ سے دلی کالج کے لیے روانہ ہوتے تھے تو کالج میں ہلچل شروع ہوجاتی تھی۔ سب چپراسی اپنی جگہ مستعد، دفتر کے لوگ سنبھل جاتے تھے۔ لائبریری کیونکہ ان کے کمرہ کے بالکل ہی سامنے تھی تو سب سے پہلے مرحوم جمیل صاحب کی طلبی ہوتی تھی۔ بیگ صاحب کمپنی کے اس ڈائریکٹر کی طرح سے جو ایک ایماندار اور لایق منیجر کو سونپ کر صرف پالیسی اور پلاننگ کرتا رہتا ہے وہ سب سے بے نیاز مگر مطمئن لیکن جب موسوی صاحب پرنسپل بنے تو ان کے ساتھ یہ صورت نہیں رہی۔ بیگ صاحب کشمیر تشریف لے گئے۔ بیگم موسوی اللہ کو پیاری ہوگئی تھیں۔ ہری شنکر صاحب بھی ریٹایر ہوگئے تھے کالج اب ایک ادارہ اور انسٹی ٹیوٹ کی بجائے کارخانہ بن گیا تھا۔ بہت کم لوگ ایسے تھے جو موسوی صاحب یا دوسرے حضرات کی قربانیوں سے واقف تھے یا ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ موسوی صاحب ان کی ذاتی ترقی اور منفعتوں کے آڑے آتے ہیں۔ اس دور میں کالج میں افراتفری رہی۔ لیکن پھر موسوی صاحب کا اخلاص اور اس کالج سے قلبی لگاؤ کام آیا۔ ان کے پرانے ساتھی اور کچھ شاگرد ان کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ شام کو گھر لوٹ کر ان کا چائے کا دور شروع ہوتا، دوست احباب جمع ہوجاتے پابندی سے آنے والوں میں مرحوم محمد مجتبیٰ زیدی صاحب پرنسپل اینگلو عربک اسکول۔ مرحوم نواب امیر مرزا صاحب۔ گاہ بگاہ استاد محترم جناب سید امیر حسن عابدی صاحب یا حکیم میرن صاحب جنّا صاحب، ماسٹر صاحب (نواب صاحب رامپور کی صاحبزادی کے آتالیق) ہر موضوع پر گفتگو ہوتی۔

یہ سلسلہ پہلے بیٹھک میں ہوتا تھا کیونکہ بیگم صاحبہ سخت پردہ کی پابند تھیں ان کے انتقال کے بعد محفل چارپائیوں پر اندر ہی جمتی تھی۔

اب موسوی صاحب کی کہانی کا کچھ حصّہ ان کی زبانی بھی سن لیجئے۔

"اپنے بچپن کے زمانہ کی اب کچھ ہی باتیں مجھے یاد رہ گئی ہیں۔ ایک یہ کہ میرے دادا کاظم علی

صاحب تحت اللفظ مرثیہ پڑھا کرتے تھے۔ سینکڑوں بند کے مرثیے زبان پڑھتے تھے اور اگر کبھی کوئی غلط مرثیہ پڑھتا تو اسے وہ فوراً ٹوک دیتے تھے۔ اس وقت میری عمر پانچ یا چھ سال کی ہوگی وہ مجھے اپنے پاس بٹھا کر کہانیاں سنایا کرتے تھے اور کبھی اپنے ایک ایسے دوست کے یہاں بھی مجھے اپنے ساتھ لے جاتے۔ جہاں وہ اور ان کے دوست تو افیون کی چسکیاں لیتے تھے اور میں برفی کھاتا تھا۔

ہم تین بہن بھائی تھے۔ ایک بہن مجھ سے بڑی تھیں اور ایک مجھ سے چھوٹی۔ میں اور میری بڑی بہن اس وقت جب کہ ہماری عمر سات اور نو سال کے درمیان تھی، قرآن پاک کی تلاوت کرنے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے تھے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں تیز پڑھتا ہوں میں کبھی کبھی ایک آدھ صفحہ اڑا جاتا اور اپنی بہن سے چند منٹ پہلے ایک پارہ ختم کر دیتا اور اس طرح قرآن پڑھنے میں ہرا دیتا۔ مجھ سے چھوٹی بہن بہت چھوٹی تھی۔

ہم لوگوں کے بچپن ہی میں ہماری والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ کچھ یوں ہی سی یاد ہیں، جیسے کوئی خواب دیکھا ہو، دراصل ہماری پرورش والدہ مرحوم کی بیوہ ممانی نے کی تھی۔ ہم انھیں کو اماں کہتے تھے۔

ہم محلہ کے ایک مکتب میں بھیجے گئے تھے غالباً سات سال کی عمر رہی ہوگی جب اردو اور گلزار دبستان شروع کی ہمارے مولوی صاحب تحصیلدار کہلاتے تھے۔ نام تو ہمیں یاد نہیں ..... کبھی کوئی سبق سنانے میں ان کا ہاتھ گھومتا اور تھپیٹر پڑتا کبھی ان کا موٹا سا ڈنڈا کسی کی پیٹھ کی خبر لیتا۔

سید منظور حسین موسوی کا سلسلۂ نسب حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے منسلک ہوتا ہے۔ آپ کے بزرگوں میں سے ایک صاحب نیشا پور ایران سے شاہ عالم کے عہد میں ہندوستان آئے اور الہ آباد میں مستقل سکونت اختیار کی۔ ۲۱ مارچ ۱۹۰۶ء یعنی شمسی تقویم کے اعتبار سے نوروز کے دن موسوی صاحب کی ولادت الہ آباد میں ہوئی۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۹ء تک الہ آباد یونیورسٹی کے طالب علم رہے۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد پروفیسر دستور، پروفیسر دیو، مولانا زبیر احمد، مولانا اسحٰق علی، مولانا ناجی اور مولانا نعیم الرحمٰن جیسے اساتذہ سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ پروفیسر مہدی حسن ناصری صاحب سے ان کے والد کی دوستی تھی، وہ بھی ان کو

خوردوں کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں اینگلو عربک کالج میں بہ حیثیت مدرس فارسی میں ان کا تقرر ہوا۔ مولانا عبدالرحمن (شمس العلماء) اور پروفیسر واکر صاحب نے موسوی صاحب کی رہنمائی کی اور ۱۹۳۸ء میں وہ شعبہ میں فارسی کے ریڈر ہوگئے۔ ۱۹۳۸ء میں ایران کا سفر کیا۔ مولانا آزاد مرحوم نے ICCR کی تشکیل کی تو موسوی صاحب کو اس کا سیکریٹری بنایا گیا لیکن وہ اپنے مزاج کی وجہ سے وہاں سے جلد ہی آگئے۔ ۱۹۶۴ء میں کالج کا پرنسپل بنایا گیا اور ۱۹۷۱ء میں آپ اس عہدہ سے ریٹایر ہوئے۔ ایک مرحلہ ایسا آیا کہ یونیورسٹی اور کالج دونوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا تھا۔ موسوی صاحب نے کالج کو ترجیح دی اور یونیورسٹی کی صدارت شعبہ سے استعفیٰ دیدیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد ان کے سب ہی شاگرد پاکستان کو پیارے ہوگئے تھے صرف یہاں مسلم احمد صاحب (ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے) تھے۔ تو موسوی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میں ریٹایرمنٹ کے بعد پہلی گاڑی سے الہ آباد چلا جاؤں گا۔ لیکن انھوں نے اپنے شاگردوں کے باغ میں نئے سرے سے پھول پتے نکلتے دیکھے تو ارادہ بدل دیا۔ چنانچہ بیگم صاحبہ کے انتقال اور جامعہ ملیہ میں ان کی تدفین کے بعد وہ دلّی میں رہنا چاہتے تھے، موسوی صاحب کی صلبی اولاد نہ تھی۔ ۱۹۴۶ء میں اپنی بڑی بہن اور بہنوئی کے انتقال کے بعد ان کے بچوں کی کفالت کی۔ شاگردوں کو وہ اپنی اولاد کی طرح ہی چاہتے تھے۔ یہ شاید ان کی ہی کشش تھی کہ انھوں نے ۱۹۷۱ء میں ریٹائر ہونے کے بعد دلّی میں ہی قیام فرمایا۔ بڑی خواہش تھی کہ دلّی میں جامعہ ملیہ میں بیگم صاحبہ کے پہلو میں ہی ان کی بھی تدفین ہو لیکن ان کا انتقال ۱۹۷۸ء میں ۲۰ مئی کو کانپور پر گاڑی میں ہوا۔ ان کی تدفین الہ آباد میں ہی ہوئی۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

موسوی صاحب دلی کالج میگزین کے اردو ہندی دونوں کے لیے ہی مضامین لکھا کرتے تھے۔ کبھی کبھی اپنی بیاض سے کہی ہوئی پرانی غزلیں بھی اشاعت کے لیے دیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب کو انھوں نے اپنا تحریری اثاثہ یہ کہہ کر حوالے کیا تھا کہ آپ اس کو چاہے جیسے استعمال کریں۔ اور اگر ممکن ہو تو شائع کرادیں، اُمید ہے علوی صاحب نے

اس سلسلہ میں کچھ کوشش کی ہوگی۔

چلتے چلاتے آپ ایک دو شعر سن لیجئے۔

ایک میں ہوں کہ تمہیں یاد کیا سینکڑوں بار
ایک تم ہو کہ مرا یاد بھی آنا ہے محال

تغافل کی نہیں مجھ کو شکایت
اگر دل میں نہیں ان کے کوئی اور

ہرگز حدیث شوق بہ پایاں نیامدہ است
یارب کدام جا سر ایں رشتہ بند بود

موسوی صاحب اپنے شاگردوں کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ وہ اس پارس پتھری کی طرح سے تھے جو اس سے چھو گیا مس کو کندن بنا دیا۔ ایسے مقناطیس تھے جو ایک دفعہ ان کی کشش کے حلقہ میں داخل ہوگیا اس کا نکلنا مشکل تھا، آج بھی جب ان کی شفقتیں، محبتیں، مہربانیاں یاد آتی ہیں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے، اور پھر جب ہم اپنے ارد گرد نظر ڈالتے ہیں تو سر فخر سے اونچا بھی ہو جاتا ہے کہ کتنے خوش نصیب ہیں ہم لوگ۔

اگر سیاہ دلم داغ لالہ زار تو ام
وگر کشادہ جبینم، گل بہار تو ام

ﷻ

ڈاکٹر صلاح الدین

نورالدین بیرسٹر ـــــ دیدہ شُنیدہ

یادش بخیر میں نے نورالدین صاحب کو ۱۹۵۵ء میں لگ بھگ جب میں پندرہ سال کا تھا پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ عجب طرح دار انسان تھے۔ چمپئی رنگ۔ کشادہ پیشانی، بڑی بڑی سنہری آنکھیں کتاراسی ناک گلابی ہونٹ تھوڑی میں ہلکا سا چاہ زنخ داں۔ داڑھی مونچھ صاف۔ کبھی کریم رنگ کا کوٹ، سفید پتلون، سفید قمیض اور کبھی سفید یا کریم رنگ کی شیروانی۔ چوڑی موری کا پاجامہ۔ لانبا قد، بھرواں جسم چہرے پہ کہیں کہیں سرخ اور کالے تِل چوڑا سینہ۔ دمکتی چمکتی موتیوں کی بتیسی پاٹ دار آواز اور وجیہہ شخصیت کے مالک تھے مشرق کا مردانہ حسن پورے آب و تاب کے ساتھ ان میں جلوہ افروز نظر آتا تھا۔ حُسنِ صورت کے ساتھ ساتھ حسنِ سیرت بھی خدا نے اتنی ہی حسین بنائی تھی۔

پرانے دہلی والوں میں حسینوں کا ایک گروہ تھا نورالدین اس کے سرتاج نہیں تو شہ بالا ضرور تھے ان سبھوں نے بقولِ غالب مغل بچے کی طرح کسی نہ کسی کو مار رکھا تھا۔ اوّل آصف علی بیرسٹر تھے جو اپنی خوب صورتی کے لیے خاصے مشہور تھے، خوش مزاج اور خوش گفتار تھے۔ ایک غزالِ رعنا کے دل میں گھر کر گئے، دوسرے مولانا احمد سعید تھے۔ ان کا رنگ بھی سرخ و سفید قد لانبا جسم مناسب اور آواز بلا کی دل نشیں تھی حالانکہ مولوی تھے مگر خط کے آنے پر بھی ایک عالم رہا کے مصداق اپنے وعظوں میں بہنوں کے دلوں پر اپنا نقش چھوڑ گئے ان پر کیا بیتی یہ تو اللہ ہی جانتا

ہوگا لیکن ان کے وعظ سن کر جو دوسروں پر بیتتی تھیں اُس کا چرچا ہم نے بھی دلّی کے گلی کوچوں میں سُنا ہے ۔ خوبروؤں میں تیسرا نام خواجہ حسن نظامی کا تھا انھوں نے اپنے تئیں جوگ بروگ سے بہت کچھ بدل لیا تھا۔ نورالدین صاحب اِس سلسلے کی آخری کڑی تھے اب صرف لے دے کے اس سلسلے کی آدھی کڑی بچی ہے جس کا نام گلزار دہلوی ہے خدا انھیں سلامت رکھے ۔

نورالدین صاحب کا اندازِ دلرُبائی عجیب و غریب تھا پل میں تولا پل میں ماشہ ۔ محبت سے بولتے تو یہ معلوم ہوتا کہ آنکھوں سے شفقت کا مینہ برس رہا ہے اور جب کبھی غصہ ہوکر گرجنے لگتے تو ساون بھادوں کا سماں آ تا گلے کے سب بیاض اپنے اپنے جوہر دکھاتے لب و لہجے میں ایسا کھٹا میٹھا رس ہوتا کہ جھاڑی بوٹی کے بیروں کا ذائقہ محسوس ہونے لگتا۔ چہرے پہ سرخی اور زبان میں پھرتی پھڑپھڑاتی ۔ پوری فضا موسیقی سے جھنجھا اُٹھتی تھی ۔ سامنے بیٹھا کوئی جانکار ہوتا تو اُسے تو معلوم ہوتا تھا کہ اب یہ لے مدھم سروں میں تبدیل ہو جائے گی اور اگر سامنے والا کوئی اجنبی ہوتا تو ماڈرن آرٹ کا عظیم شاہکار بنا سُم گُم بیٹھا رہتا تھا ۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ نورالدین صاحب کو یوں تو میں اپنے بچپن سے جانتا تھا لیکن ان سے ملاقات کرنے کا شرف پہلی بار مجھے ۱۹۶۴ء میں حاصل ہوا جب میں اپنے ایک ذاتی کام کے سلسلے میں مرحوم کی قیام گاہ واقع علی پور روڈ پر خوف و خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ پہنچا۔ خوشی مجھے اس لیے تھی کہ میں ایک ایسے شخص سے ملاقات کرنے جارہا تھا کہ جس کی ذات اُجڑتی دہلوی تہذیب کے اسکول کی ترجمانی کرتی تھی کہ جس کی حیثیت آج کے دور میں باقیات کی سی ہے لہٰذا میرا خوش ہونا ایک قدرتی امر تھا مگر خوف مجھے اس کا محسوس ہو رہا تھا کہ نورالدین صاحب پل میں تولہ ہوکر مجھے راگ بے جے وقتی سے محظوظ نہ فرمادیں ۔ خیر مرحوم بڑی شفقت سے پیش آئے۔ اس لیے کہ کچھ تو ان کی صاحبزادی امینہ آپا نے میرا تعارف سراپا تصویر درد بنا کر کرایا تھا اور کچھ میں ان کے مزاج کی برہمی کے متعلق ذرا زیادہ ہی خوف زدہ ہوگیا تھا۔ مگر امینہ آپا نے متعارف کرانے سے میری یہ مشکل آسان کردی اور نام اور کام بھی انھوں ہی نے بتادیا۔ نورالدین صاحب نے میرے اوپر طاری خوف کا اندازہ کرلیا۔ اس لیے بڑی شفقت کے ساتھ پیش آئے اس وقت ان کے یہاں اُردو کی ایک نامور شخصیت بھی تشریف فرما تھی اُن سے میرا بھی تعارف کرایا یہ ان کے ایک

قریبی دوست قاضی عبدالودود صاحب مرحوم تھے قاضی صاحب سے نہ صرف یہ کہ مجھے پہلی بار نیاز حاصل ہوئی تھی بلکہ میں نے دیکھا بھی پہلی بار تھا۔ خیر نورالدین صاحب نے ان سے پہلے سے چل رہی گفتگو کا سلسلہ پھر شروع کر دیا اتنے میں چائے اور چائے کے ساتھ والے بھی آگئی نورالدین صاحب نے مشفقانہ انداز میں مجھے چائے بنانے کو کہا میں نے چائے بنا کر دونوں حضرات کو دیدی تو نورالدین صاحب نے مجھ سے چائے پینے کو کہا اور کچھ کھانے کے لیے بھی اشارہ کیا، میں نے عرض کیا کہ ابھی ناشتہ کر کے حاضر ہوا ہوں کہنے لگے میاں کھاؤ اس بھری جوانی میں کھانے سے احتیاط۔ ارے میاں کھاؤ گے نہیں تو چلو گے کیسے خیر اب میرے حواس ٹھکانے آچکے تھے لہذا میں نے چائے کم اور وائے زیادہ استعمال کر کے ابھی ناشتہ کر کے حاضر ہوا ہوں کا پورا ثبوت دیا نورالدین صاحب کے کورٹ جاتے کا وقت ہو رہا تھا لہذا مجھے حکم ہوا کہ میں قاضی صاحب کو اسکوٹر میں لے کے قرول باغ جاؤں۔ میں نے حکم کی تعمیل کی قاضی صاحب اور میں اسکوٹر پر بیٹھ قرول باغ پہنچے وہاں قاضی صاحب کو اپنے ایک دوست سے ملاقات کرنا تھی جن سے قاضی صاحب نے میرا بھی تعارف کرایا اور اُن کے بارے میں پتہ چلا کہ یہ صاحب اردو کے شاعر دوار کا داس شعلہ ہیں یہاں سے میں نے قاضی صاحب سے اجازت لی اور گھر واپس لوٹ آیا۔

نورالدین صاحب سے میری پھر اکثر ملاقات ہوا کرتی میں گاہے گاہے ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا ان سے میری آخری ملاقات ان کے انتقال ہونے سے چند ماہ پیشتر ہوئی تھی اس وقت میں پی۔ ایچ ڈی کر چکا تھا صرف ڈگری ایوارڈ ہونا باقی تھی میں نوکری کا متلاشی اور قسمت کا شاکی تھا میں نے سوچا کہ نورالدین صاحب سے اپنی پریشانی بیان کی جائے ہمت نہ ہوئی بالآخر پھر امینہ آپا سے رونا رویا انھوں نے میری غیر موجودگی میں مرحوم کو میری ضرورت اور پریشانی سے آگاہ کیا۔ اور میں امینہ آپا کے کہنے کے مطابق دوسرے روز پھر جا پہنچا۔ دیکھا کہ مرحوم کے چہرے پہ تفکر اور غصے کے ملے جلے آثار نظر آرہے ہیں مجھے بٹھایا اپنے سکریٹری کو کورٹ کے فائلوں کے متعلق کچھ بتایا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ میاں پی ایچ ڈی کر لی میں نے کہا جی۔ پھر "اب کیا ہے"؟ میری زبان سے مدعا بیان کرنے کی بجائے غیر شعوری طور پر غالب کا یہ شعر نکلا۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام　　　ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

شعر تو میں نے پیدائشی اردو والے کی طرح پڑھ دیا لیکن پڑھتے ہی یکبارگی خیال آیا کہ یہ میں نے کیا کیا دل نے کہا کہ پیارے اب تیری خیر نہیں کیونکہ تیر کمان سے اور شعر زبان سے نکل چکا تھا لیکن زہے نصیب کہ تیر نشانے پہ صحیح بیٹھا شاید اس لیے کہ غالب نے غالباً یہ شعر اتنی پریشانی میں نہ کہا ہو جتنی پریشانی کے عالم میں میں نے اس کا استعمال کیا تھا لہذا اس شعر کی عملی تشریح یوں بیان ہوئی کہ نور الدین صاحب نے مجھ سے کچھ نہ کہہ کر فون اٹھایا۔ نمبر گھمایا اور دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سروپ سنگھ کے گھر پر ملایا اور چند لمحوں میں روایتی مزاج پرسی کر کے میرے پڑھتے ہوئے بلکہ منہ سے نکلے ہوئے غالب کے Past Indefinite مصرعوں کی تشریح اپنے مخصوص مزاج کے عین مطابق Present Indefinite میں کرنا شروع کر دی (جو یہاں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں) جیسے ہی فون رکھا۔ میں سراپا سر تسلیم خم کا نوے ڈگری والا اینگل بنکر بیٹھ گیا۔ آواز بلند ہوئی "سالوں نے اردو کی دکانیں کھلوا دی ہیں۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پر پی ایچ ڈیاں دے رہے ہیں۔ نہ نوکریوں کا پتہ ہے نہ مستقبل کا"۔ میں نے پی۔ ایچ ڈی کی جب واحد سے جمع بنتے سنا تو دل میں سوچا کہ چل بھائی صلاح الدین ہوگئیں بلائیں سب تمام اب دوسرے مصرعے کی عملی تشریح اور بنے۔ نہ دین کے رہے نہ دنیا کے۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔ یہ شاعرانہ وسوسے دل میں پیدا ہو رہے تھے کہ نور الدین صاحب نے اسی غصے کے لہجے میں کہا کہ میاں سروپ سنگھ سے بات کی ہے کل صبح تم اُن کے گھر چلے جانا اور انھیں تفصیل بتانا"۔ یہ جملہ سنتے ہی میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی میں نے کہا بے بھئی مل گئی نوکری ہو گیا تیرا کام اب تجھے کل ٹھیٹھ ہریانوی نور الدین سے بھی ملنا پڑے گا آج تو نے دہلوی زبان کی فصاحت کا نمونہ دیکھا ہے اب کل تجھے پیور کھڑی بولی کی بلاغت کا اندازہ بھی ہو جائے گا۔ اور وہ بھی صبح صبح۔

خیر مرتا کیا نہ کرتا حکم حاکم مرگ مفاجات کے مصداق غالب اور غالب کی مشکل پسندی کو دل ہی دل میں گالیاں دیتا ہوا اگلی صبح کا انتظار کرنے لگا اور پہلی بار پتا چلا کہ واقعی غالب کی شاعری کے لیے مشکل پسندی کا لفظ کیوں استعمال کیا جاتا ہے۔ نہ یہ مشکل پسندی ہوتی نہ میرے شعر پڑھنے سے یہ مشکل پیدا ہوتی۔ کبھی سوچتا کاش میں نے غالب کی مشکل پسندی پر ہی پی۔ ایچ ڈی کر لی

ہوتی نوکری جائے بھاڑ میں کم از کم یہ آفتِ ناگہانی تو نہ آتی۔
خیر میں دوسرے دن صبح ڈرتا۔ مرتا۔ مرتا ڈرتا اپنے آپ کو کوستا سروپ سنگھ جی کے یہاں پہنچا
وہاں انھوں نے سارا احوال پوچھا اور لگے راگ مالاکوس میں شعبۂ اُردو کی تعریف کرنے۔ میں نے
کہا کہ بھئی کل تو نورالدین سے گیا آج سروپ سنگھ سے گیا اور کل شعبۂ اُردو سے بھی چلا جائے گا۔
اپنے دل ہی دل میں خدا سے اپنے گناہوں کی توبہ کی، غالب کا شعر پڑھنے کی توبہ کی۔ اور
سروپ سنگھ جی کے سارے احکامات پر جی۔ اچھا۔ جی بہت اچھا جی بہتر ہے۔ جی بہت بہتر ہے کرتا
رہا اور ان کے احکامات پر عمل کر کے پھر انھیں آکر بتانے کا جھوٹا وعدہ کر کے پنڈ چھڑا کے بھاگا
اور اللہ سے کہا کہ یا اللہ میرا اچھ کرا ایک طرف سروپ سنگھ ایک طرف نورالدین بیچ میں صلاح الدین
یہ گھڑی دعا کے قبولیت کی تھی دُعا قبول ہوئی اور پھر میری ہمت نہ پڑی کہ نورالدین صاحب کو جاکر
ساری کارروائی سے آگاہ کروں مبادا کہ کہیں پھر اس آواگوان کے چکر میں نہ پھنس جاؤں۔

جنابِ صدر اور خواتین حضرات!

نورالدین احمد صرف ایک شخصیت ہی کا نام نہ تھا بلکہ ایک تہذیب۔ ایک روایت کا نام تھا۔
قلندرانہ بانکپن اور شائستہ ظرافت کے دلکش امتزاج کا نام تھا اقبالؔ نے اپنے کلام میں "مردِ مومن"
کی جو خوبیاں بیان کی ہیں مرحوم نورالدین صاحب بڑی حد تک اُسی کی عکاسی کرتے تھے، وہ نڈر
بے باک صاف گو ایماندار اور سچے دیندار انسان تھے ایسا انسان جسے مصلحت کوشی اور چاپلوسی
دُور دور تک چھُو کے نہیں گئی تھی، ورنہ عین ممکن تھا کہ نورالدین صاحب کو سرکار و دربار میں بڑی
سے بڑی جگہ مل جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے وفات کے بعد کئے گئے پہلے تعزیتی جلسے میں نورالدین
صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے نورالدین صاحب کے بچپن کے دوست اور ہندستان
کے صدرِ جمہوریہ فخرالدین علی احمد نے کہا تھا کہ "نورالدین بچپن ہی سے بے باک اور صاف گو
تھے انھوں نے اپنی بے باکی اور صاف گوئی کے سبب نقصان بھی اٹھائے۔ سیاسی اعتبار سے وہ جس
مرتبے کے مستحق تھے اُنھیں نہیں مل سکا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم ان کے ساتھ انصاف نہ کرسکے"
اس سلسلے میں ایک واقعہ اور یاد آرہا ہے وہ یہ کہ جب ان کے انتقال کے بعد میں ان
کے پسماندگان کے پاس تعزیت کے لیے گیا وہاں ایک صاحب نورالدین مرحوم نے ملک ...

جمع شدہ رقم کا سود کبھی نہیں لیا بلکہ بینک والوں کے حیرت و استعجاب کرنے پر ہمیشہ یہی جواب دیا کہ مسلمانوں کو سود لینا اور سود کھانا دونوں حرام ہیں یہ بات جن صاحب نے بتائی ان کے متعلق بعد میں پتہ چلا کہ یہ اسی بینک کے ملازم تھے جہاں مرحوم اپنا روپیہ جمع کراتے تھے ایک اور واقعہ سے بھی شخصیت کے اس پہلو کی عکاسی ہوتی ہے وہ یہ کہ جب نورالدین صاحب دلی کے میئر تھے تو اُس دوران حج بیت اللہ کی زیارت کا موقع نصیب ہوا مگر وہ اس طرح کہ حکومت ایسے موقع پر جو سرکاری حاجی وفد کی صورت میں بھیجا کرتی ہے نورالدین صاحب اُس وفد کے سربراہ مقرر ہوئے لیکن مرحوم کی حمیت نے اس بات کو گوارہ نہ کیا کہ وہ حج جیسے مقدس فریضہ کو حکومت کے پیسوں پر انجام دیں لہٰذا انھوں نے اس سرکاری وفد میں اپنی رکنیت کو باقی رکھتے ہوئے اپنے اخراجات کی کل رقم متعلقہ حکام کو ادا کردی اور کہا کہ میاں جب خدا نے مجھے اتنا دیا ہے کہ میں اپنے پیسے سے حج ادا کرسکتا ہوں تو مجھے کیا پڑی کہ سرکاری خرچ سے یہ مبارک فریضہ ادا کروں۔

نورالدین صاحب کی وضعداریاں بھی کچھ کم قابل ذکر نہیں ہیں۔ یہ میری پندرہ سولہ سال تک آنکھوں دیکھی بات ہے کہ وہ جمعتہ الوداع کی نماز جامع مسجد کے ایک پارچہ فروش معراج الدین کی دُکان پر ادا کرتے کیونکہ جمعتہ الوداع جامع مسجد بھر جانیکے باعث پریڈ گراونڈ تک میں پڑھی جاتی ہے اس لیے وہ ان صاحب کی دکان پر ایک گھنٹہ پہلے آکر بیٹھ جاتے تھے اور نماز ادا کر کے جاتے تھے اس دوران چاہے وہ میئر ہی کیوں نہ رہے ہوں لیکن انھوں نے اس وضع داری کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ یہ وضع داریاں۔ یہ رکھ رکھاؤ۔ یہ مروتیں۔ یہ روائتیں اب کتنے لوگوں میں باقی رہ گئیں ہیں شاید ایسے لوگوں کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔

غالب نے اپنے ایک خط میں گالیاں دینے کے جس طریقے کی طرف نشاندہی کرائی ہے نورالدین صاحب اس فن میں یکتا تھے اور نجی اور بے تکلف محفلوں میں دوران گفتگو برمحل اور برقت کلاسیکل اور نیم کلاسیکل گالیوں سے وہ وہ کام لیا کرتے تھے جو بیسیوں جملے بھی پورا نہیں کر سکتے تھے۔ یعنی گالی کا جس قدر صحیح اور مناسب استعمال نورالدین صاحب کرتے تھے اس کو سنکر گالی کی افادیت کا بھرپور اندازہ ہو جاتا تھا، کہا گیا ہے کہ غزل اُردو شاعری کی آبرو ہے

اگر یہ کہا جائے کہ نورالدین صاحب فنِ گالی کی آبرو تھے تو بیجا نہ ہوگا جی ہاں گالی دینا بھی فن ہے
جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں جب ہی تو غالب نے گالی دینے والا کا شکوہ کیا تھا نہ کہ گالی کا۔
یہی وجہ تھی کہ نورالدین صاحب کی گالیاں سن کر سننے والا بُرا ماننے کے بجائے یہ سوچتا تھا کہ کاش
وہ بھی اِس فن سے آشنا ہو جائے۔ اب ایسے پراگندہ طبع لوگ کتنے رہ گئے ہیں جس کی گالیاں
سُن کر یوں کہنے کو جی چاہے۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

غالباً ۱۹۵۵ء کی بات ہے کہ وہ دلی میں اسمبلی کا الیکشن لڑرہے تھے ایک نیک بخت
جمال پرست ان کی موہنی صورت پر عاشق ہوگئی جہاں ان کی تقریر ہوتی وہ سرِ شام ڈائس کے
قریب جا بیٹھتی نورالدین صاحب اسے دیکھتے تو بڑے گھبرا جایا کرتے تھے ان کی کان کی لویں
سرخ ہو جاتی تھیں، بڑی مشکل سے سامنا کرتے پھر جب جلسے کے اختتام پر وہ چلنے لگتے تو کچھ مزامیر
لوگ اُسے ان کے پیچھے لگا دیتے۔ بیرسٹر صاحب پریشان ہوتے تو کوئی بے تکلف ایک فقرہ
بھی کس دیتا۔ بس پھر کیا تھا نورالدین صاحبؒ کے مُنہ سے پھول جھڑنے لگتے تھے اور یہ سلسلہ
تا دیر قائم رہتا۔ اُن کی جھڑکیوں میں غصہ بھی ہوتا تھا اور بیزاری بھی اور اِس کے ساتھ ساتھ اِس
عاشقِ نامراد کی نام نہاد بے ہودگی اور جسارت پر ہلکا سا اعتبار بھی گویا کج ادائی کے پیچھے اخلاص
جھلکتا تھا اب نہ وہ عاشق ہے نہ وہ نورالدین جیسا معشوق بات میں بات نکل آئی تو یہ فسانہ
یاد آگیا اللہ ان کی روح کو نہ شرمائے اور دونوں میری اس گستاخانہ غلطی کو معاف کردیں

نورالدین صاحب دلی والے بھی تھے اور اپنی ذات کے اعتبار سے عموماً دلی والوں سے
جدا بھی تھے۔ دلی والوں کی ایک عام پہچان یہ ہے کہ وہ شاہجہاں آباد کا ماتم کرتے رہتے ہیں۔
ماضی پر آنسو بہانا اُن کا خاص وطیرہ ہے۔ نورالدین صاحب کا ذہن منجمد نقطۂ نظر کا حامل نہ تھا
حرکی تھا اور اُس میں تغیرات کو قبول کرنے کی پوری پوری گنجائش تھی یہ بات میں نے کم دلی
والوں میں دیکھی ہے۔

نورالدین صاحب کے کردار کا ایک اور پہلو بھی بڑا جاندار تھا۔ وہ مغربی تعلیم سے بہرہ ور
ہونے کے باوجود ایک دیندار آدمی تھے آپ نئی دہلی کی کسی مسجد میں جائیے تو مرحوم وہاں ضرور

مل جاتے تھے فقیروں اور درویشوں کے تکیوں پر بھی اکثر حاضری دیا کرتے تھے ان کے مزاج میں آخری عمر میں تو بلا کی قلندری آ گئی تھی۔ گھر پر عموماً پیوند لگے کپڑے پہنا کرتے تھے حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کے مزار پر ہر جمعرات کو حاضری دیا کرتے تھے مرنے کے بعد بھی ان کی آخری آرام گاہ یہیں بنی۔ خدا غریق رحمت کرے۔

نور الدین صاحب آج مرحوم ضرور ہو چکے ہیں۔ لیکن ان کی یادیں ان کی باغ و بہار باتیں کبھی مرحوم نہ ہوں گی بلکہ ان کے چاہنے والوں، ان کے ملنے والوں اور ان کے جاننے والوں کے دلوں کو عرصۂ دراز تک گرماتی رہیں گی۔ رہے نام باقی اللہ کا۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

○

ہمارے خاکہ نگار

۱۔ (علامہ) اخلاق دہلوی :۔ پشتینی دلی والے ہیں۔ ماہر زبان ہیں۔ اُردو گرامر اور املا پر متعدد کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔ دہلوی روایات او وضع کے پاسدار ہیں۔ ادبی حلقوں میں اپنی بزرگی، علمیت اور قابلیت کی وجہ سے ادب و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

۲۔ (ڈاکٹر) اسلم پرویز : ادبیات کے ایک مقبول اُستاد اور جدید لب و لہجے کے ایک ممتاز شاعر ہیں۔ خوب صورت نظمیں اور پیاری نثر لکھتے ہیں۔ آج کل جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں شعبہ سے منسلک ہیں۔ انگنت ادبی مضامین کے علاوہ انشاء اللہ خاں انشا اور بہادر شاہ ظفر پر پُر مغز اور تحقیقی مقالے سپردِ قلم کر چکے ہیں۔

۳۔ انور دہلوی : دِلّی کے بزرگ سیاستداں ہیں، مقبولِ عوام شخصیت کے مالک ہیں۔ سیاست اور صحافت کے میدانوں میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ایک طویل عرصہ سے صحافت سے وابستہ ہیں، آج کل اُردو روزنامے عوام کے مالک و مدیر ہیں۔

دلی میٹروپولیٹن کونسل کے نامزد ممبر حکومتِ ہند کی سینٹرل حج کمیٹی، دہلی وقف بورڈ اور دلی اُردو اکادمی کے ممبر ہیں۔ دلی کی متعدد سیاسی اور سماجی تنظیموں کے سرپرست نڈر اور بے لاگ صحافی ہیں، زبردست وطن پرست ہیں اور ہر حلقے میں عزت و احترام سے یاد کیے جاتے ہیں۔

۴۔ انیس دہلوی :۔ دِلّی کے ادبی، سماجی اور صحافتی حلقوں کی ایک بے حد مرنجاں مرنج اور

مخلص شخصیت کے مالک ہیں، ماہنامہ فلمی ستارے کے مدیر اعلیٰ ہیں ۔ اعلیٰ پایہ کے فلمی صحافی اُردو کے بے لوث خادم ہیں ۔

۵ . بہار برنی :- شاعر اور صحافی ہیں بلند شہر کے رہنے والے ہیں، پچھلے تیس پینتیس سالوں سے دلّی میں مقیم ہیں ــــ روزنامے الجمعیۃ اور الجمعیۃ ویکلی جیسے اُردو کے موقر اخبارات سے وابستہ رہ چکے ہیں ۔

۶ . (ڈاکٹر) تنویر احمد علوی :- کیرانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے ہیں، پچھلے بیس پچیس برسوں سے دلّی میں مقیم ہیں۔ دلّی کالج مرحوم اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اُردو کے شعبوں سے منسلک رہے ہیں۔ آج کل دلّی یونیورسٹی کے شعبہ اُردو میں پروفیسر ہیں۔ اُردو کے نامور محقق، نقاد اور معتبر صاحب قلم ہیں۔ گاہے بگاہے شعر بھی کہتے ہیں لیکن اصل میدان تحقیق ہے تقریباً ڈیڑھ درجن علمی و ادبی کتابوں کے مصنف ہیں ــــ ذوق پر اتھارٹی تسلیم کئے جاتے ہیں۔

۷ . (ڈاکٹر) جاوید وششٹ :- فرید آباد، ہریانہ کے رہنے والے ہیں۔ کئی نسلوں کی ذہنی اور علمی تربیت کرنے کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین کالج کے شعبۂ اُردو سے ابھی حال ہی میں ریٹائر ہوئے ہیں۔ اچھے شاعر اور منفرد انشا پرداز ہیں۔ نوک پلک سنوار کر شعر کہتے ہیں اور خوب صورت اور دلپذیر نثر لکھتے ہیں۔ شمالی ہند میں دکنی ادب کے ماہر ہیں کئی شعری مجموعوں اور نثری کتابوں کے مصنف ہیں۔

۸ . خار دہلوی :- کھرے دلی والے، علامہ زار دہلوی کے صاحبزادے اور جانشین داغ نواب سائل دہلوی کے شاگرد رشید ہیں۔ دبستان دہلی کی شعری روایات کے امین ہیں بڑے دروبست کے ساتھ شعر کہتے ہیں اور مشاعروں میں منفرد انداز سے شعر سناتے ہیں۔ حال ہی میں ایک اعلیٰ سرکاری عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔

۹ . ڈاکٹر خلیق انجم :- برصغیر ہندوستان و پاکستان کے اُردو حلقوں میں اپنی علمیت و قابلیت اور اعلیٰ ادبی و معیاری تحقیقی و تنقیدی مضامین کی بدولت احترام کی نگاہ سے دیکھی جانے والی شخصیت، خالص دلی والے ہیں، عرصہ تک دلی کے کروڑی مل کالج میں شعبۂ اردو کے صدر رہے، آج کل انجمن ترقی اُردو کے جنرل سیکریٹری اور اُردو اکیڈمی کے ممبر ہیں۔ غالب اُن کی

تحقیق کا خاص موضوع ہے ــــ سوداحیات و خدمات، متنی تنقید اور خطوطِ غالب کی سائنٹفک ترتیب و تدوین آپ کی اہم ادبی کتابیں ہیں سیکڑوں ادبی مضامین سپردِ قلم کر چکے ہیں ــــ نہایت جانفشانی اور تندہی سے اُردو کی ترویج و ترقی کے لیے سرگرم عمل رہتے ہیں ــــ ایک دلچسپ اور باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں اور دلی کے ادبی، علمی اور سماجی حلقوں میں بہت مقبول ہیں۔

۱۰۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی : ہندوستان میں اُردو کے پہلے پروفیسر آف ایمریٹس، اُردو دُنیا کی یگانۂ روزگار اور مقتدر شخصیت، نامور محقق، ذی علم نقاد، معتبر صاحبِ قلم اعلیٰ منتظم اور شفیق اُستاد۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے معمار جن کی مساعی جمیلہ سے شعبۂ اُردو یونیورسٹی کے اہم ترین شعبوں میں گنا جانے لگا ــــ ڈین آف آرٹس فیکلٹی اور صدر شعبہ رہے۔ کئی نسلوں کی ذہنی تربیت کر چکے ہیں ــــ "میر حیات و شاعری" آپ کا علمی و تحقیقی کارنامہ ہے جس کو ساہتیہ اکیڈمی نے انعام سے نوازا، سینکڑوں علمی، ادبی اور تحقیقی مضامین سپردِ قلم کر چکے ہیں ــــ بڑوں میں عزت و احترام اور چھوٹوں میں عقیدت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں ــــ اس دورِ پُر آشوب میں آپ کی شخصیت اُردو دنیا کے لئے غنیمت ہے۔

۱۱۔ رشید حسن خاں : نامور اور معتبر محقق ہیں۔ مطالعہ بہت وسیع ہے۔ کئی ادبی اور علمی کتابوں کے مصنف ہیں اور آج کل دلی یونیورسٹی میں شعبہ اُردو سے وابستہ ہیں۔ برصغیر ہندوستان و پاکستان میں اُردو املا پر نمایاں اور منفرد کام کیا ہے۔ متعدد شعرائے متقدمین و متوسطین کے کلام کا دیانتداری اور جانفشانی سے انتخاب مرتب کیا ہے۔ بے شمار تحقیقی اور تنقیدی مضامین اُردو کے موقر اور مقتدر جریدوں میں سپردِ قلم کر چکے ہیں۔ ادبی اور علمی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

۱۲۔ سلیمان صابر : اُردو صحافت اوڑھنا بچھونا ہے، ایک زمانے میں روزنامہ الجمعیۃ کے اہم رکن اور مولانا فارقلیط کے دائیں بازو تھے۔ ملی اور قومی مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ دلی کی صحافتی برادری میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ آج کل ادارہ قومی آواز سے وابستہ ہیں۔

۱۳۔ سعید خاں : دلی کے قدیمی باشندے اور ممتاز مجاہد آزادی جناب رشید خاں کے

فرزند ارجمند ہیں ــــ اوائل عمر سے ہی سیاسی تحریکوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ دوستوں کے دوست اور بے حد مرنجان مرنج شخصیت کے مالک ہیں۔ ایک عرصہ تک پندرہ روزہ "دلی سوسائٹی" کی ادارت کرتے رہے۔ ملی اور ملکی مسائل پر گہری نگاہ رکھتے ہیں میونسپل کارپوریشن کے ممبر رہے۔ دلی کے سیاسی، سماجی اور ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

۱۴۔ (ڈاکٹر) شریف احمد : وطنِ مالوف امروہہ ہے۔ ایک عرصہ تک بمبئی یونیورسٹی کے شعبہ اُردو سے وابستہ رہے، آج کل دِلی یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو میں پروفیسر اور دلی اردو اکاڈمی کے ممبر ہیں ــــ نہایت عمدہ اور شگفتہ نثر لکھتے ہیں۔ اسم باسمّیٰ ہیں اور مقبول شخصیت کے مالک ہیں۔ عبد الحلیم شرر پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ مختلف تنقیدی مضامین پر مبنی ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

۱۵۔ (ڈاکٹر) شمیم نکہت ۔ اُردو کے خواتین قلمکاروں میں ایک اہم اور نمایاں نام ہے، آج کل دِلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے منسلک ہیں۔ پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ پروفیسر شارب ردولوی کی نصف بہتر ہیں شعر کہتی ہیں اور اچھی کہانیاں لکھتی ہیں

۱۶۔ صالحہ عابد حسین : برصغیر ہندوستان و پاکستان کی خواتین افسانہ نگاروں میں ممتاز اور منفرد مقام رکھتی ہیں ــــ مشہور زمانہ مفکر ڈاکٹر سید عابد حسین کی نصف بہتر ہیں۔ خوبصورت اور رواں دواں نثر لکھتی ہیں، کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ادبی حلقوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ دِلی اُردو اکیڈمی کی بزرگ اور اہم ممبر ہیں

۱۷۔ (ڈاکٹر) صدیق الرحمٰن قدوائی :۔ شفیق الرحمان قدوائی جیسی نامور اور یکتائے زمانہ شخصیت اور مردِ قلندر کے فرزند رشید ہیں۔ آج کل جواہر لال نہرو میں شعبۂ اُردو سے منسلک ہیں۔ ماسٹر رامچندر اور فورٹ ولیم کالج پر آپ نے اہم اور تحقیقی مقالے تحریر کئے ہیں دلی اُردو اکادمی کے ممبر ہیں۔

۱۸۔ (ڈاکٹر) صغریٰ مہدی :۔ ڈاکٹر سید عابد حسین اور بیگم صالحہ عابد حسین جیسی اُردو کی نامور شخصیتوں

کی آغوش میں تعلیم و تربیت پائی اکبر الہ آبادی پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، آج کل جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ اُردو سے منسلک ہیں۔ خوب صورت کہانیاں لکھتی ہیں۔ کئی ناول شائع ہو چکے ہیں۔

۱۹۔ (ڈاکٹر) صلاح الدین :- اس کتاب کے مرتب، دِلّی اُردو اکیڈمی کے سہ روزہ سیمنار دِلی والے، کے ڈائریکٹر، ذاکر حسین کالج (دہلی کالج) کے شعبۂ اُردو سے وابستہ ہیں۔ غیر اُردو داں طلبہ کو اُردو پڑھا کر اُردو کی خاموش اور تعمیری خدمت انجام دے رہے ہیں۔ دہلی کے ادبی اور سماجی حلقوں میں بہت مقبول ہیں۔ نوجوان اور ذہین ہیں، عمدہ اور خوب صورت نثر لکھتے ہیں۔ ریڈیو کے لئے مستقل لکھتے ہیں۔ شیفتہ پر تحقیقی کام کر کے دِلّی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ دِلّی کے اُردو مخطوطات آپ کی اہم کتاب ہے جسے انجمن ترقی اُردو نے اُردو میں اور انڈیا انٹرنیشنل سنٹر نے انگریزی میں شائع کیا اس کے علاوہ تعلیمی استعداد کے اعتراف میں دہلی یونیورسٹی کی طرف سے "مرزا غالب ایوارڈ" اور "ڈاکٹر رادھا کرشنن ایوارڈ" حاصل کر چکے ہیں۔

۲۰۔ (سید) ضمیر حسن دہلوی :- دہلوی روایات و وضع کے امین یہاں کی تہذیب کے عاشق صادق دلی کی بامحاورہ اور شگفتہ زبان لکھتے ہیں۔ اشرف صبوحی، شاہد احمد دہلوی اور مرزا محمود بیگ جیسے اہل علم و قلم حضرات نے ان کے نثری اسلوب کو نہ صرف سراہا ہے بلکہ پسند بھی کیا ہے۔ آج کل ڈاکٹر ذاکر حسین کالج میں شعبۂ اُردو کے صدر ہیں۔ خالص دہلوی زبان میں انگنت انشائیے، افسانے، خاکے اور ریڈیو، ٹی۔ وی فیچر لکھ کر اُردو دنیا میں شہرت حاصل کی ہے۔ "دِلّی سے دِلّی تک" اور "غالب کی دہلی" جیسی مشہور کتابوں کے علاوہ ایک درجن سے زائد اور بھی ادبی اور تحقیقی کتابوں کے مصنف ہیں۔ نہایت معصوم اور مرنجان مرنج شخصیت کے مالک ہیں۔ ہر مکتبۂ فکر کے حلقے میں عزت و احترام سے دیکھے جاتے ہیں۔

۲۱۔ (ڈاکٹر) ظہیر احمد صدیقی :- نامور محقق اور نقاد جناب ضیا احمد بدایونی کے فرزند ارجمند ہیں۔ پہلے دِلی کالج مرحوم کے شعبۂ اُردو سے وابستہ تھے آج کل دلی یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اُردو ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ شاعری بھی کرتے ہیں لیکن تنقید و تحقیق کے

میدان میں نمایاں و ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ مومن اور فانی پر قابلِ قدر تحقیقی کام کیا ہے مشرقی تہذیب کی جیتی جاگتی تصویر، بے حد مخلص اور پیاری شخصیت کے مالک ہیں۔ دلی و بیرون دلی کے علمی و ادبی حلقوں میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

۲۱۔ (ڈاکٹر) عبدالودود اظہر: فارسی ادبیات کے ماہر اور خالص دلی والے ہیں۔ شگفتہ اور دلپذیر نثر لکھتے ہیں۔ آج کل جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی کے سربراہ ہیں۔ اردو ادب اور اردو زبان کے مسائل پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ دلی کے ادبی اور تدریسی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

۲۳۔ عبدالعزیز: دلی کے نوجوان اور ذہین نثر نگاروں میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ آج کل ڈاکٹر ذاکر حسین کالج میں شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں اردو رپورتاژ پر مبنی ایک کتاب ترتیب دے چکے ہیں ــــ خوب صورت اور شگفتہ انداز تحریر اور دلچسپ شخصیت کے مالک ہیں۔

۲۴۔ عظیم اختر: مشہور شاعر جناب علیم اختر مظفر نگری کے فرزند ارجمند ہیں۔ دلی میں تعلیم و تربیت پائی، شاعر و ادیب ہیں۔ نثری نظمیں اور شستہ نثر لکھتے ہیں۔ آج کل دلی ایڈمنسٹریشن میں اسٹیٹ پریس آفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔

۲۵۔ (ڈاکٹر) عنوان چشتی:۔ منگلور ضلع مظفر نگر کے رہنے والے ہیں۔ چوتھائی صدی سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں اور آج کل شعبے کے سربراہ ہیں۔ شاعر، نقاد، محقق اور انشا پرداز ہیں۔ زائد از نصف درجن ادبی کتابوں کے مصنف ہیں۔

۲۶۔ (ڈاکٹر) قمر رئیس: اردو تنقید و تحقیق کا ایک اہم اور معتبر نام، شاہجہاں پور کے رہنے والے ہیں۔ پچھلے بیس برسوں سے دلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں لیکن تنقید و تحقیق میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ منشی پریم چند پر اتھارٹی تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ہندوستان و پاکستان کے ادبی جرائد میں سینکڑوں تنقیدی و تحقیقی مضامین سپرد قلم کر چکے ہیں، موجودہ دور کے ترقی پسند مضفین کے اہم ستون ہیں، تاشقند یونیورسٹی میں پروفیسر رہ چکے ہیں۔

۲۷۔ قیصر حیدری :۔ خیام الہند حضرت حیدر دہلوی کے بھانجے اور شاگرد رشید ہیں، شعر خوب کہتے ہیں اور مشاعروں میں جم کر پڑھتے ہیں۔ علم نجوم کے ماہر ہیں ٹھیٹھ دلّی والے ہیں۔

۲۸۔ (ڈاکٹر) کامل قریشی : دلّی کے شعری و ادبی حلقوں کی ایک اہم اور نمایاں شخصیت، کروڑی مل کالج میں شعبۂ اُردو کے صدر ہیں۔ خوب صورت شعر کہتے ہیں اور مشاعروں میں چھا کر پڑھتے ہیں۔ دلّی اُردو اکیڈمی کے ممبر ہیں۔ دلپذیر نثر بھی لکھتے ہیں ـــ خود تشہیری سے بے نیاز ہوکر شعر و ادب کی خاموش خدمت کرنے کے قائل ہیں۔ آپ کا شعری مجموعہ "مہ کامل" کے عنوان سے شائع ہوکر مقبول ہو چکا ہے۔ متعدد تحقیقی مضامین مختلف اُردو رسائل اور جریدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

۲۹۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر :۔ شاعر، ادب نواز اور انسان دوست شخصیت کے مالک ہیں۔ برصغیر ہندوستان و پاکستان کے ادبی اور سماجی حلقوں میں ممتاز مقبول ہیں۔ اعلیٰ سرکاری و سیاسی حلقوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ آئی۔ اے۔ ایس ہیں حکومت ہند کے ممتاز اور کلیدی عہدوں پر فائز رہے ہیں، آج کل ترقی اُردو بورڈ کے سربراہ ہیں اور اُردو اکادمی کے سینئر ممبر ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے نائب صدر ہیں، نیز متعدد ادبی اور سماجی ادارے آپ کی شخصیت کے گرد گھومتے ہیں

۳۰۔ (پروفیسر) محمد حسن :۔ اُردو دنیا کے ایک باوقار انشا پرداز، محقق اور ناقد ہیں۔ مارکسی تنقید میں موجودہ عہد کے صفِ اول کے نقادوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ متعدد ادبی اور تنقیدی کتابوں کے مصنف ہیں۔ مشہور مقبولِ زمانہ کتاب "دلّی کی شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر" کے مصنف ہیں۔ برصغیر ہندوستان و پاکستان کے اہم ادبی جریدے "عصری ادب" کے مدیر ہیں۔ آج کل نہرو یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اُردو ہیں۔ نصف درجن سے زائد تنقیدی مضامین کے مجموعے شائع ہوکر ملک اور بیرون ملک میں مقبول عام ہو چکے ہیں۔

۳۱۔ ناز انصاری : برگزیدہ صحافی اور نامور انشا پرداز ہیں۔ روزنامہ تیج، پیام مشرق ویکلی اڈیٹوریل بورڈ سے وابستہ رہے ـــ ایک عرصہ تک روزنامہ الجمعیۃ کے مدیر رہے۔ آج کل

دِلّی اور گورکھ پور سے بہ یک وقت شائع ہونے والے روزنامہ مشرقی آواز کے مدیر ہیں۔
نڈر اور بے باک صحافی ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

۳۲ ۔(ڈاکٹر) نثار احمد فاروقی :۔ امروہہ جیسے مردم خیز قصبے کے ایک صاحب علم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ پچھلے تیس پینتیس برسوں سے دہلی میں درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ آج کل دِلّی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں پروفیسر ہیں۔ اپنے تنقیدی اور تحقیقی، فکر انگیز اور معیاری مضامین کی وجہ سے برصغیر ہندوستان و پاکستان کے ادبی حلقوں میں احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

۳۳ ۔نورجہاں ثروت :۔ اپنے منفرد شوخ لب ولہجے کی بدولت اُردو شاعرات میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ خالص دِلّی والی ہیں۔ ذہین صحافی ہیں، ایک قلیل عرصہ میں ادب اور صحافت میں نام کمایا ہے۔ پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین کالج کے شعبۂ اُردو سے وابستہ تھیں، آج کل روزنامہ قومی آواز کی نائب مدیر ہیں۔ خوب صورت، شگفتہ اور دِلّی کی بامحاورہ زبان لکھتی ہیں۔

۳۴ ۔(مولانا) واصف دہلوی :۔ اچھے شاعر، زبان وگرامر کے ماہر اور علوم دینیہ کے قابلِ قدر اُستاد ہیں۔ مفتیٔ اعظم مولانا مفتی کفایت اللہؒ کے فرزند رشید ہیں ـــــ دِلّی کی قدیمی دینی درسگاہ مدرسہ امینیہ، کشمیری گیٹ میں قرآن وحدیث کا درس دیتے رہے ہیں ـــــ زبان وبیان میں صحتِ الفاظ اور گرامر کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ دِلّی کے مذہبی اور ادبی حلقوں میں باعزت مقام رکھتے ہیں۔

اُردو اکادمی دہلی

کی چند اہم مطبوعات

کتاب	تفصیل
آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ	مرتبہ: پروفیسر شمیم حنفی، قیمت: ۶۰، صفحات: ۲۵۵
مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین	مرتب: ڈاکٹر اسلم پرویز، قیمت: ۱۰۰، صفحات: ۲۷۵
اُردو تھیٹر کل اور آج	مرتبین: مخمور سعیدی، انیس اعظمی، قیمت: ۱۰۰، صفحات: ۲۷۶
اُردو ادب میں عوامی ذرائع ابلاغ	مرتبین: محمد شاہد حسین، اظہار عثمانی، قیمت: ۷۵ روپے، صفحات: ۲۲۴
دہلی میں اُردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر	مصنفؔ: پروفیسر محمد حسن، قیمت: ۱۲۰، صفحات: ۳۹۲
آزادی کے بعد دہلی میں اُردو غزل	مرتبہ: پروفیسر عنوان چشتی، قیمت: ۱۲۰، صفحات: ۳۸۴
عالم میں انتخاب - دِلّی	مصنف: مہیشور دیال، قیمت: ۱۵۰، صفحات: ۵۱۶
دہلی کے آثار قدیمہ	ترتیب اور ترجمہ: ڈاکٹر خلیق انجم، قیمت: ۱۰۰ روپے، صفحات: ۲۹۶
دلی والے (جلد دوم)	مرتبہ: ڈاکٹر صلاح الدین، قیمت: ۱۳۰ روپے، صفحات: ۵۰۲

رابطہ: سی۔پی۔او۔ بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی Ph : 23863858, Fax : 23863773